جاذب قریشی

شاعری اور تہذیب

www.taemeernews.com

شاعری اور تہذیب

جاذبؔ قریشی

مکتبہ کامران کراچی (پاکستان)

www.taemeernews.com

شاعری اور تہذیب

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

پیدائش	۸ اگست ۱۹۴۰ء کلکتہ (بھارت)
بچپن	لکھنؤ (بھارت)
لاہور	۱۹۵۰ء
تعلیم	میٹرک لاہور
کراچی	۱۹۶۲ء
ایم اے	۱۹۶۸ء جامعہ کراچی
پیشہ	تدریس ایس ایم کالج کراچی

اشاعتِ اوّل	جون ۱۹۸۸ء
سرورق	آذر زوبی
تصویر	اقبال مہدی
خطاطی	خالد محمود
طابع	مکتبہ کامران ۸/۲۴۹ لیاقت آباد کراچی
مطبع	مشہور آفسٹ پریس کراچی
قیمت	ساٹھ روپے

www.taemeernews.com

استادِ مکرم
پروفیسر کرار حسین
کے نام

www.taemeernews.com

فہرست

شاعری اور تہذیب	جناب سکرانصاری	۷
شب گزیدہ خورشید	منظور حسین شور	۱۴
جہاں غبار نہیں ہے	صبا اکبر آبادی	۶۹
دیوار پر دائرے	رئیس امروہوی	۱۰۲
لفظ تھے آشنا میرے	شان الحق حقی	۱۲۷
لاحاصل کا حاصل	جمیل الدین عالی	۱۵۴
جل گئیں انگلیاں میری	افسر ماہ پوری	۱۸۸
راستے کہاں کے ہیں	حنیف اسعدی	۲۰۴
لوک ورثے	شفیع عقیل	۲۴۶
دریچے ہیں روشن	عالمتاب تشنہ	۲۶۴

www.taemeernews.com

"میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہم جو زبان بولتے ہیں اُس کا تعین خصوصی طور پر ہمارے شعرا ہی کرتے ہیں۔ تہذیب کی ساخت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس بات کو یوں کہنا بھی صحیح ہوگا کہ ہماری شاعری کا معیار اس امر پر منحصر ہے کہ عام لوگ اپنی زبان کس طرح استعمال کرتے ہیں کیوں کہ کسی شاعر کو اپنی زبان ایک واسطے کے طور پر اسی طرح اختیار کرنی چاہیئے جیسی اس کے گردوپیش میں وہ زبان بولی جارہی ہے۔ اگر زبان ترقی کر رہی ہے تو شاعر کو فائدہ پہنچے گا اور اگر زبان میں انحطاط ہو رہا ہے تو شاعر کو اس کا بہترین استعمال کرنا چاہیئے۔ شاعری ایک حد تک کسی زبان کے حسن کا تحفظ بلکہ اس کی بحالی کا کام بھی کر سکتی ہے۔ وہ اس کی ترقی میں مدد دے سکتی ہے اور مدد دینا بھی چاہیئے تاکہ پیچیدہ تر حالات اور جدید زندگی کے بدلتے ہوئے مقاصد کے لیے بھی زبان اتنی ہی نفیس اور جاندار ہو جتنی کہ وہ نسبتاً غیر پیچیدہ عہد میں تھی۔"

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ
"شاعری کا سماجی منصب"

www.taemeernews.com

شاعری اور تہذیب

ہر انسانی معاشرہ اپنی تہذیب سے پہچانا جاتا ہے۔ تاریخ کے سفر میں ہم نے اپنی آسانی کے لئے اس بات کا تعین کر لیا ہے کہ قدیم عہد کا انسان "وحشی" تھا اور پھر تمدن و تہذیب کی کرنوں نے اسے "مہذب" بنا دیا۔ لیکن "بشریات" کی دنیا ہمیں اس فضا میں لے جاتی ہے جس میں قدیم انسان کو "وحشی" اور اس کے معاشرے کو بے تہذیب کہنے پر ہمیں خود ندامت محسوس ہونے لگتی ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ بے تہذیب ہونا شاید اتنا برا نہیں جتنا بد تہذیب ہونا ہے۔

تہذیب کی شناخت اس کے تخلیقی مظاہر سے ہوتی ہے۔ کسی انسانی معاشرے کا سب سے اہم تخلیقی مظہر اس کی زبان ہے یہ نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اپنی تخلیقی قوت کو بھی تاریخی تسلسل کے حوالے سے منتقل کرتی چلی جاتی ہیں کہ شاعری اپنی اعلیٰ سطح پر زبان کے تہذیبی زاویوں اور کیفیتوں کی امین بن جاتی ہے۔

کلاد لیوی استراوس (CLAUD LEVI-STRAUSS) نے اپنی مشہور کتاب "وحشی ذہن" (THE SAVAGE MIND) میں بڑی عمدگی سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ کسی تہذیب کے باثروت یا مفلس ہونے کا تعلق بھی اسی شے سے ہے کہ اس کی ہیئت یا تشکیل کے خارجی مظاہر کی جب درجہ بندی کی جائے تو اس کی قدر و قیمت کی سطح کیا قرار پاتی ہے۔

تہذیب کی ہیئت یا تشکیل کے خارجی مظاہر میں شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے خود اپنی

www.taemeernews.com

شاعری پر ایک نظر ڈالئے اس میں ہند الما نی تہذیب کے کتنے عناصر گھل مِل گئے ہیں ہیئت اور مواد کو دیکھئے تو کبھی ہیئت ایک خاص تہذیب کی ترجمان نظر آنے لگتی ہے جیسے دکن میں مثنوی دہلی میں غزل اور لکھنؤ میں مرثیہ اور کبھی مواد یا موضوع ایک تہذیب کی نمائندگی کرنے لگتا ہے غلامی سے نجات اور آزادی کی جدوجہد یا تصوّف کی راہ سے آنے والی انسان دوستی اور ایثار و قربانی کی ایک خاص اخلاقیات ہماری شاعری کے بعض ادوار میں اپنی ایک خاص شناخت بن گئی تھی۔

تہذیب اُس وقت بھی تھی جس وقت کے اِنسان کو "وحشی" کہہ کر ہم اس کی صلاحیتوں کو مطعون کرنا چاہتے ہیں اور تہذیب اُس وقت بھی تھی جب کلیم الدین احمد نے اردو غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہا تھا۔ اس صورتِ حال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تہذیب کے اجزا کی صحیح شناخت نہ ہونے کی صورت میں ہم غلط نتائج تک پہنچ جاتے ہیں سارتر کی جدلیاتی عقل اور تجزیاتی عقل سے تو بہتوں کو اختلاف بھی ہوا ہے لیکن تہذیب کو اس کے جمالیاتی مظاہر کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس ضمن میں شاعری کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

جاذب قریشی نے تہذیب کو حوالہ بنا کر ہماری شاعری کے بعض ایسے نمونوں کا مطالعہ کیا ہے جو ہیں تو ہمارے اپنے ہی عہد کے شاعروں کے تخلیق کردہ لیکن ان سب میں کلاسیکیت اور تہذیبی عناصر کی جھلک ملتی ہے اس تہذیب کا ایک ماضی بھی ہے اور حال بھی ہے کہ اس تہذیب کو جاذب نے خود اس طرح محسوس کیا ہے ۔

اس دشت میں سیلاب مجھے چھوڑ گیا ہے
مجھ میں مری تہذیب کے آثار تو دیکھو

جاذب نہ صرف اپنے وجود میں اپنی تہذیب کے آثار تلاش کرنا چاہتے ہیں بلکہ انھوں نے ایسے شعرا کا انتخاب بھی کیا جن کے ہاں تہذیب کے یہ آثار اپنے مختلف زاویوں، ماحول اور رنگ روپ کے ساتھ ملتے ہیں۔ منظور حسین شور، صبا اکبر آبادی، شان الحق حقی، رئیس امروہوی جمیل الدین عالی، حنیف اسعدی، افسر ماہ پوری، عالمتاب تشنہ اور شفیع عقیل کے ناموں سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جاذب نے تہذیب کے حوالے سے ان کی شاعری کا جائزہ کیوں لیا ہے۔

جاذب قریشی گزشتہ تیس سال سے ادب کا ایک جانا پہچانا نام ہے اس اثنا میں ان کی

www.taemeernews.com

شاعری کے دو مجموعے "شناسائی" اور "پہچان" شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ان کے تنقیدی مضامین "میں نے یہ جانا" اور "آنکھ اور چراغ" کی صورت میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں

شاعر کی حیثیت سے جاذب نے اسالیب، علامات اور لفظیات کے بیشتر پیرایوں پر غور کیا ہے اور انھیں اپنے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے غزل، پابند اور آزاد نظم یہاں تک کہ نثری نظم کو بھی انھوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ ادب کی مروجہ بحثوں میں عملی حصہ لیتے رہے ہیں اور انھیں ادب کے جدید رجحانات سے خاصی دلچسپی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جاذب نے قدیم شاعری اور اس کے کلاسیکی اجزا کا بھی جائزہ لیا ہے اور موجودہ عہد میں جن شعرا کو تہذیبی اقدار کا حامل پایا ہے ان میں سے چند کی شاعری کو مطالعے کے لئے منتخب کیا ہے۔

جاذب قریشی کی تنقید اپنی انفرادیت واضح کرتی جا رہی ہے۔ میں نے ان کے پہلے تنقیدی مجموعے پر رائے لکھتے وقت اس بات کا خاص طور پر تذکرہ کیا تھا کہ جاذب کی تنقید اصطلاحات سے گریزاں ہے۔ جاذب نے اپنی اس تیسری تنقیدی کتاب تک اسی روش کا ثبوت دیا ہے شاید ان کے ذہن میں رینے ویلک کا یہ فقرہ مکمل طور پر بس گیا ہے کہ "تنقید کا بیشتر اصطلاحی سرمایہ "کلیشے" پر مشتمل ہوتا ہے"۔ جاذب نے تنقید کے کلیشوں سے اپنی تحریر کو بچانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں

ہمارے عام ناقدین کی "کلیشے پرستی" یا تن آسانی کا ایک ثبوت تو آئے دن ملتا ہی رہتا ہے۔ جب وہ معاصر ادب کو پڑھے بغیر یہ حکم لگاتے ہیں کہ سب ایک ہی طرح لکھ رہے ہیں کسی کا نام کسی کی تخلیق پر لکھ دیجیے کوئی فرق نہیں پڑے گا اس کا جواب جاذب نے اپنے ایک مضمون میں بڑی خوبصورتی سے دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> "وہ ہمارے ثانوی درجوں کے ان طالب علموں سے کچھ زیادہ نہیں ہیں جو تمام کلاسیکی شاعری کو ایک جیسی شاعری سمجھتے ہیں کہ انھیں عشقیہ اور جمالیاتی موضوعات کے سارے بیان یکساں لگتے ہیں اور وہ ان کے اہم اور خصوصی فرق کو جاننے سے قاصر ہیں"۔ (شب گزیدہ خورشید)

جاذب کی تنقید کا بنیادی وصف شاید یہی ہے کہ انھوں نے پہلے سے طے شدہ خیالات یا

www.taemeernews.com

مروّجہ ادبی فیصلوں سے متاثر ہونے کے بجائے اپنے طور پر ہر اس شاعر کا جسے انھوں نے اپنے تنقیدی مطالعے کے لئے منتخب کیا ہے، سیر حاصل جائزہ لیا ہے اور اس کی تخلیقی انفرادیت کا غیر رسمی انداز میں سراغ لگایا ہے ان کا یہ تنقیدی طریق کار "آنکھ اور چراغ" کے مضامین میں بھی تھا اور "شاعری اور تہذیب" کے مضامین میں بھی ملتا ہے۔ جب عام تنقیدی اعتبار معرضِ خطر میں ہے اور بے اعتباری کی فضا جس کے بیشتر ذمہ دار خود ناقدین ہیں، ادبی محفلوں، درس گاہوں اور عام پڑھنے والے ذہنوں میں جگہ بنائی جا رہی ہے، جاذب اور ان جیسے دوسرے غیر پیشہ ور ناقدین کے تنقیدی مطالعے یقیناً بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

آج کی عمومی علمی اور تعلیمی سطح، دلچسپی کے بدلتے ہوئے شعبوں اور سنجیدہ ادبی کاوشوں کے سلسلے میں بے توجہی اور لاتعلقی کا مظاہرہ معاشرے کے ہر طبقے کی جانب سے کم و بیش ہوتا ہے ایسے مواقع پر ضرورت اسی بات کی ہوتی ہے کہ لکھنے والا اپنے مطالعے کا رعب ڈالنے اور اپنے عالم فاضل ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے، ادب کی فضا کا اعتبار بحال کرے اس ضمن میں اپنی تہذیب کے تسلسل کی عہدِ حاضر تک نشان دہی ضروری ہو جاتی ہے مغرب میں ایک بڑی سطح پر ٹی ایس ایلیٹ کی تنقید نے یہی کارنامہ سرانجام دیا اس سے پہلے میتھو آرنلڈ نے بھی تہذیب ہی کو اپنے مباحث کا حوالہ بنایا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ نظری مباحث اور تنقید کی علمی بنیادوں پر توجہ دینا بھی بہت ضروری ہے لیکن بات وہی نیم کلاسیکی اور کلاسیکی موسیقی یا رقص کی سی ذہن میں آجاتی ہے کہ اس اعلیٰ سطح تک پہنچنے سے پہلے ذوق کی تربیت، معاصر ادب سے دلچسپی اور زندگی کی ترجیحات میں ادب و شعر کی وقعت کا احساس دلانا بھی از حد ضروری ہے۔ جاذب قریشی کو اس عہد کے انہی ناقدین میں شمار کیا جانا چاہیئے جو اس زمانے میں یہ اہم تنقیدی فریضہ انجام دینے میں سنجیدگی سے سرگرمِ عمل ہیں۔

جاذب کی تنقید کسی وقتی ردِ عمل یا شہرت طلبی کا نتیجہ نہیں ہے یہ اس سچی لگن اور ادب سے اس خلوص کا ماحصل ہے، جس کا ثبوت جاذب نے نامساعد حالات میں مسلسل کام کرنے کے ذریعے بہم پہنچایا ہے جب ادب کی پسند ناپسند میں گروہ بندیوں، منفی سیاستوں اور بیشتر بے حسی

کا رجحان عام ہو تو دردمندی سے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے اس لئے کہ ادب کی سچّی راہیں دانادُں کے اقوال یا کتابوں کی بنی بنائی روشوں سے اتنی استوار نہیں ہوتیں جتنی براہ راست انسانی معاشرے کے مطالعے اور اس سے اپنا ذہنی، جذباتی، فکری اور تخلیقی رشتہ جوڑنے سے ہوتی ہیں اس حوالے سے "شاعری اور تہذیب" تصوّرِ اقدار کا ایک مطالعہ بھی ہے۔

انسانی وجود کی کوئی قدر جب اپنے مفہوم کا تعین کرتی ہے تو اس کی ساری ذمّہ داری وہی معاشرہ قبول کرتا ہے جس نے اسے وہ مفہوم دیا ہے۔ قدر کا یہ مفہوم تخلیقی فن کے حوالے سے جب مصوّری، شاعری، موسیقی، فنِ تعمیر یا دیگر شعبوں میں اظہار پاتا ہے تو اس کی ایک مستقل ابلاغی حیثیت ہو جاتی ہے اور اس کی ترسیل کسی غیر ضروری ابہام کا شکار نہیں ہونے پاتی۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس کتاب میں جاذب نے جن شعرا کا مطالعہ پیش کیا ہے صرف وہی اس تہذیبی سفر کی کلید مہیا کرتے ہیں جو جاذب کی تنقید کو درپیش ہے۔ جاذب نے بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن ان شعرا کے کلام کی مدد سے آپ انہی جیسے دوسرے شاعروں کے مطالعے کی سمت مائل ہو سکتے ہیں جو شاید اس کتاب کا منشا و مقصد بھی ہے۔

"شاعری اور تہذیب" کے شعرا میں شفیع عقیل، جمیل الدّین عالی اور عالمتاب تشنہ کے سوا سب ستّر سال سے متجاوز ہیں۔ اس اعتبار سے انہیں اس صدی کے ان تغیّرات کا براہِ راست تجربہ ہوا ہے جو ہماری تہذیبی روایات کے شکست و ریخت پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔

"آنکھ اور چراغ" کی طرح جاذب قریشی نے اس کتاب میں شامل ہر شاعر کے ابتدائی اور تشکیلی دَور سے لے کر اس وقت تک کا سارا تخلیقی سرمایہ پیشِ نظر رکھا ہے اور اپنے تجزیے کے دوران ایسی تبدیلیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو ان شاعروں کے تخلیقی سفر کی تکمیل میں رونما ہوئیں ان میں موضوعات، زبان، اسلوب اور اثرات کا سیر حاصل جائزہ لے کر ہر شاعر کو ایک کلیت میں پیش کیا گیا ہے۔

جاذب قریشی کی یہ کتاب "آنکھ اور چراغ" کے ساتھ مل کر گزشتہ نصف صدی سے زیادہ کی شاعری کا ایک ایسا مطالعہ پیش کرتی ہے جو اس سے قبل شعرا کے بارے میں اس التزام کے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آیا ہے ہماری بیشتر تنقیدی کتابیں ان متفرق مضامین کا

مجموعہ ہوتی ہیں جو ناقدین کبھی کبھار لکھتے اور رسالوں یا اخباروں میں شائع کراتے رہتے ہیں" شاعری اور تہذیب" اور "آنکھ اور چراغ" میں شامل شعرا کے انتخاب اُن کے مطالعے اور تجزیے میں جاذب کا تنقیدی شعور کارفرما ہے ان کی تنقید ادبی اوصاف کے لحاظ سے تنظیم اور آگہی کی ترجمان بن گئی ہے۔ جاذب کا انداز ژولیدہ بیانی سے آزاد ہے۔ ان کی تحریر واضح اور براہِ راست ہوتی ہے اور چونکہ وہ شاعر بھی ہیں اس لئے ان کی تحریر میں شگفتہ انداز نگاری اور زبان کا تخلیقی رویّہ ایک خاص التزام کے ساتھ نظر آتا ہے۔

مروجہ اسالیب کو جاذب نے مختلف شعرا کے حوالے سے اس کتاب میں پرکھا ہے وہ زبان کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ انداز سے توجہ دیتے ہیں۔ ان کے غور و فکر کا ماحصل یہ ہے کہ آئندہ شاعری کی زبان وہی قابلِ قبول اور مقبول ہوگی جسے فارسی کی مرکب تراکیب اور عربی کے نامانوس الفاظ سے بچایا جائے گا۔ وہ اردو زبان میں دوسری زبانوں کے صرف مفرد الفاظ کے استعمال کو خوش آئند چیز سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ شاعری کے غیر رسمی اور تازہ تر اظہار کے لئے زبان کو اپنے فارسی زدہ انداز سے مختلف ہونے کی ضرورت ہے میں ذاتی طور پر اس سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ جس زبان میں غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، جوشؔ، راشدؔ، فیضؔ، مجازؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، عزیزؔ حامد مدنی ایک التزام اور تسلسل کے ساتھ زبان کے ایک خاص اسلوب کو برتتے رہے ہوں اور انہی کے ساتھ ساتھ متعدد دوسرے شعرا بھی اظہار کے لئے فارسی و عربی کے ذخیرے سے استفادہ کر رہے ہوں اس کے بارے میں ذرا مشکل ہی سے یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ اسے دوسری نسلوں انتہا تک پہنچانا بہتر رہے گا۔

حالیؔ، عظمت اللہ خاںؔ، آرزو لکھنویؔ، آزاد انصاریؔ، میراجیؔ وغیرہ نے اس ضمن میں خاصی کوششیں کی ہیں لیکن زبان کا اصل محاورہ تو خود وقت اور وہ معاشرہ تیار کرتا ہے جس سے وابستگی کے کچھ نتائج ناگزیر طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں میرؔ نے "نکات الشعرا" میں ریختے کی اقسام پر روشنی ڈالتے ہوئے ریختہ کی چوتھی قسم کا جو معیار بتایا ہے دراصل وہی اب تک تغیر و ادوار کے ساتھ چلا آ رہا ہے بہرحال یہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن جاذب کو اس کام کی داد ضرور ملے گی کہ انھوں نے شاعری کا تجزیہ کرتے وقت زبان کی اہمیت اور اس کے مختلف

پیرایوں پر بھی خاص توجہ دی ہے۔

"شاعری اور تہذیب" کے ہر شاعر کے مطالعے میں بنیادی حوالہ تو اس کی شاعری ہی ہے لیکن مکمل ادبی شخصیت کی پیش کش کا منصب ادا کرتے ہوئے جاذبؔ نے دوسری اصناف اور جہات کا بھی سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ مثلاً شورؔ صاحب کی تنقید نگاری، ادبی نظریات اور موسیقی سے ان کی وابستگی، صباؔ اکبر آبادی کے تراجم اور تضمین نگاری، رئیسؔ امروہوی کی غزل اور نظم کے علاوہ ان کی قطعات نگاری، حقیؔ کی تنقید، کہہ مکرنیاں پہیلیاں اور تصویرِ زبان کے ساتھ ساتھ انطنی اور قلوپطرہ کا منظوم ترجمہ، جمیل الدّینؔ عالی کی غزل، گیت دوہے کے ساتھ ساتھ ان کے سفرنامے حنیف اسعدی کی نعت گوئی کے دوش بدوش ان کی غزل، نظمیں اور وہ سہ مصرعی نظمیں جو ایک خاص تہذیبی ماحول اور تہذیبی شخصیات سے تعلق رکھتی ہیں، افسرؔ ماہ پوری کی شاعری، زندگی شخصیت اور تنقید نگاری، عالمتابؔ تشنہ کی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ اور شفیعؔ عقیل کی پنجابی شاعری، سفرنامہ اور لوک ادب سے ان کی وابستگی کے مکمل تجزیاتی اور تفصیلی مطالعے پیش کئے گئے ہیں اور یہ کوئی کم اہم کام نہیں ہے اس تنوّع کو گرفت میں لینا خاصا مشکل تھا لیکن جاذبؔ قریشی نے اپنی ہمتِ دشوار پسند سے "شاعری اور تہذیب" کو بھی "آنکھ اور چراغ" کی طرح ایک منفرد تنقیدی کارنامہ بنا دیا ہے۔

شب گزیدہ خورشید

بیسویں صدی کے برِ صغیر میں زندگی اور ادب کے درمیان ہمارے وجود کا شکستہ ہونا تازہ زمین و آسمان کی تلاش اور تشکیلِ نو کے لئے حوصلہ مندیوں کو سمیٹ کر نئی توانائیوں کو اپنے ردِ عمل میں شریک کرنا استعماریت کے طویل ماہ و سال سے انقلاب کی نئی خواہشوں تک اظہار و اسالیب کی تخلیقی بلند آہنگیاں اور شعور و دانش کی عملی گہرائیاں ہمارے تہذیبی نظامِ خیال میں خون کی گردشوں کی طرح شریک رہی ہیں۔ منظور حسین شور کی آواز بھی ہمارے عہد کی ایک ایسی زندہ اور توانا آواز ہے جو غالب اقبال اور جوش کے ساتھ سفر کرتی ہوئی اپنے منفرد تخلیقی و تنقیدی عمل تک پہنچی ہے۔

وہ کوئی پچاس برسوں سے علم و ادب کی زندگی گذار رہے ہیں انہوں نے جو شعر سب سے پہلے لکھا تھا وہ یہ ہے کہ

نظر اُس کی آخر کبھی تو پڑے گی = غزل روز کھڑکی سے پھینکا کریں گے

شور صاحب نے یہ شعر اُس وقت لکھا جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے اور اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں کوئی خوبصورت سا چہرہ انھیں بہت اچھا

لگ گیا تھا۔ اس طرح مہ رُخوں سے ہمکلامی کے لئے اور اُن کی توجہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے شاعری کو حوالہ بنایا تھا پھر وہ ۱۹۲۸ء میں امراؤتی سے علی گڑھ تکمیل تعلیم کے لئے گئے اور وہاں باقاعدہ نظمیں اور غزلیں پڑھ کر مشاعروں میں شرکت کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد انھیں ناگپور یونیورسٹی میں ریڈر اور صدر شعبۂ فارسی و اردو بنا دیا گیا فلسفہ ان کا شوق بھی رہا ہے اور فلسفے سے ان کے مزاج کی بنیادی ہم آہنگی بھی ہے انگریزی فارسی اور ہندی زبانوں سے اور ان کے ادبیات سے انھیں گہری دلچسپی رہی ہے اور وہ ہمیشہ ان کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد اُنیس سو سنتالیس کے دوران حیدرآباد دکن کے ایک نشری اعلان پر وہاں گئے اور خلیفہ عبدالحکیم نے بہت سے اہم امیدواروں میں سے شور صاحب کو حیدرآباد یونیورسٹی میں پڑھانے کے لئے منتخب کر لیا۔

ناگپور سے جاتے ہوئے شور صاحب نے وہاں کی یونیورسٹی کو آگاہ نہیں کیا تھا نہ تو رخصت کی کوئی درخواست پیش کی اور نہ ہی استعفے دیا جب وہ ناگپور پہنچے تو پاکستان بن چکا تھا اور پاکستان آنے جانے والوں پر حکومت کی نگاہیں سخت تھیں شور صاحب کے دوستوں نے انھیں بتایا کہ اگر وہ ناگپور میں ٹھہریں گے تو گرفتار ہو جائیں گے اس صورت حال میں وہ خودکشی کے خیال تک سے گزرے اور آخر کار لوگوں کے مشورے پر پاکستان آ گئے کوئی ایک برس تک کراچی میں ملازمت تلاش کرتے رہے اور انیس سو پچاس میں تاج خیال نے انھیں ڈگری کالج گجرات میں اُردو اور فارسی کے شعبے کے صدر کی حیثیت سے رکھوا دیا۔

پھر وہ لائل پور کے کئی کالجوں میں اٹھارا برس تک فارسی اور اُردو پڑھاتے رہے اس عرصے میں انھوں نے مسلسل لکھا اور اُن کا شعری مجموعہ "نبضِ دوراں" (۱۹۵۹ء) کراچی سے شائع ہوا اور دیوارِ ابد (۱۹۶۹ء) لائل پور میں طباعت و اشاعت تک پہنچا پڑھے لکھے سنجیدہ لوگوں میں شور صاحب کی قدردانی ہوئی اور اُن کی شاعری کو بہت پسند کیا گیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسی اہم ادبی شخصیات نے ان کی شاعری کے بارے میں بڑی دیانتداری سے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے جسے آپ اس گفتگو میں آگے کہیں دیکھیں گے۔

شور صاحب نے زندگی کے نظریئے کو کئی مقامات پر لکھا ہے وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ

"بشریت کی تاریخ میں ملکوں کو تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن نہ عالمگیر انسانیت کی وحدت کو تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ انسان کی فطرت سے محبّت کی جبلّت جُدا ہو سکتی ہے روحوں اور قلوب کے تعلقات نہ فاصلوں سے فنا ہوتے ہیں نہ منافرت سے محبت چاہے انفرادی سطح پر ہو چاہے اجتماعی سطح پر وہ نفس کی شرافت اور آدمیت کی تہذیب کے لئے ضروری ہے۔ محبّت فطرتِ انسانی کا وہ عالمگیر جذبہ ہے جو اپنی ذات میں خود ایک کلچر ہے۔ یہ جذبہ نوعِ انسانی میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے دوستوں عزیزوں اور محبوبوں کی یاد ہی کا دوسرا نام انسانیت کا شعور ہے زندگی کے لئے انسان کو سیاست سے زیادہ شرافت نفس اور تہذیب کی ضرورت ہے۔"

لائل پور سے آنے کے بعد شور صاحب نے جامعۂ کراچی کے شعبۂ اُردو میں بھی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۴ء تک کوئی تیرا برس تک پڑھایا ہے اور ان دنوں اپنی لکھی ہوئی شعری و نثری تحریروں کو مرتب کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

شور صاحب انیس سو اڑتیس سے انیس سو اڑتالیس تک کے دس برسوں میں پورے ہندوستان کے مقبول شاعروں میں شمار ہونے لگے تھے وہ اُس زمانے میں اپنے دراز قد کے ساتھ ایک وجیہہ اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے وہ اپنی طویل نظمیں کو دل آویز ترنم کے ساتھ پڑھتے اور مشاعرے کے ہزاروں لوگوں کو متاثر کر لیتے کہا جاتا ہے کہ احسان دانش اور منظور حسین شور دو ایسے شاعر تھے جو اپنی طویل نظموں کو ترنم سے اس طرح پڑھتے کہ اپنی مقبولیت اور اپنے اثرات میں اضافے کا سبب بن جاتے۔ مشاعرے کی مقبولیت کے باہر بھی شور صاحب اُس زمانے کے معیاری اور اہم ترین ادبی پرچوں میں چھپتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں "ماہنامہ نگار" کا حوالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیاز فتح پوری کی فرمائش تھی کہ شور صاحب ہر ماہ انھیں کچھ نہ کچھ تازہ لکھ کر ضرور بھیجا کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے بیشتر شاعر مشاعروں کی شہرت پر ہی زندہ رہے ہیں لیکن شور صاحب نے ادب کے سنجیدہ پڑھنے والوں پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے اور اس طرح کم وقت میں انھوں نے زیادہ کچھ حاصل کیا ہے۔

شور صاحب کی شاعری میں ایک اہم کردار موسیقی کا بھی ہے۔ وہ ایک میوزیکل سوسائٹی کے صدر بھی رہے ہیں جہاں اُن کی ملاقات اوشا سے ہوئی تھی۔ اوشا ایک سنجیدہ خوبصورت اور مہذّب لڑکی تھی جو بزمِ موسیقی کی سیکریٹری بھی تھی وہ نوجوان اور مقبول شاعر شور سے محبت کرتی تھی۔ شور صاحب بھی شدت سے اُسے سوچتے تھے لیکن اظہار کی جرأتوں تک کبھی نہیں پہنچے کہ اُن کے درمیان مذہب کے زمین و آسمان آ کھڑے ہوئے تھے اور یہ زخم ہمیشہ تازہ رہا ہے۔ شاعری میں شور صاحب نے اوشا کو براہِ راست تو نہیں لکھا لیکن نغمہ و مطرب کے پردوں میں وہ اوشا ہی سے ہمکلام رہے ہیں اور اوشا اُن کی شاعری میں موسیقی کا ایک استعارہ بن کر موجود ہے۔ وہ اس ساز کو اور اُس آواز کو کبھی نہیں بھولے جس کے حوالے سے وہ اپنی عمرِ رفتہ کو پکارتے رہتے ہیں اس سلسلے کی چند رباعیاں دیکھتے چلئے۔

مُطرب مجھے لا کر نہ میرے شہر میں چھوڑ = ماضی کی طرف میرے تصوّر کو نہ موڑ
آنکھوں سے ابھی خون تو ٹپکا ہی نہیں = آواز کے شعلے کو ابھی اور نچوڑ

گونجیں میں تِرے ارض و سما کی تھرکوں = آفاق کو میزانِ نفس پر تولوں
مُطرب جو نہ مدّھم ہو ترے ساز کی لے = ایک رات میں جی بھر کے سحر تک رو لوں

اپنی آدھی صدی کی شاعری میں شور صاحب نے ہزاروں صفحات لکھے ہیں ان تحریر کردہ صفحات میں غزلیں نظمیں رباعیات تنقید اور نفسیات شریک ہے۔ گذشتہ تیس برسوں میں اُن کی جو پانچ شعری کتابیں ہمارے سامنے آئی ہیں اُن میں نبضِ دوراں۔ دیوارِ ابد۔ سوئے یم تمثال میرے معبود اور صلیب انقلاب شامل ہیں جن کے حوالے سے ہمیں گفتگو کرنی ہے اس کے علاوہ انھوں نے پانچ اور کتابیں مرتب کر لی ہیں جن کے نام تو ہمارے سامنے آ گئے ہیں لیکن ان کتابوں کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ "ذہن و ضمیر" مجموعۂ رباعیات ہے "حشرِ مرتب" غزلیات پر مشتمل ہے "انگشتِ نیل" اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ "افکار و اعصار" میں اُن کے مختلف نثری ادب پارے ہیں اور "اندر کا آدمی" انسانوں کی نفسیات اور اُن کے باطن و خارج کے تضادات پر لکھی ہوئی کتاب ہے "اندر کا آدمی" جو قسط وار ہر ماہ ایک مقامی ادبی جریدے میں شائع بھی ہوتی رہی ہے۔ شور صاحب نے اِس کتاب کے درمیان انسانی تاریخ کے بڑے اہم

لوگوں کو اُن کے تضادات کے حوالے سے پیش کیا ہے جس سے زندگی کا عملی ادراک اور مثالی انسانوں کی مثنویت کو دیکھ کر شعر و ادب کی بہت سی پوشیدہ سچائیاں سمجھ میں آجاتی ہیں "اندر کا آدمی" ایک معلوماتی، دلچسپ، علمی اور ایک ادبی تحریر ہے جس کا اسلوب اور جس کا موضوع اپنی نوعیتوں کے اعتبار سے منفرد بھی ہے کمیاب بھی ہے تازہ تر بھی ہے اور اثر پذیری بھی رکھتا ہے اس کتاب کو پڑھ کر کئی اہم شبہات اور کئی مستقل صداقتوں کا علم ہوتا ہے ہم اپنے عہد کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ ہمارا عہد منافقت کا اور جبر و استبداد کا عہد ہے لیکن شور صاحب کی یہ تحریر ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی تاریخ کے ہر زمانے میں منافقت جبر و استبداد اور سیاہ طاقتوں کی شہنشاہیت رہی ہے "اندر کا آدمی" بڑی اہم کتاب ہے۔ اور اس پر تفصیلی گفتگو کا امکان باقی ہے کہ وہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہے۔

شور صاحب کی رباعیات ہم آگے چل کر مطالعہ میں لائیں گے اُن کی تنقید کے جو ٹکڑے ہمارے سامنے آسکے ہیں اُن کے حوالے سے ہم یہاں اُن کے نظریۂ فن کو اُن کے یہاں زندگی کی تشکیل نو کی خواہش کو اور اُس تہذیبی نظام خیال کو دیکھ رہے ہیں جو شور صاحب کی شاعری سے جسم و جان کی طرح پیوستہ ہے۔

جدید عہد کا شعور:۔ "نسلِ آدم کی وہ ساری خونریزیاں جن کا تعلق ماضی سے ہے اور بیسویں صدی کی دو عالمگیر جنگیں براعظم افریقہ میں نسلی امتیاز کی بنا پر حبشیوں کا قتلِ عام امریکہ کی عالمگیر سامراجی قتل و غارت گری سپر طاقتوں کے درمیان اسلحہ کی دوڑ ایٹمی طاقت کا مقابلہ اور مادی دنیا کے وہ تمام مسائل جن کو حل کئے بغیر نہ تہذیب و اخلاق کے کوئی معنی سمجھ میں آسکتے ہیں نہ خود انسان کی زندگی اور اُس کی پائندگی کی ضمانت دی جاسکتی ہے آج کا فلک شگاف زمین دوز قمر گیر اور مریخ شکار انسان جہاں فطرت کی تسخیر میں آسمانوں کو پیوند لگا رہا ہے جہاں مصنوعی سیاروں سے فطرت کے چہروں کو بے نقاب کرتا چلا جا رہا ہے اور جس نے کائنات کی تمام وسعتوں کو سمیٹ کر اپنی مٹھی میں لے لیا ہے اُسی آدم کے لئے عسکری طاقتوں کی برتری [illegible] کا جنون نسل و رنگ کی خونریزی نوآبادیاتی استبداد

اور سامراجیت کی چیرہ دستیاں ایک ایسا چیلنج ہے جس کا حل سائنس کا ارتقا نہیں
بلکہ انسانی معاشرے کی بقا میں ہے نفس کی تہذیب اور بین الاقوامی آشتی میں۔"

تخلیقی قوت کا تازہ تر اظہار:۔

میرے نزدیک اعلیٰ فن کے تخلیقی لوازمات میں فکر کی خلاقی قوت کو سب سے بڑی اہمیت حاصل ہے اس کے بعد دو لوازمات ایسے ہیں جن کے بغیر اعلیٰ فن کی تخلیق ممکن نہیں ہے ایک تو کسی پیکرِ خیال پر اظہاریت کے لباس کو چست کرنے کا ابتکار ہے دوسرے فن کے قالب میں روحِ خلوص کا وجود ہے جہاں تک مطالب کے اظہار کا تعلق ہے تو انہیں نثر پر چل رہی ہے پن چکی کی طرح بھی ادا کیا جا سکتا ہے لیکن سطحی مدعا نگاری اعلیٰ فن نہیں ہوتی۔ فن کی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے کسی خیال میں اظہاریت کا اچھوتا پن ضروری ہے۔ خواہ وہ میر کی سادگی ہو یا غالب کی معجز بیانی ہو جہاں تک روحِ فن کی پاکیزگی کا تعلق ہے۔ اس سے میرا مطلب احساسات کی داخلی صداقت اور جذبات کا خلوص ہے کہ پتھر کی آنکھ ظاہری خوبصورتی کے باوجود بینائی کے بغیر ایک چشم نما سنگ پارہ ہوتی ہے۔"

شاعری اور قاری کا رشتہ:۔

کائنات اپنی ناپیدا کنار وسعتوں کے باوجود ہر شخص کے لئے اتنی ہی بڑی ہے جتنا اُس کے شعور کا دائرہ ہے ایک قد آور شاعر ہونے کے لئے مطالعات مشاہدات اور تجربات کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا لازمہ فطرت کی وہ ودیعت ہے جس کو شاعری کی داخلی صلاحیت کہا جا سکتا ہے اس طور پر ایک بالغ نظر اور گہری فکر کے شاعر کو سمجھنے کے لئے خود قاری کا ذی شعور ہونا بھی لازمی ہے۔

شاعری اور نقاد:۔

انسانیت ایک عالمگیر برادری کا نام ہے جس کو جغرافیائی حد بندیوں میں قید نہیں کیا جا سکتا زندگی اپنے مزاج میں کہیں جامد نہیں ہے یہ ایک عبوری تر کی نامیاتی جدلیاتی اور ارتقائی سچائی ہے زندگی قدرت کا جلال و جمال بن کر شعر و ادب کو گرفت میں لیتی ہے ناقد کا فرض شاعر کی زندگی کے اُس پس منظر کا تجزیاتی مشاہدہ ہے جو تین نظاموں کی وحدت ہوتا ہے سیاسی نظام اقتصادی

نظام اور سماجی نظام ان تینوں نظاموں کی وحدت سے ہر اہم لکھنے والے کی زندگی کا پس منظر وجود میں آتا ہے آرٹ کے پس منظر اور اُس کے اسباب کو نظر انداز کر کے اپنی پسند و ناپسند سے کسی فنکار کو معقول یا نامعقول قرار دینا فن کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ ایک سنگین نوعیت کا جُرم ہے ناقد کو غیر مُتعصّب غیر گروہ بند ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے کے تجربات و محسوسات میں اترنے کی صلاحیّت بھی رکھنی چاہیئے۔ ناقد کو شاعر کے کلام میں شاعر کی تلاش کرنی چاہیئے اپنی اَنا کی تلاش درست نہیں ہے۔"

شاعری اور عالمگیر شعور :۔

> میرے نزدیک آرٹ کے اندر خالص انفعالی نشاطیت یا تعیّشی انفعالیت کے نظریئے کو فن کا منتہائے نظر قرار دینا شعور کی گہرائی اُس کے وجدان کی ہمہ گیری اُس کے تاثراتی ممکنات اور نفسیاتی مدرکات کے دائرے کو ایک ہی رُخ تک محدود کر دینے کے مترادف ہے آرٹ کی بقا کے لئے خود فراموشی کے ساتھ خود شناسی اور خود رفتگی کے ساتھ خود رسیدگی اس حد تک ضروری ہے کہ تاریخ کی سیر میں انسانی معاشرے کی شکست و ریخت میں فنکار کا وجود وجدان اُن عالمگیر سچّائیوں سے شرمندہ نہ ہو جن کے ادراک پر فکری دیانت کا اور احساسِ تہذیب کا مدار ہے۔"

اِفادی ادب اور تخلیقی ادب کا فرق :۔

> فن کی مقصدیت جہاں اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے وہاں فن تبلیغ میں منتقل ہو جاتا ہے مقصدی یکسانیت اور فکریاتی یکجہتی کے ساتھ ایسی تحت الشعوری عصبیّت کارفرما ہوتی ہے جس کی روح سے کسی فنّی تخلیق کو ننگی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا مگر فن کے اندر روحِ عصر اور انسانی قدروں کا وجود یقیناً فن کی صحت ہے۔ فکر کی خلاقیت جمالیاتی شعور کا رچاؤ نفسیاتی صداقت اور احساسات کا تعمّق فن کے وہ اہم عناصرِ ترکیبی ہیں جن کے امتزاج پر فن کی جامعیت اور فن کی عظمت کا انحصار ہے۔"

شور صاحب کے ان طویل مختصر تنقیدی اقتباسات کو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ

یہ خود ایسی وضاحتیں ہیں جو زندگی کے تجربوں سے شاعری کے تخلیقی اور تنقیدی اظہار تک اور علم و شعور کے ادراک سے عمل اور تجزیے کے رویّوں تک اپنا واضح اظہار کر رہی ہیں۔ شور صاحب کی یہ تنقیدی تحریریں ہمیں شعر و ادب کے بہت سے اساسی منطقوں سے بھی روشناس کراتی ہیں اور خود شور صاحب کے اُن نظریوں اور اُن خواہشوں کے حاشیے بھی لکھتی ہیں جو اُن کی پوری زندگی اور اُن کے پورے فن کی کشید کردہ بصیرتیں ہیں۔ شور صاحب کے تنقیدی نظریات وہی ہیں جو اُن کی زندگی اور اُن کی تخلیقات کے درمیان نامیاتی اور حرکی عکس کی طرح اپنے ارتعاش میں ہیں کہ یہی وہ فنی و تخلیقی معیار ہیں جو نہ صرف ہمارے شعر و ادب کی اساس بنے ہوئے ہیں بلکہ عالمی ادبیات کے لئے بھی یہی اصول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ شور صاحب کی تخلیق اور تنقید کے درمیان کوئی ثنویت نہیں ہے بلکہ اُن کی آواز اور ان کی خاموشی اُن کا لکھنا اور ان کا سوچنا اُن کا محسوس کرنا اور اُن کا اظہار کرنا ایک وحدت کی طرح محسوس ہوتا ہے جیسے اندھیرے میں کوئی چراغ جل رہا ہو یا برفانی جنگل میں کوئی شعلہ بھڑک رہا ہو۔

شور صاحب کی ابتدائی شہرت و مقبولیت کا تعلق جس عہد سے بنتا ہے وہ غزل کے لئے متضاد رویّوں کا عہد تھا جس میں ایک طرف لیگانہ، جگر، حسرت، اصغر اور فانی غزل کے مردہ جسم کو اپنی تازہ تجرباتی اور تخلیقی قوتوں کے ساتھ زندہ کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف سماجی طبقاتی شعور اور اس کے فرق کا احساس غزل کو وحشی صنفِ سخن کہہ کر اور گردن زنی قرار دے کر نظم کو اہمیت دے رہا تھا شور صاحب ان دو متضاد رویّوں کے درمیان مشاعرے کے حوالے سے غزل کی شہرت و مقبولیت کو بڑھا رہے تھے لیکن اُن کے مزاج اور اُن کے تجربوں نے ہمیشہ انھیں نظم ہی سے قریب رکھا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ میں غزل سے زیادہ نظم میں اپنے اظہار کو اہمیت دیتا ہوں کہ غزل ہمیں سمیٹتی ہے اور نظم ہمیں زمین و آسمان کے پھیلے ہوئے موسموں کے اونچی اڑانوں کا حوصلہ اور اعتبار دیتی ہے شور صاحب کی ابتدائی غزل پر جگر کے اثرات دکھائی دیتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ اس حصار سے نکل کر لیگانہ سے قریب آجاتے ہیں اور پھر وہ اپنے منفرد اسلوب تک پہنچتے ہیں اُن کی غزل کا مطالعہ بتاتا ہے کہ "نبضِ دوراں" کی غزل جمالیات و رومان کی غزل ہے "دیوار و در" میں اُن کی غزل کی آواز معاشرتی جبر اور تنہائی کی آواز ہے اور "صلیب و گلاب" میں شور صاحب

غزل کے حوالے سے اپنی ذات کو اور ایک بہتر مستقبل کی خواہش کو لکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ہم نے ان موضوعات کو اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہ موضوعات مذکورہ کتابوں میں زیادہ تائید و تاکید کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں ورنہ کئی آزمودہ تجربے اور کئی روایتی اثرات بھی ان غزلوں میں موجود ہیں۔

اپنی ابتدائی غزل میں جمالیات اور رومان کو شور صاحب نے بڑی اثر پذیری کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے کسی ہم سفر کے انتظار میں عمر رواں ٹھہر گئی ہے سارے راستے سنسان پڑے ہیں اور محبوب کی انجمن سے باہر کئی آفتاب نکلے ہیں کئی صبحیں اتری ہیں لیکن شور صاحب کی رات کی سیاسی کوئی بھی نہیں بدل سکا ہے وہ کہتے ہیں کہ

ترے شہر میں وہ عالم بھی گزر گیا جنوں پر
کوئی مجھ سے بات کرتا تو میں اشکبار ہوتا

کہاں غم کہاں غم کی دشواریاں
تبسم بھی اُس سے کیا جائے نا

جب نام تمہارا آیا ہے دل اکثر یوں بھی دھڑکا ہے
جیسے کوئی بربط ٹوٹ گیا جیسے کوئی نغمہ بھول گئے

حسن لی خامشی اے نوبہ
کوئی جیسے کسی کو دے آواز

وجہِ تسکینِ جنوں وصلِ نگاراں بھی نہیں
عشق آساں ہے مگر اس قدر آساں بھی نہیں

جانے کیا سوچ کے ہر راہ پر رک جاتا ہوں
اُس سے ملنے کا کسی موڑ پہ امکاں بھی نہیں

خدا کے واسطے رسوائی نگاہ سے ڈر
تری نظر بھی تیری گفتگو سے کیا کم ہے

اس کی محفل میں اِک شب گزرنے کے بعد
پھر نہ نکلا اُفق سے کوئی آفتاب؟

اس غزل میں نرم گوئی بھی ہے خوش کلامی بھی ہے اثر پذیری بھی ہے اور دل نشینی بھی ہے لیکن وہ انعالی نشاطیت نہیں ہے جو عام غزل لکھنے والوں کو مشاعرے کی سطحی مقبولیت کا گرفتار بنا دیتی ہے اس غزل کی صوتیات اور اس کا آہنگ اپنے دور کے رنگ سے الگ اور منفرد ہے۔

معاشرتی جبر اور ناانصافیوں کا شدید اظہار شور صاحب کی نظم کی شاعری میں ہم دیکھیں گے مگر اُن کی غزل بھی تنہائی کو اور سماجی ناہمواریوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

"شاعر کی انفرادیت اور اُس کے فن کی عظمت کا راز جس حقیقت میں پوشیدہ ہوتا ہے وہ کمالِ فن کے ساتھ اپنے فن میں "واقعیت" کو جذب کر لینے کی صلاحیت کا نام ہے۔" ادب سماجی عمل سے کٹ کر انسانی رشتوں سے بے تعلق ہو کر کسی ایک طبقے کے مفاد سے وابستگی کے ساتھ زندہ تخلیقی عمل نہیں بن سکتا معاشرتی مساوات اور عدلِ عام کے تصور سے جو ادیب بھاگتا ہے "وہ کسی مفلس و بے زر نواب صاحب کی اس بوڑھی ہتھنی کی طرح ہو جاتا ہے وہ پیپل کے پتوں سے پیٹ بھرنے کی کوشش میں دم توڑ دیتی ہے۔" جس دنیا کا اجالا انسان ہے اس کے اندھیرے بے کنار ہیں اس اندھیرے اجالے میں زندہ رہنے والے اپنے گھروں میں آنسو برساتے ہیں لیکن بازاروں میں مسکراہٹیں بچھاتے رہتے ہیں۔ مصلحت اور مجبوریاں ایک ہی میزان کا تول بن گئی ہیں کوئی کتنا ہی کائنات دیدہ یا خدا رسیدہ سہی لیکن آدمی کو نہیں پہچانتا تو اسے اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ آدمی کی شناخت کے بغیر کائنات اور خدا کی پہچان بھی ادھوری رہتی ہے۔ شور صاحب غزل میں لکھتے ہیں کہ

وہ سناٹا خرد کہتی ہے جس کو گھر کی ویرانی
اُسے بھی رونقِ دیوار و در کہنا ہی پڑتا ہے
شریکِ راہ رو کوئی نہیں ہوتا مگر پھر بھی
یہاں ہر راہ رو کو ہم سفر کہنا ہی پڑتا ہے

رہگذر میں نہ تھا آشنا کوئی شخص
پھر بھی ہر شخص کے ساتھ چلنا پڑتا
اتنی آساں بھی غمِ دوست کی تکمیل نہیں
گھر بھی اُجڑے تو بیاباں نہیں ہونے پاتا
بستی بستی بہنے والے سیل کو اس سے کیا مطلب
کتنی کچّی دیواریں ہیں گیلے چھپّر کتنے ہیں
دھوپ کو سایا زمیں کو آسماں سمجھا تھا میں
کتنے غم تھے جن کو ربطِ جسم و جاں سمجھا تھا میں
آدمیّت کا تصوّر بھی ہے کتنا جاں گداز
کتنے تنکے تھے جنھیں کوہِ گراں سمجھا تھا میں
ایک صحرا میں آ کے ڈوب گئے
نچ کے نکلے تھے جو سمندر سے
گذرتی ہے شورؔ ایسی بستی میں عمر
جہاں دو گھڑی بھی جیا جائے نا

جن سورجوں کے خواب میں اندھیرے لکھے ہوئے ہوں ان سورجوں سے ڈرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ شور صاحب دیدہ اور نادیدہ کے درمیان پتھروں کی بارش سے کسی شیشہ گر کی طرح گزرتے ہیں باہر کی زندگی کے تجربے اور خارجی موسموں کے سفید و سیاہ رنگ اُن کے داخلی وجود میں اپنے خیمے لگاتے ہیں اور اُن کے احساسِ تنہائی اور تخلیقی اضطراب کو بڑھاتے ہیں۔ وہ خامشیوں کو "جوابِ جاہلاں" سمجھتے ہیں لیکن اِس رویّے میں تو کرب کی گھٹن بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر یہی بے چینی ان سے ایسی شاعری لکھواتی ہے جو فرد سے معاشرے تک اور جز سے کل تک اپنی آواز کو پھیلا دیتی ہے شور صاحب کی غزل میں زندگی کے چھوٹے بڑے تجربوں کی پُراسراریت تو موجود ہے مگر اُن کے یہاں ابلاغ کا یا علامت اور ایمیجری کا وہ سلسلہ نہیں ہے جو ہمارے جدید لکھنے والوں کو درپیش ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے شور صاحب کے

بارے میں لکھا ہے کہ "جذبات کو عقل کے لباس میں ملبوس کرنا اور عقلیات کو جذبات کے معنی میں محسوس کرنا شور صاحب کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں واردات قلبی اور وقت کے حوادثات اور مسائل اُن کے فن میں یکساں آب و رنگ کے ساتھ موجود ہیں اور اُن کی شاعری ہر حال میں خلوص کی شاعری ہے۔" اَن گنت بے پردہ نظارے ایسے بھی ہیں جو "ظرف نگاہ" میں آنے سے رہ جاتے ہیں ایسے منظروں کو وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے وجدان میں گداز پن اور جن کے شعور میں خلوص ہوا کرتا ہے۔ اس حوالے سے شور صاحب کی غزلوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

حرم کی شمع بجھی بتکدے کے دیپ بجھے
میں جل رہا ہوں تجھے اعتبار ہو کہ نہ ہو
ایک آدمی تو ہو محفل میں گفتگو کے لئے
ندیم ہو کہ نہ ہو غمگسار ہو کہ نہ ہو

مرے جنوں کی شریعت ہے پتھروں سے نبھا
سمجھ سکے تو سمجھ میرا ظرفِ شیشہ گری
یا راہ میں تپتا صحرا ہو یا سامنے دریا ہوں جل تھل
چلنا تو بہر صورت ہے تجھے یا ہنستا چل یا روتا چل
میں آئینوں سے سمجھتا ہوں پتھروں کا مزاج
میں شیشہ گر ہوں مجھے یہ ہنر بھی آتا ہے
ہوش ساحل کے سکوں کو بھی تلاطم سمجھے
عشق صحرا سے بھی دریا کی روانی مانگے
مصلحت جنبشِ لب کی بھی روادار نہیں
آگہی مجھ سے مری شعلہ بیانی مانگے
یہی بے خودی کی جنت یہی آگہی کا دوزخ
یہی سرزمیں ہماری یہی آسماں ہمارا

شور صاحب کی شاعری میں کسی داخلی یا ذاتی احساس کو محدود سچائی کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سوچتے ہیں کہ خضر ہو یا ابنِ مریم کوئی بھی دکھوں کا شریک نہیں ہوتا جو غم لفظ و آواز کی قید میں نہیں آتے انہیں آنسوؤں کے اُس پار نکل جانا چاہیئے وہ وقت کی ناسازگاریوں کو جانتے ہیں لیکن شکست کی تھکن انہیں قبول نہیں ہے کہ وہ اپنے زمانے سے آگے چلنے کا شعور بھی رکھتے ہیں موسموں کی صداقتوں میں اڑتے رہنا پرواز کی روایت کو زندہ رکھنے کے برابر ہے اپنا اعتبار ہی درمیان کے غبار آلود حوالوں کو روشن کر سکتا ہے کہ آسودگی کے چراغ جلانے کے لئے "دیدہ وری" ضروری ہے جس کا رشتہ لہو کے رنگ سے مل کر زمانہ ہو جاتا ہے شور صاحب کہتے ہیں نگارِ شہر کی آواز گم ہے اور راہگذر کے سناٹے ہمسفری کا غرور لکھ رہے ہیں کہ ٹھہرنے والے ساحلوں کو بھی دریا کا بہاؤ سمجھتے ہیں اور چلنے والے اپنی بے خوفی کے ساتھ گہرے پانیوں کو بھی کنارا بنا لیتے ہیں کہ

دنا ہلاکِ تمنا گلو بریدہ سہی
میں اپنے وقت کی آوازِ ناشنیدہ سہی
سنے گا کل میری آواز میرا مستقبل
میں اپنے ساز کا آہنگِ نادمیدہ سہی
سرے طلوع سے میرا غروب کیا کم ہے
میں اپنے وقت کا خورشید شب گزیدہ سہی
رفوگری کی روایت تو کم سے کم ٹوٹی
میں سر سے تا بہ قدم پیرہن دریدہ سہی

جو ڈوبتا ہی نہیں زحمتِ طلوع کے بعد
وہ آفتاب ہمارا شریکِ جادہ ہے
کھڑی ہے رات کی دیوار رہگذر پہ تو کیا
نگاہ پر تو اجالے کا در کشادہ ہے

وہ کیف و کم بھی گیا شب کا رقص رم بھی گیا
مگر چراغ کی لَو کل سے کچھ زیادہ ہے

اس انداز کی غزلوں میں شور صاحب کا اسلوب بہت موثر اور بہت خوبصورت ہے کہ شکستہ جسم و جاں کے درمیان حوصلوں کے خواب اور رات کے سیاہ خانوں میں سورج کے نکلنے کی دعائیں زندگی کو رجائی قوتوں سے ہمکنار کرتی ہیں اور ایک ایسے اعتماد کو اور ایک ایسے امکان کو پیدا کر دیتی ہیں جو زندہ رہنے کا حوالہ ہیں۔ شور صاحب کی ایک غزل ہے کہ

دریا ہوں اگر میں تو مری پیاس بجھا دے
صحرا ہوں تو یارب مری وسعت کا پتا دے
یوں تو نہ مری دیدہ وری مجھ کو سزا دے
سورج میں جہاں بوؤں وہاں رات اُگا دے
معلوم نہیں دھوپ کہاں جا کے چھپی ہے
دیوار کا سایہ ہی نہ دیوار جلا دے
پھیلے گا اجالا تو مرا حدِّ نظر تک
جرأت ہو ہوا میں تو ہوا مجھ کو بجھا دے
میں اپنے ہی ماحول کو آفاق سمجھ لوں
اتنا بھی نہ کم ظرف مجھے وقت بنا دے

غزل کا لب و لہجہ اور اس کے تجربات مشاعرے کی غزل سے آگے بڑھ کر زندگی کے بہت سنجیدہ اور گہرے مسائل کی طرف مڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں غزل کا یہ موڑ اُن کی نظم کی طرف جاتا ہے جہاں وہ غزل اور نظم کے مختلف اسالیب کو اپنے منفرد لہجے میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ شور صاحب کی اس غزل کی آواز جگر اور یگانہ سے آگے بڑھ کر ہماری جدید آوازوں میں شامل ہو گئی ہیں۔ جسے ہم ان کے عہد کے توانا رجحانات کی نمائندہ آواز بھی کہہ سکتے ہیں پروفیسر مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ

"مشرقی و مغربی تہذیب و ادبیات اور فلسفے پر شور صاحب کی گہری نگاہ ہے اُن

کے لب و لہجے اور اُن کے شاعرانہ قدو قامت کا اندازہ اُن کی شاعری سے ہوتا ہے پروفیسر شور اُن چند شعرا میں شریک ہیں جن کو دیکھ لینا شاعر کو دیکھ لینا جن کو سُن لینا شعر کی موسیقی کو پا لینا ہے اور جن کو پڑھ لینا عصرِ حاضر کے نوا نا رجحانات سے آگاہی حاصل کر لینا ہے۔"

شور صاحب کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اُن کی نظم تک پہنچتے ہیں کہ یہی ان کی اصل شناخت ہے شور صاحب کی نظم کی فکری تخلیقی اور تجزیاتی وسعتوں کو اور اُس کی اہمیتوں کو زنجیر کرنے کی خواہش ہم بھی رکھتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ اقبال اور جوش کے بعد بیسویں صدی کے نصف آخر کی شاعری میں شور صاحب کی نظم کی اساسی نوعیت اور آئندہ کے لئے اس کی ضرورتوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ شور صاحب کی نظم کے مطالعے سے پہلے ایک بات کہنی ضروری ہے کہ ان کی نظمیں طویل ہیں اور سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ہم اُن کے بنیادی موضوعات کے اعتبار سے جن نظموں کا انتخاب کریں گے اُن کو مکمل پیش کرنا ممکن نہیں ہم اُن نظموں کے مختصر اقتباسات کو حوالے کے طور پر پڑھنے کی کوشش کریں گے اور اُنھیں پورے طور پر سمجھنا چاہیں گے انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ

"میں نے انیس سو اڑتیس سے آج تک جو کچھ کہا ہے اُس میں بیشتر منظومات ہیں جن بنیادی طور پر میرے فن کی اقدار انسانی ہیں اور میرے موضوعات فطرت آزادی انقلاب سماج محبت انسان اور عالمگیر انسانیت سے متعلق ہیں۔"

شور صاحب کے کچھ اور موضوعات درمیان سے نکلتے ہیں جو گفتگو میں آئیں گے پہلے ہم اُن کی جمالیاتی اور رومانی نظموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں کہ یہی اُن کی ابتدائی شاعری کی مثالیں ہیں ان نظموں کے حوالے سے ہم یہ بھی دیکھ سکیں گے کہ شور صاحب عورت کو جمالیاتی حوالوں اور رومانی جذبوں کے درمیان کیا اہمیت دیتے رہے ہیں اُن کی ایک مشہور رباعی ہے کہ

تعبیر سے یہ خواب بنا جاتا ہے = یہ پھول تصور میں چُنا جاتا ہے
فطرت کے طرب خانے میں عورت ہے وہ گیت = جس گیت کو آنکھوں سے سُنا جاتا ہے

عورت کے بارے میں اُن کا تجزیاتی اظہار بھی دیکھ لیجئے کہ وہ اپنی ایک نظم بنتِ حوا کی تخلیق

کو مشیّت ایزدی کا ایک نغمہ کہہ کر پکارتے ہیں اور اس کو جسم و جان کے لیے آسودہ زندگی کی علامت سمجھتے ہیں۔

بنتِ حوّا کا فسانہ ہے مشیّت کا سرود
ثبت ہے حسن کے ہیکل پہ فرشتوں کا سجود
یہ شبابوں کے شفق زار یہ سینوں کی سحر
عارض و رُخ کے یہ سُورج یہ جبینوں کے قمر
کتنی راتوں کے پیمبر ہیں تجھے کیا معلوم
کتنی صبحوں کے یہ آذر ہیں تجھے کیا معلوم (بنتِ حوا)

شور صاحب نے عورت کی رومانی و جمالیاتی قدر کو اور اُس کے جذباتی رشتے کو فن کے لئے بھی ایک زندہ رشتہ سمجھا ہے ان کے یہاں عورت کی حیثیت اختر شیرانی کی خیالی عورت سے بھی مختلف ہے اور فیض کی سیاسی و انقلابی عورت بھی شور صاحب کی شاعری تک نہیں پہنچی ہے بلکہ عورت خوبصورتی اور محبتوں کا تعلق رکھنے والی وہ عورت ہے جو تہذیبی جمالیات کا استعارہ بھی ہے جو ایک نازک پھول ہو کر بھی ہواؤں کے عتاب برداشت کرتی ہے اور ظلم کے آسمانوں کو اپنے تبسموں سے شکست بھی دے سکتی ہے۔ وہ ادنا ہو یا کوئی اور چہرہ شور صاحب نے ہمیشہ اُسے چاہا بھی ہے اور اس کا احترام بھی کیا ہے یہی سبب ہے کہ اُن کی رومانی اور جمالیاتی شاعری میں تجربوں کے اظہار کی بے باکی اور بے خوفی تو موجود ہے لیکن بازاری رشتوں کا کہیں اظہار نہیں ہے اس سلسلے کی چند اقتباس اور دیکھتے ہیں۔

لَے و نغمہ کی پیمبر وہ محبت کی رسول
جس کی نظروں میں نہیں جبرِ مشیّت کا شمول
آہ! جو یاسمن و گل سے بھی نازک ہو وہ پھول
کر سکی جس کو نہ میلا کبھی افکار کی دھول
جس کی دُنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
اُس کی دُنیا سے میں انکار کروں یا نہ کروں
(اندیشے)

جبیں کی دھوپ عارضوں کی تاب لے کے آئی تھی
نکلتے آفتاب کا جواب لے کے آئی تھی
سیاہ چٹان سے جہاں سفینے پاش پاش تھے
مرے لئے وہ ساحلوں کے خواب لے کے آئی تھی
مری ہنسی کی صبح میرے غم کی رات لے گئی
چلی گئی تو اعتبارِ کائنات لے گئی

(ملاقات)

اب مجھے نسرین و سرو و یاسمن سے کیا غرض
شبنم آوارہ فطرت کو چمن سے کیا غرض
اب مجھے اے دوست تیری انجمن سے کیا غرض
ایک بربادِ وطن کو اب وطن سے کیا غرض
میں مسافر ہوں یہاں سے کل نکل جاؤں گا میں
جانے کس کس رہگذر کی ٹھوکریں کھاؤں گا میں

(رخصت)

شور صاحب کی یہ جذباتی اور رومانی تمثیلیں ریت پر لکھی ہوئی تحریروں کی طرح غبار تو نہیں بن سکیں لیکن وہ اپنے سفر میں ان مرحلوں سے بہت آگے نکل گئے جہاں یہ خوشرنگ موسم اور خوشبوؤں کے زمانے کبھی کبھی انھیں اپنی بازدید پر مجبور ضرور کرتے رہے ہیں کہ ان کے یہاں زندگی اور شاعری میں پلٹ کر دیکھنے کا ایک رویّہ تو نظر آتا ہے لیکن گئے ہوئے لمحوں کو بار بار پکارنا اُن کی شاعری کا مزاج نہیں ہے۔ اس بازیافت کی کچھ مثالیں دیکھتے چلئے۔

کتنے دبکے ہوئے سازوں نے پکارا مجھکو
کتنے نغموں کا ہوا سوگ گوارا مجھکو
وہ سُلگتا ہوا آنچل وہ دہکتا ہوا روپ
وہ گذرگاہ میں تاحدِ نظر دھوپ ہی دھوپ

وہ گل و عطر کی وادی سے گزرتی ہوئی رات
وہ شبِ ماہ کبھی دخترِ ناہید کے ساتھ
میں ترے شہر سے نکلا تو پھر آ بھی نہ سکا
اپنے معبد کے بجھے دیپ جلا بھی نہ سکا
(خلجان)

یاد کر وہ دن جس دن غمِ فشاں تھی چشمِ ناز
ہر نگاہ اک نالہ ہر سکوت اک آواز
بھیگی بھیگی پلکوں پر سادہ سا آنچل
پھوٹتے ہوئے آنسو پھیلتا ہوا کاجل
تو نے خود مرا دامن کتنی بار کھینچا ہے
میں نے ہر جراحت کو قہقہوں سے سینچا ہے
کھو گئیں مری صبحیں میری گردِ منزل میں
ایک رات پھر ہوتی کاش تیری محفل میں (گردِ منزل)

اُس کی محفل میں ایک رات اور گزارنے کی خواہش میں شورؔ صاحب نے اور بہت سی آوازیں بھی سنی ہیں اور بہت سی تصویریں بھی دیکھی ہیں خوبصورت آنکھوں کو غم سے نڈھال پایا ہے دشتِ غم سے تازہ غبار اٹھتے ہوئے دیکھے ہیں رات کے زنداں سے آفتاب کے نکلنے کی دعا کی ہے کہ اُن سے کسی "ریحانہ" کی آواز نے یہ کہا تھا کہ

ہمارے دیس پھر کب آؤ گے تم
ہمیں کھو کر بہت پچھتاؤ گے تم

شور صاحب کے یہاں بازدید اور بازیافت کی جتنی مثالیں دکھائی دیتی ہیں وہ اُن کے شعور سے لاشعور تک اُسی کھونے کے پچھتاوے سے پیدا ہوئی ہیں اس سلسلے کی نظموں میں انھوں نے کئی خوبصورت سراپے بھی لکھے ہیں۔ "فتنۂ رہگذر" اور "بنامِ بت خانہ" میں اُن کی سراپا نگاری اور اُن کا طرزِ اظہار جمالیاتی اثر پزیری کی حدوں تک پہنچا ہوا ہے اس رویے کی شاعری میں

شور صاحب نے اپنے کلچر کے ان گنت عکس بڑی سچائی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں شہر خوباں کی ایک رہگذر میں کل عمر ٹھہر گئی تھی کہ اُس کی روشن آنکھوں اور اس کے لرزیدہ آنسوؤں کے درمیان رقصِ جاں کا موسم تھا تنگ لباسی میں تپش آلود کلیاں خواہشوں کے لمحوں کو تازہ کر رہی تھیں احساس تک نہ تھا کہ آندھی آنے والی ہے جس میں آسودگی کے رنگ اڑ جائیں گے کون جانتا تھا کہ سینوں میں عداوتیں موجود ہیں اور محبتیں اپنا نیلام چاہتی ہیں کہ مجھ سے تیری خوشی بھی بچھڑ گئی ہے اور تیرا غم بھی میرے پاس نہیں ہے اس کا سبب شور صاحب کے خیال میں یہی ہے کہ انسانی شعور کے اعماق میں تصورات و تاثرات اور تخیلات کا وہ پُراسرار شہر مدفون ہوتا ہے جسے انسان لاشعور کہتے ہیں اور یہ لاشعور خود شعور ہی کی ایک تبدیل شدہ شکل ہے۔ حیات انسانی غم جاناں کا سکون پرور ساحل نہیں ہے بلکہ اس بے کنار سمندر کے سینے میں غم دوراں کے سخت اور جرأت آزما تلاطم بھی پوشیدہ ہیں اہم شاعر نظامِ شمسی کے باہر خلا کے درمیان معلق نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ انسانوں کی دنیا میں ان کے ساتھ ہی رہتا بستا ہے اس لئے اس کی اپنی انفرادیت پر اجتماعی زندگی کے تعمیری و تخریبی عناصر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں مگر شور صاحب ان حالات میں بھی مناجاتوں اور دعاؤں کے برکھا موسم دیکھتے ہیں اور ان راستوں میں چلتے چلتے رک جاتے ہیں پاؤں کی آہٹیں کہتی ہیں کہ اس گلی میں چلو جہاں سے ٹھوکریں کھا کر آئے تھے۔

شور صاحب نیچر سے بھی قریب رہے ہیں بلکہ انھوں نے تو بعض نظموں میں اجرامِ فلکی اور فرشتوں کے ذریعے مکالمات بھی لکھے ہیں پہلے فطرت کے حوالے سے چند نظموں کے اقتباسات کا مطالعہ کر لیا جائے۔

یہ ماہ و سال کے بے آذر و صنم ہیکل،
ہوا کی موج سے گرتے ہوئے سنہرے محل
بجھے بجھے سے خیالوں کی راکھ اڑتی ہوئی
جنوں کی سمت خرد بے حجاب اُڑتی ہوئی

غریب خانہ بدوشوں کے چاک پیراہن
جلے ہوئے سے گریباں پھٹے ہوئے سے کفن
وہ تن برہنہ سی شہزادیوں کی ایک قطار
وہ دور ساکت و بہوت اِک قطب مینار
بجھی وہ دیکھ ہواؤں سے صبح کی مشعل
سیاہ پوش ہوا دور ایک تاج محل
افق کے دوش پہ یہ صبح و شام کے انبار
بنا رہے ہیں یہ بادل عجیب نقش و نگار (بادل)

اس سلسلے کی ایک اہم نظم "رات" بھی ہے۔

مشعلِ ماہ و شمعِ کاہکشاں = آستیں سے بجھا رہی ہے رات
بحر کے سینۂ بلوریں پر = فرش اپنا بچھا رہی ہے رات
تا ثریا ہے اک غبارِ سیاہ = دن کی دیوار ڈھا رہی ہے رات
لے کے مٹھی میں ظلمتوں کی دھول = آسماں تک اڑا رہی ہے رات
ابن آدم کے خون کا غازہ = اپنے رخ پر لگا رہی ہے رات

ان نیچری نظموں کو پڑھ کر عالمی جبر اور استعماریت کے منظر ہمارے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں یہ نظمیں انسانی مسائل کے دریچے کھولتی ہیں کہ وہ کون ہے جو ہم سے انتقام لے رہا ہے کہ زمین کی پشت پر شکستوں کے نشاں چیختے ڈھانچوں اور زخموں کے غار و مزار جذام اور کوڑھ کی طرح پھیلے ہوئے ہیں کوئی ذات کوئی پیشانی اور کوئی کمر مٹی میں لپٹی پڑی ہے اور یہ کس کا سینہ ہے کہ پھٹ گیا ہے اور یہ کس کا سر ہے کہ ٹھوکریں کھا رہا ہے سماگ لوٹ لئے گئے ہیں اور آفتابوں کے چراغ زندگی کے طاقوں میں بجھے پڑے ہیں خدا شکار قلندر بھی اور دلق فروش غلام بھی کالے اژدروں کی گرفت میں ہیں لہو چاٹتے ہوئے شعلوں کا عذاب کانپتے ہوئے بچوں کی آوازوں کو ان کی ماؤں سے چھین لایا ہے ماہ و سال کی گردشیں آنکھوں میں آنسوؤں کی کھیتیاں بو رہی ہیں اور شہروں اور بستیوں کے درمیان سورج کا لالباس پہن کر

اُتر آیا ہے خفاش اور خورشید کا مکالمہ اسی حوالے کی ایک تمثیل ہے۔

خفّاش

کسی عارض پہ تابانی نہیں ہے = منوّر کوئی پیشانی نہیں ہے
ہے مشعل تیری اے خورشید بے نور = نہاتے ہیں اندھیروں میں یہاں طور
اجالوں کا کوئی مظہر نہیں ہے = کوئی صبحوں کا پیغمبر نہیں ہے

خورشید

خطا میری تجلی کی نہیں ہے = نظر تیری ہی ظلمت آفریں ہے
تری دنیا ہے وہ دُنیائے تاریک = جہاں اندھے کریں جلوں کی تضحیک
جہاں سینوں میں ہو قبروں کی تنگی = جہاں بستے ہیں آئینوں پہ زنگی
ضمیر و دل جہاں ہوتے ہیں کالے = وہاں بدنام ہوتے ہیں اُجالے

"سیاروں کی آواز" میں مریخ کا مکالمہ بھی دیکھئے۔

مریخ

یہ سلگتی ہوئی دُنیا یہ چٹختے ہوئے سر
بامِ تہذیب پہ جلتے ہوئے جبریل کے پر
یہ دہکتی ہوئی حکمت پہ تمدّن کا دھواں
خونِ آدم کو ابھی اور کروں کچھ ارزاں
دفترِ حکمت والہام کو جلنے دو ابھی
قالبِ مہر میں ظلمات کو ڈھلنے دو ابھی
پھونک کر عقل و سیاست کی دوکانیں رکھ دو
سینۂ خاک پہ ظلمت کی چٹانیں رکھ دو
آؤ صدیوں کی امانت کو مٹا کر دیکھیں
طاقِ تہذیب کی ہر شمع بجھا کر دیکھیں

سیاروں کی آواز

شور صاحب کی ان مکالماتی نظموں کا پس منظر وہ طاقتیں ہیں جو ہزاروں سال کی

تہذیب کو اور علم و دانش کو غبار بنا دینا چاہتی ہیں اور انسانی تمدن کی روشنی چھین کر جبر اور آمریت کا میلہ لگا رہی ہیں شور صاحب کی ایسی نظموں میں بیسویں صدی کے سیاسی و سماجی تاریخ اور عالمی انسان کی مجبوریاں اپنا اظہار شدت سے کرتی ہیں وہ بشریت کے حوالے سے سوچتے ہیں کہ جس خاک پر صدیوں رسول اترتے رہے ہوں وہ خاک جلی ہوئی لاشوں کی دھول میں تبدیل ہو رہی ہے آنسو بے قیمت ہیں اور مناجاتیں بے تاثیر ہیں کیا قادر و قیوم کی رسائی کا منظر ان منظروں میں شامل نہیں ہے کون سورجوں سے اُجالا چھین کر اندھیروں کو طویل قامت بنا رہا ہے۔ شور صاحب جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات کے خلاف نہیں ہیں لیکن وہ ان ایجادات کے عقب میں انسان کی اجتماعی ہلاکت کو بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ اسکائی لیب کے بارے میں ایک ایسے خیال سے گذرتے ہیں جو عام انسانوں کے ذہنوں میں خوف کی پرچھائیاں اتارتا رہا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

میں کہ پر تولتا ہوں خلا میں ہنوز
دیکھنا اے مکان و زماں ایک روز
ہڈیاں خاکیوں کی گلاتا ہوا
نسلِ آدم کو لاوا پلاتا ہوا
جس زمیں پر خلا سے اُتر جاؤں گا
پیٹ دھرتی کا دوزخ سے بھر جاؤں گا
میرا لاوا خلا میں جو بٹ جائے گا
اپنے مرکز پہ سورج سمٹ جائے گا
کس کو معلوم سمٹیں کہاں میرے پر
وا ورا کھول دے میرا رختِ سفر (اسکائی لیب)

بیسویں صدی میں جدید عہد کے عذاب اور اس کی آسودگیاں آج کے انسان کا مقدر ہیں اُسکا اختیار اور اُس کی مجبوری ایک ایسے امکان اور ایک ایسی بے یقینی کو پیدا کر رہی ہے جس نے پوری انسانی برادری کو اور پوری تہذیب کو سارے علم کو اور سارے تمدن کو نفسی

شرافتوں کو اور ادراک و شعور کی عظمتوں کو ایک ایسے ان دیکھے خوف کا شکار بنا دیا ہے جس نے زندگی سے اُس کی سچّی خوشرنگی اور دائمی آسودگی چھین لی ہے۔ بدگمانیوں کے اس بے کنار صحرا کو شور صاحب جانتے بھی ہیں محسوس بھی کرتے ہیں اور ہمارے درمیان اُن اقدار کو رکھنا چاہتے ہیں جس نے ہر مشکل لمحے میں انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ

"وقت کے مسلسل تغیّر و تبدل کے باوجود زندگی کے بہت سے تقاضے ایسے اٹل ہیں جن کی تردید خود زندگی بھی نہیں کر سکتی آزادی کا جبلّی جذبہ انسانیت کا احترام حسن، خیر، نیکی، شرافتِ نفس، رحم، عدل اور انصاف اور انسان دوستی اور تہذیب و تمدن زندگی کی وہ اہم ترین اقدار ہیں جو نہ صرف انسان کے ابدی لوازمات رہے ہیں بلکہ جن کو شعر و ادب کی پائندہ اقدار کی حیثیت بھی حاصل ہے۔"

شور صاحب جب اقدار کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ تذکرہ اُن کے داخلی اضطراب اور دانش حاضر کے شعور سے مِل کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ شدّت سے چاہتے ہیں کہ آج کا انسان بہترین بشری صفات کا نمائندہ بن جائے اس حوالے سے وہ اُن چہروں کو ننگا کر دینا چاہتے ہیں جنھوں نے انسان سے اُس کی سچائی اور اُس کے جسم و جان کا اُجالا چھین لیا ہے شہنشاہیت اور حاکمیت ایک ایسا بوڑھا عقاب ہے جو انسانیت کے سفید کبوتروں کو اور امن کی مٹیالی فاختاؤں کو اپنے خنجر صفت پنجوں سے زخمی کر دیتا ہے۔ شور صاحب کی بیشتر نظموں کے تناظر میں انگریزی سامراجیت کا جبر اظہار پاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شہر کے سویروں کو کرب کی زنجیروں میں قید کر دیا گیا ہے رات کے پرہول اندھیرے سورج کا تابوت بنا ہے ہیں اسیری کے موسم جم و چین میں بھی ہم شباہت ہوتے ہیں کہ میری و شاہی ہیروں سے نہیں چمکا کرتی اور تمام سلاطین سونے کے چمکیلے جبانے ہوا کرتے ہیں کہ ان سے ضمیروں کی سیاہی قطرہ قطرہ ٹپکتی ہے اور اندھیرا بڑھتا چلا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

توحید کے بازو ہوں کہ تثلیث کے شہپر
رہ جاتے ہیں دونوں مرے شعلوں میں جھلس کر

زرتشت کا سورج ہو کہ گوتم کی سحر ہو
ظلمات کے میزان میں تلتے ہیں برابر
جمہور کا شیون ہے مرے ساز کا آہنگ
دہقان کے آنسو ہیں مرے تاج کے گوہر
سلطانیٔ دیری کی خدائی پہ نہ جانا
سونے کی سلوں سے بھی ترشتے ہیں آذر
زنجیر بھی کٹ جائے تو ہوتے نہیں آزاد
یہ خون سے لکھا ہے غلاموں کی جبیں پر (استبداد)

اسی تعلق سے شور صاحب کی ایک نظم "زوال شاہی" بھی ہے کہ

جہاں کہرام میں میری دشاہی مسکراتی ہے
وہاں جمہور خود تابوتِ سلطانی اٹھاتی ہے
فروزاں خون سے ہوتے ہیں جب قشقے جبینوں پر
چٹانیں ٹوٹ کر گرتی ہیں نازک آبگینوں پر
ضمیروں کی سیاہی تاجِ گوہر سے بدلتی ہے!
کہیں سونے کی لَو سے آہنی زنجیر گلتی ہے
مگر جب ٹوٹ جاتا ہے طلسمِ ظلِّ سبحانی
تو پھر تاجوں کے ہیرے توڑنے اٹھتی ہے عریانی (زوال شاہی)

شہر گفتار کو بہت دیر تک دیوارِ سکوت قید نہیں رکھ سکتی اور طاقِ شاہی میں جلتے ہوئے جبروت کے چراغوں سے ہی زندگی اور آزادی کا تازہ سورج طلوع ہوتا ہے جو سینکڑوں صدیوں کی سیاہ رات کا پیراہن ٹکڑے ٹکڑے کر جاتا ہے۔ زمین و آسمان کی بے تواب آنکھیں روز و شب کے درمیان یہ تماشے بہت دیکھتی رہی ہیں کہ آزادی انسان کی وہ خواہش ہے جس پر کسی دوسرے کا نام نہیں لکھا جا سکتا شور صاحب اس آزادی کو ہر انسان کی پیشانی پر لکھا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں آزادی کسی قوم یا کسی نسل کی ہو شور صاحب آزادی کی قیمت کو کم کرنا نہیں

چاہتے وہ ایک طرف شہنشاہیت کو قومی تقدیر کا کوڑھ سمجھتے ہیں تو دوسری طرف انھیں حرم و دیر اور کلیسا و ہیکل کا وہ مصنوعی جبر بھی مقبول نہیں ہے جو انسان کے سچے جذبہ و احساس اور تجربانی فکر و عمل پر بدگمانیوں کے عکس اتارتا ہو۔ وہ ایسی زندگی اور ایسے عہد کو بدلنے کی خواہش رکھتے ہیں جو انسانی آزادی کو اور آدم کی وحدت کو پارہ پارہ کر رہا ہو وہ لکھتے ہیں کہ

ہزار سال کا سورج نگل گئی شبِ تار
طلوعِ صبح سے پہلے شعور شب بدلو
زمیں دو نیم تمدّن دو نیم قلب دو نیم
یہی ہے رنگِ تغیر تو سب کا سب بدلو
خدائے ساز ہو کردگار فن کہلاؤ
بدل سکو تو سبھی شجرۂ نسب بدلو
ہزار قلزمِ نسل و نژاد ہو سیّال
فصیلِ وحدتِ آدم کا ٹوٹنا ہے محال (وحدتِ آدم)

کسی آسودہ معاشرے کا تصوّر اور اس کی بنیادی معنویت یہی ہے کہ فرد یا نسل اپنی اہمیتوں کے ساتھ زندگی میں شریک ہو سکے۔ اور یہ انصاف و عدل اُسی سورج کے نیچے اپنا امکان رکھتا ہے جہاں ظلم اور جہل کی حدیں توڑ دی جاتی ہیں جہاں طاقت سے صلاحیت کو اور محنت سے سرمائے کو ٹکرایا نہیں جاتا بلکہ ان میں ایک ہم آہنگی اور ایک ربط کو تلاش کر لیا جاتا ہے ورنہ معاشرہ اور نسل یا فرد اپنے تضادات کے ٹکراؤ میں تہذیب و تمدن سے نکل کر درندگی اور وحشت کی سمت چلنے لگتے ہیں۔ پھر شہر جنگل میں فرد یا نسل درندوں میں اور سماج یا معاشرہ حیوانی و قبائلی روایات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

جس دور میں سونے کے تراشیدہ ہوں معبود
جس دور میں انسان کا انسان ہو مسجود
وہ دَور ہے تاریخ کی تہذیب کا آغاز
اس دَور میں دے بندۂ مزدور کو آواز

وہ جس کے لہو سے ہے چراغوں میں اجالا
وہ جس کے لئے صبح کا سورج بھی ہے کالا
دلّی کے خرابے ہوں کہ لاہور کے بازار
کھاتے ہیں قسم تیرے ہی خوں کی در و دیوار
تابوتِ مساوات میں جڑنے کے لئے کیل
تاریخ کو درکار ہے مزدور کی قندیل (تہذیبِ آدم)

آزادی اور امن کی زمین سے باہر ہماری اس بیسویں صدی نے دو بڑی ہولناک جنگیں بھی دیکھی ہیں اس آگ میں ہمارے بہت سے عقیدے جل گئے ہیں اور بہت سے انسانی رشتوں کا اعتبار عنبار بن گیا ہے بہت سی کتابیں اپنی معنویت کھو بیٹھی ہیں کہ تہذیب اور تمدن کے بے اندازہ نقصانات کے ساتھ ساتھ انسانی جسم و جاں کی تباہیاں بھی مثالی حد تک لکھی گئی ہیں جنگوں کی ہلاکتیں ناانصافیوں کے حصار میں اپنا روزنامچہ لکھتی ہیں کہ یہ روزنامچہ شہروں کے راستے چلتا ہوا دیہاتوں اور گاؤں تک پہنچتا ہے اور وہ کسان اور وہ مزدور بھی اس آگ میں جلائے جاتے ہیں جن کے آباؤ اجداد نے پشت در پشت مٹی سے سونا اگایا ہو جو ہاتھ زمین کو چھو کر زندگی کی حرارت سمیٹنے کا ہنر سیکھتے رہے ہوں اُن ہاتھوں میں فولاد کی خودکار مشینیں دے دی جاتی ہیں اور پھر وہ زندہ پارس ہاتھ انہیں مشینوں کے درمیان دفن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ شور صاحب نے زندگی کے نزدیک اور دور دیکھا ہے وہ دولت اور طاقت کی خدائیوں کا بھی شعور رکھتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کی زمین پر رہنے والے غریبوں کا دکھ بھی جانتے ہیں اس حوالے سے ان کی طویل نظم کسان کا ایک اقتباس دیکھئے۔

دن ڈھلے پردیسیوں کے گیت پنگھٹ پر نہ تھے
بھیگتے بادل نہ تھے چھلکے ہوئے گاگر نہ تھے
وادیاں کھولے ہوئے تھیں دور تک شالوں پہ بال
ظلمتیں پگڈنڈیوں پر بُن رہی تھیں اپنا جال

ناگہاں اِک شخص یوں آیا نظر صرفِ خرام
لے رہے تھے جس کے سوُج سے اندھیرے انتقام
کھو چکی تھی جس کی پیری ٹھوکریں کھانے کی تاب
جس کا چلنا تھا قیامت جس کا گرنا تھا عذاب
مجھ سے کہتا تھا سنا ہے اختتام جنگ پر
لوٹ کر میداں سے آتے ہیں سپاہی اپنے گھر
موت کو بیچا ہے میں نے سینکڑوں صبحوں کا نور
اپنی فصلوں کی امانت اپنے کھیتوں کا غرور
گولیوں کے دام گھر کی ساری دولت بیچ دی
میں نے تاریکی میں آنکھوں کی بصارت بیچ دی
دیکھتے ہو راستوں پر کس قدر اندھیر ہے
صبح ہونے کے لئے اب اور کتنی دیر ہے (امکان)

شورؔ صاحب نے لکھا ہے کہ تخلیق کار کو اس کے ماحول اور اس کی زمین سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ لکھنے والے کی جڑیں اُسکے اپنے معاشرے اور اُس کے اپنے عہد میں پیوست ہوا کرتی ہیں یہی سبب ہے کہ شور صاحب کے یہاں افراد کو اپنے عہد کو اور اپنے ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس حوالے سے انھوں نے بڑی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں ایسی نظموں میں "جشنِ عید" اور "آدمی نامہ" وغیرہ دلچسپ بھی ہیں اور ان نظموں کی تخلیقی اور تجرباتی سطح بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے

شور صاحب کی نظموں میں معاشرے اور افراد اُن طبقوں اور اُن کے اعمال و افکار کو جس طرح الگ الگ کر کے اور جس طرح اُن کے تضادات کو اظہار میں لایا گیا ہے وہ نظیر اکبر آبادی کی "آدمی نامہ" اور "بنجارہ نامہ" نہ سہی مگر اُن کی شباہتیں ان نظموں میں دکھائی ضرور دیتی ہیں ویسے ان معاشرتی کرداروں کے ذریعے ہمیں اس صداقت کا شعور بھی ملتا ہے کہ شورؔ صاحب جانتے ہیں کہ اُن کے معاشرے پر اور اُن کے افراد پر زیادہ اثرات کون سے ہیں

دولت کی خواہش اور زر کی طلب انسان کے کمزور لمحوں کی پیداوار ہوتی ہے جس عہد اور جس نسل میں تہذیبی اقدار کی گمشدگی رہی ہے وہاں آدمی کے ان کمزور لمحوں نے طویل جال بُنے ہیں اور آہستہ آہستہ ریشم کے کیڑوں کی طرح اپنے ہی جال میں گم ہو گئے ہیں دولت کی اپنی ایک قوت ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ یہ ایک ایسی قوت ہے کہ شہنشاہیت سے فقیری تک اس کا طلسم بچھا ہوا ہے شور صاحب اپنے سائنسی صنعتی اور تیکنیکی عہد میں دولت کی خدائی کو اور اُس کے آہنی کردار کو جانتے ہیں اور اپنی شاعری میں زر کی طلب کو مختلف تمثیلوں میں چہرے بدل بدل کر بیان کرتے رہے ہیں اس حوالے سے اُن کی ایک نمائندہ نظم دولت کی خدائی کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

سیم و زر میرے بنی لعل و گہر میرے رسول
میرا اعجاز خلافت کھیتیوں کا عرض و طول
میرے بوجہلوں کی زد پر ہر پیمبر کا وقار
کھیلتے ہیں میرے زناری خداؤں کا شکار
عفتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں
رقص فرما ہیں مرے سازوں پہ مریم زادیاں
عصمت حوّا پگھل جاتی ہے میری آگ میں
ہر کڑی زنجیر گل جاتی ہے میری آگ میں
جرم و جہل و کذب و عصیاں میرے ہی نشّے میں چور
میرے کس بل پر رذالت کو شرافت کا غرور
میری راتیں میرے دن میرے شبستاں میرے خواب
چھین لوں میں جس سے چاہوں ماہتاب و آفتاب
طاعت و تقدیس و عرفاں آؤ میری سمت آؤ
اپنے سر اپنی جبینیں میرے قدموں پر جھکاؤ

(دولت کی خدائی)

علم اور جہل کے بارے میں شور صاحب کا ذاتی تجربہ اور ان کا ذاتی ردِ عمل دونوں ہی ان کی نظموں میں شدت سے موجود ہیں انھوں نے ہنرمندوں اور بے ہنروں کے درمیان بہت تنقیدی اور تجزیاتی شعر لکھے ہیں جنھیں ہم آگے چل کر دیکھنے کی کوشش کریں گے یہاں اُن کی دو نظمیں "علی گڑھ" اور یونیورسٹی ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ نظمیں کس حد تک اُن کی علمی و تدریسی بصیرت کو ہم پر منکشف کرتی ۔ علی گڑھ کی زمین پر اُن کی مادرِ علمی بھی ہے جو ایک ایسا ادارہ ہے جس نے پورے برصغیر میں جدید سائنس و ٹیکنالوجی کو اور تازہ تر علوم و فنون کو رواج دیا ہے اور اس ادارے سے آزادی کی خواہشوں کے وہ چشمے نکلے ہیں جنھوں نے ہندوستان کے سینے پر ایک سفید لکیر کھینچ دی ہے شور صاحب لکھتے ہیں کہ

اے علی گڑھ اے کہ تو ہے ترکشِ ماضی کا تیر
تو اُجالے کی ہے نیّت تو ہے سُورج کا ضمیر
اے کہ سینے پر ہے تیرے عظمتِ رفتہ کے داغ
اے کہ ہر آندھی سے ہے بیعت طلب تیرا چراغ
غیرتِ طوفاں ہے مجھ کو تیرے صحرا کا سراب
تو نے ہر ذرّے کو بخشا ہے شعورِ آفتاب
میں کہ تیرے دشتِ بے پایاں کا ہوں اُڑتا غبار
تیرے صحرائے جنوں کی میں ہوں گم گشتہ پکار
میں ہی نغمہ میں ہی زخمہ میں ہی اپنا ساز ہوں
حال کا ماتم ہوں مستقبل کی میں آواز ہوں

علی گڑھ ہماری تاریخ میں ایک شہر ہی نہیں ہے بلکہ برصغیر کا وہ انقلابی علمی اور تہذیبی استعارہ ہے جس نے اپنے عہد کو اور اپنے عہد کی نسل کو تازہ تر راستے دکھائے ہیں شور صاحب نے اس مختصر نظم میں خود کو موجود لمحہ کا ماتم اور مستقبل کی آواز لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ گذرتے ہوئے روز و شب نے انھیں غبار میں تبدیل کر دیا ہے شکستگی کا اظہار اور تنہائی کا احساس شور صاحب کی شاعری میں اساسی حیثیت تو نہیں رکھتا لیکن اس کی اہمیت یہی ہے کہ اس حوالے سے شور صاحب

میں خود احتسابی کا عمل اپنی رجائی خواہشوں کے اضطراب کے ساتھ پیدا ہوتا رہتا ہے یہ نظم شور صاحب کی علمی بصیرت کا یا کسی تدریسی تجربے کا بیان نہیں ہے بلکہ علیگڑھ سے ان کی گہری محبتوں کو اپنے اظہار میں لاتی ہے شور صاحب اپنی نظم یونیورسٹی میں لکھتے ہیں کہ

خیال و فکر پر پشتارہ بوسیدہ کتابوں کا
نظر پر دُور تک پھیلا ہُوا ایک جال خوابوں کا
خرد بے بال و پر دریوزہ گر احساس ہوتا ہے
اندھیرا اور بڑھتا ہے جو سورج پاس ہوتا ہے
یہ کس جھوٹے اجالوں سے فروزاں ہے ترا سینہ
خرد کی موت ہے فکر و نظر کی بھیک پر جینا
کلاہ جہل پر طرّہ سند کا کھل نہیں سکتا
کسی صابون سے زنگی کا چہرہ دُھل نہیں سکتا
پسِ آئینہ ہر طوطی جو سنتا ہے وہ کہتا ہے
مرا احساس خود اپنی نظر کی چوٹ سنتا ہے (یونیورسٹی)

اس نظم کی اساس علم و فن یا تدریس و تعلیم پر تنقید نہیں ہے بلکہ اُن نام نہاد سند یافتہ لوگوں کے بارے میں حقیقت کا اظہار ہے جو علم و ادب کی تقلید اور بوسیدہ روایات کو آبائی لباس کی طرح پہنے رہتے ہیں کہ ایسے لوگوں میں کسی نئے تجربے اور کسی نئے عمل کی خواہش پیدا نہیں ہوتی یہ ایسے طوطے ہیں جو رٹے ہوئے یا سُنے سنائے کلمات دھراتے رہتے ہیں شور صاحب کو علم یا کتاب سے اختلاف نہیں ہے بلکہ انھیں ایسے لوگ ناپسند ہیں جو معلوم سے نامعلوم کی سمت چلنے سے خوف کھاتے ہیں کہ ان کی مثال اس زنگی چہرے جیسی ہے جو صابون سے دھو کر اپنا رنگ صاف کرنا چاہتا ہے یا جہالت کی کلاہ پر بڑی بڑی اسناد کو چسپاں کر لینے سے کوئی شخص علم کی روشنیوں تک نہیں پہنچ سکتا اس نظم کی معنویت اور اس کا پسِ منظر ہمارے لئے بہت سے نئے روزن کھولتا ہے کہ بڑی اسناد والے نام نہاد لوگوں سے وہ شخص اچھا ہے جو ذاتی تجربے اور ذاتی احساس کے ساتھ زندگی کا سفر کرنا چاہتا ہے۔

شور صاحب نے انسانی تاریخ کے حوالے سے مختلف زمانوں پر وقت کے سنگین اثرات کو بھی دیکھا ہے کہ کوئی بھی باشعور شخص وقت پر غور کئے بغیر نہیں رہ سکتا انسان کا سارا علم و فن ساری فکر و دانش ساری تہذیب سارا تمدن اور ساری تاریخ اسی وقت کی زنجیر سے بندھی ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان وقت ہی سب سے بڑی قوت ہے جو لمحہ لمحہ ہمیں بدلتا ہے وجود کو عدم بناتا ہے اور پھر عدم سے وجود کو پیدا کر دیتا ہے ایسا اختیار اس زمین اور آسمان کے درمیان کسی کے پاس نہیں کہ تہذیبوں اور نسلوں کی بقا اور اُن کی فنا وقت کے ہاتھوں میں لکیروں کی طرح لکھی ہوئی ہے شور صاحب نے اپنے سنجیدہ مطالعے کے ذریعے وقت کے کئی چہرے دیکھے ہیں اور اُن کو اپنی نظموں کے حوالے سے تجسیم کیا ہے کہ ایک ذرّے سے لے کر آفتاب تک وقت ہی کی گرفت میں ہے اور فطرت کا سارا جمود اور اُس کی ساری حرکت وقت کی حاکمیت کے اندر بند ہے یہاں تک کہ اہرمن اور یزداں بھی وقت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شور صاحب کی نظم وقت بنام "ایشیا" کا کچھ حصّہ دیکھتے ہیں۔

آسماں میری جبیں سورج مرے ماتھے کا داغ
ماہِ تاباں میرا دیپک کہکشاں میرا چراغ
حال میرا نقشِ پا ماضی مرے صحرا کی خاک
آخرت میری قبا دنیا مرے دامن کا چاک
آدم و ابلیس دونوں میرے زنداں کے اسیر
میں بنی آدم کی رسوائی میں یزداں کا ضمیر
جہل کے معبود ہوں یا علم کے لات و منات
اہرمن یزداں بھی چلتے ہیں میرے سات سات
میں ہوں رخساروں کا شعلہ میں بھرے سینوں کی آگ
میں ہوں آدم کی جوانی میں ہوں حوّا کا سہاگ
میرا اِک پرتو اندھیرا ایک پرتو آفتاب
میری اک کروٹ بڑھاپا میری اک کروٹ شباب

انتقامِ حسن چہروں سے جہاں لیتا ہوں میں
زنگیوں کے ہاتھ میں آئینے دے دیتا ہوں
میری فطرت ہے تغیّر میری سنت انقلاب
میں ہی دریا میں ہی طوفاں میں ہی خود موجِ سراب

شور صاحب کا تصوّرِ وقت فلسفۂ سکون کی پیداوار نہیں ہے بلکہ تغیّر و حرکت کی آواز ہے وہ وقت کی بے اندازہ قوّت کو جانتے ہیں لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ وقت ایک جبری آسمان کی طرح ہر عہد کے انسانوں کے سروں پر موجود رہا ہے کہ اس نے بابل و نینوا اور نیل کی تہذیبوں کو یونان اور ہندوستان کی عظمتوں کو قبروں میں دفن بھی کیا ہے اور انھیں غبار بنا کر اڑایا بھی ہے موہن جو داڑو کے حوالے سے شور صاحب اس وقت کے تاریخی جبر کی تصویروں کو بنتے اور بگڑتے دیکھتے ہیں کہ زندہ شہر صحرا بن کر ساکت ہے اور بے آواز ہے سارے دریچے اندھے پڑے ہیں کوئی حنائی ہاتھ مہتاب کو نہیں پگھلاتا کتنے افلاطون کتنی قرۃ العینان اور کتنے گوتم ان شکستہ دیواروں کے درمیان اپنے حسن اپنی محبّت اور اپنے علم کے ساتھ زندہ رہے ہوں گے لیکن وقت نے سارے آئینے توڑ دیئے ہیں سارے چہرے پرچھائیں بن گئے ہیں سارے چراغ بجھا دیئے ہیں اور ساری تحریریں مٹا دی ہیں شور صاحب کی شاعری زندگی کے ان پیش منظروں اور پس منظروں سے گزرتی ہے اور اپنے عہد کے اور اپنے افراد کے درمیان انسانی تہذیب کو تلاش کرنا چاہتی ہے۔

ماضی کی بند گلی کے درمیان پڑے ہوئے لوگوں میں زمانے کی تبدیلیوں کا کوئی احساس نہیں ہے زندگی اور وقت کی لہروں سے کٹے ہوئے یہ لوگ اپنی جھوٹی اہمیتوں کے غبار میں گم ہیں یہ لوگ اخلاقی اقدار کی جامد اور ساکت پرچھائیاں ہیں کہ شور صاحب نے ہمیشہ زندہ افراد کو اور آگے بڑھنے والے باشعور لوگوں کو پسند کیا ہے وہ بند گلی سے باہر آتے ہیں اور کراچی کے عظیم صنعتی شہر کے درمیان جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ان کے اضطراب کو اور بڑھا دیتا ہے کہ جاتی ہوئی نسل ماضی کی گلی میں بند ہے اور آتے ہوئے نوجوانوں کا شہری منظر نامہ انھیں اپنی روایات اپنی تہذیب اور اپنی اقدار سے بہت دور دکھائی دیتا ہے اور وہ اپنی نظم "کراچی" میں

96297

لکھتے ہیں کہ

مری تعبیر میرے خواب دے دے = میرے ہاتھوں میں اک مہتاب دیدے
ہے نظّارہ کراچی کا نظر گیر = مرے سینے میں ٹوٹے ہیں مرے تیر
دوکانوں پر ہجومِ مہ وشاں ہے = زمیں ہے یا زمیں پر آسماں ہے
سہی قدوگل اندام و شفق رنگ = کھلے گیسو بھرے بازو قبا تنگ
یہ ہیچی یہ غلامِ وضعِ افرنگ = ہے جن کو سنّتِ اجداد بھی ننگ
پہن کر تن پہ ملبوسِ فرنگی = سیاہی دھو رہے ہیں رُخ سے زنگی

شور صاحب کی نظمیں باہر کھلی ہوئی آنکھوں کی عکاس ہیں ہمارا عہد ہمارا معاشرہ ہمارے افراد اور اُن کی پسند و ناپسند اُن کا ردّ و قبول اور اُن کا عمل اور ردّ عمل شور صاحب کی نظموں کا اساسی تجربہ ہے اس تمام خارجی زندگی میں ان کی تخلیقی اور داخلی روح گردش کر رہی ہے وہ نامانوس فاصلوں کے درمیان کھڑے ہیں جہاں کے روز و شب جہاں کے موسم جہاں کے چہرے اور جہاں کی آوازیں اُن کی شناسائیوں کی دستاویز سے خالی ہیں انھوں نے تہذیبِ نفس کے ذریعے خود کو نئے حالات سے جوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن اُن کے اضطراب کی سچائی اور شدت نے انھیں آسودگی کا کوئی رنگ نہیں دکھایا۔ انتشارِ خود غرضی، تنگ نظری، عصبیّت بے معنویت اور متضاد مسائل کے بیچ انھوں نے اثباتی برداشت کو تلاش کرنا چاہا ہے لیکن اُن کی شکستگی انھیں تنقید و تجزیے سے آگے بڑھا کر طنز تک لے گئی ہے شور صاحب کے یہاں اس نشتریت کی دو بڑی شکلیں دکھائی دیتی ہیں ایک طرف معاشرے کی عملی زندگی اور خارجی معاملات کے خلاف وہ لڑتے ہیں اور دوسری طرف پردہ فن کی تخلیقی اہمیتوں اور اس کی سچائیوں کو باقی رکھنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں گذشتہ پچاس برسوں میں جو شش کے علاوہ اس نوعیت کی اور اس اسلوب کی لڑائی کسی دوسرے لکھنے والے نے نہیں لڑی ہے ہر لکھنے والا ایک مقتل کے درمیان ضرور رہتا ہے لیکن اہم شخصیتیں خود ایک ایسے مقتل کی تشکیل تو بھی کرتی ہیں جہاں اُن کے لہو سے اُجالے بنتے ہیں اور اُن کے خوابوں کے سورج طلوع ہوتے ہیں شور صاحب نے بھی ایک ایسا مقتل بنایا ہے جہاں وہ تازہ فن سے لے کر زندہ تبدیلیوں کی روشن خواہشوں تک اپنی پوری آواز کے

ساتھ لہولہو ہوئے ہیں وہ اپنے تنقیدی آئینے میں غیر چہروں کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ اپنے خدوخال کو اپنی آنکھوں کی میزان پر بھی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے جس کی دو ایک مثالیں اس وقت ہمارے مطالعہ میں شریک ہیں۔ "کشتارِ ملت" فن کے حوالے سے اُن کی ایک بہت اہم نظم ہے وہ لکھتے ہیں

عہدِ سقراط و فلاطون سے تا دورِ رسل
فن کے معمار بناتے ہی رہے تاج محل

لیکن اِک رات رہی صبح کے سورج کو محیط
فن کی دیوار سے ٹکراتا رہا جہلِ بسیط
اپنے احساس کی سُولی پہ رہا فن مصلوب
کتنے سُورج ہوئے اپنے ہی اُجالوں میں غروب
ہاتھ میں فن کے اجالے کی کسوٹی لے کر
تم ادب کو بھی سمجھتے رہے میراثِ پدر

تم شکم سیر بھی ہو صاحب پوشاک بھی تم
اور عریانیٔ دہقاں سے جگر چاک بھی تم
بندۂ زر بھی ہو دولت سے ہم آغوش بھی ہو
اور تم قوم کے ماتم میں سیہ پوش بھی ہو
خونِ ملت کو نہ انعام و سند میں تولو
کم سے کم اب تو لہو ہاتھ سے اپنے دھو لو

شور صاحب کے یہاں پوشاک اور لباس منافقت اور تضادات کی علامتیں ہیں انھوں نے طبوی کو دھوکے کا معنوی پیکر بنایا ہے اور دوسرے بہت سے لفظوں کی طرح اسے بھی اپنے ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے اس حوالے سے انھوں نے پوری ایک نظم "تضادِ آدم" بھی لکھی ہے کہ معاشرے کے دوسرے طبقوں کی طرح علم و ادب کا طبقہ بھی خود غرضی مفاد پرستی عصبیت اور تحسین باہمی کی بنیادوں پر آگے بڑھنا چاہتا ہے چند لکھنے والوں کو چھوڑ کر سب ہی منافقت کو

اور دولت کی حد سے زیادہ خواہش کو اپنی آستینوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ شور صاحب نے اپنے ذاتی تجربے سے ایسے کالے ہاتھوں کو اور ایسے جھوٹے چہروں کو پہچانا ہے جو قلم کو اپنے لہو میں نہیں ڈبوتے بلکہ اپنے لباسوں پر رنگ چھڑکتے ہیں اور خود کو شہیدوں میں شمار کرواتے رہتے ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اصل قاتل اور اصل شہید دونوں ہی سچی گواہیوں کی تلاش میں ہیں وہ "آئینہ" میں لکھتے ہیں

کل جو آئینہ سامنے آیا = مجھ سے ٹکرا گیا مرا سایا
دیکھ کر میرے رُخ پہ گرد ملال = اس نے کیا کیا کہے ہیں مجھ سے سوال
ہجرتی ہیں کہ ہیں مقامی آپ = غیر معروف ہیں کہ نامی آپ
گلڈ سے ساز باز ہے کہ نہیں = اتنی رسی دراز ہے کہ نہیں
حاسدِ قدر ناشناس بھی فن = کور چشم غلط قیاس بھی فن
یہ دکھانا بھی فن کہ زیر فلک = فن ہے محدود اپنے یاروں تک
فن کے آمر ادب کے ہائی کمانڈ = مغربی گھاس پر پلے ہوئے سانڈ
مکر کے سانپ جہل کے اژدر = رینگتے فکر و فن کے سینے پر
اکبروں سے بھری ہے فن کی گلی = یہ بھی ہے مقتلِ لیاقت علی

شور صاحب نے اس "آئینہ" کی طرح کئی اور نظمیں بھی لکھی ہیں جو شدید زہرناکی اور گہری سداقت رکھتی ہیں ایسی نظموں کی اہمیت یہی ہے کہ وہ منافق، جھوٹے، احمق، خود غرض اور مکار لوگوں کے سروں سے جھوٹی فضیلتوں کی دستار کا کابوس اتار پھینکتی ہیں اور غبار کے پیراہن چاک کر کے سیاہ چہروں کے ہاتھوں میں روشن "آئینہ" دے دیتی ہیں کہ اس طرح بگڑے ہوئے ناہموار معاشروں کے اور فن کے درمیان کنخارسس کا امکان پیدا ہو سکتا ہے شور صاحب کے تجربے کی بے خوفی نے اور ان کے تخلیقی اظہار کی جرأت آزما توانائی نے ہماری موجودہ شاعری میں ایک بہت زندہ ایک بہت سچا باب رقم کیا ہے۔

شور صاحب اپنے زمانے اپنے معاشرے اور اپنے عہد کے انسانی تضادات سے مطمئن نہیں ہیں یہی سبب ہے کہ اندھیرے اور اُجالے کو الگ الگ دیکھنے کی خواہش کو انھوں نے

بڑی اہمیتوں کا سبب بنایا ہے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے تخلیقی و فنی نقطہ نظر کا نمائندہ اظہار کرتے ہوئے بھی ہمارے آدرش کی طرح ہے وہ اپنے ذاتی زخموں کو نمائش تک اور اپنے داخلی کرب کو رقت آمیزی یا انفعالی اظہاریت تک کم ہی پہنچنے دیتے ہیں تاہم وہ پیالۂ ساغر نہیں ہیں اور کوزہ گر کے چاک کی طرح بے آواز گردش میں بھی نہیں رہتے ہیں کہ وہ دکھ کو محسوس بھی کرتے ہیں اور کراہتے بھی ہیں ان کے یہ دکھ اور ان کی یہ کراہیں معاشرے اور فن کے درمیان ریکارڈ ہوتی رہی ہیں وہ "ہمالہ کی سرزمین" میں لکھتے ہیں کہ

بستی مری بستی نہ کوئی گاؤں مرا گاؤں
ڈستی ہے مجھے دھوپ ڈراتی ہے مجھے چھاؤں
برباد نہیں میں کہیں آباد نہیں میں
آئے کہ نہ آئے غمِ غربت کی ہوا راس
بجھنے کا نہیں درد میں سلگا ہوا احساس
قندیلِ سرِ رہگذرِ باد نہیں میں
ہر چند کہ مسموم ہے سورج کا پیالہ
میں بھی وہی کہتا ہوں جو کہتا ہے اُجالا
نمرود نہیں میں کوئی شدّاد نہیں میں

کچھ گمان اور کچھ خوف ہمارے مشترک ہیں یہ اور بات ہے کہ زیادہ لوگوں نے مصلحت آمیزی کو اپنی آنکھوں اور اپنی آوازوں کے سامنے اس طرح ایستادہ کر لیا ہے کہ ہمارے ہونٹوں کی لرزش اور ہمارے خوابوں کا ہنر دونوں ہی ناکردہ گناہوں کی سزا برداشت کر رہے ہیں شور صاحب کا حوصلہ اور ان کی سچائی اپنی ذات کے حوالے سے وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں جو ان گنت لوگوں کا گونگا اور اندھا المیہ بنا ہوا ہے۔

غلط سمجھا تھا مفہومِ در و بام = ہوا محسوس یہ گھر سے نکل کر
نہ میری فکر کی دیوار لاہور = نہ میرے ہوش کی سرحد پشاور
ہیں سر سے پاؤں تک تھا آگ ہی آگ = الجھتی بھی تو کب تک مجھ سے مرمر

کہاں تک مجھ پہ ہوتی بارشِ سنگ = میں خود آئینہ تھا خود آئینہ گر
نہ ایسا کبھی کوئی میری بغل میں = نہ میں حلقوں کے بت خانوں کا آذر
نگاہ و فکر کے بونوں کو ہوتا = میرے قامت کا اندازہ بھی کیونکر
اُجالے کی کہاں محدود پرواز = شکستہ پر کہاں خورشید خاور
(عذابِ آگہی)

اس نظم کا پس منظر وہی ہے کہ روشن بینائی کو زخمی کرتی ہے اور دکھ سچے وجود کا مقدر ہوتے ہیں" آگہی کا عذاب" جاہلوں کو نہیں ملتا کہ چٹانیں پھول کی نازک و خوشرنگ پتیوں کو اور اس کی تازہ خوشبوؤں کو محسوس کرنے اور دیکھنے کی تمازت برداشت نہیں کر سکتی۔ شور صاحب انسانوں کے درمیان ناانصافی کو جھوٹ کو اور ناحق کو دیکھتے ہیں تو اس کا بوجھ شدت سے محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

جو مادر زاد اندھے ہو کے بھی سورج پہ ہنستے ہیں
وہاں ایسے بھی فرزندانِ عرفاں ہیں جہاں میں ہوں
بغل میں جن کے ہیں بیساکھیاں تحسین باہم کی
وہ بونے قامتِ بالا پہ نازاں ہیں جہاں میں ہوں
وہ چہرے آہ! جن پر کوڑھ کے دھبے نمایاں ہیں
اُنھیں چہروں سے آئینے پشیماں ہیں جہاں میں ہوں
نہ کوئی ہم نظر میرا نہ کوئی ہم سفر میرا
نگاہ و فکر کے رستے ہی ویراں ہیں جہاں میں ہوں
جو میری سرزمیں تھی اب وہی ہے آسماں میرا
وہیں میری تباہی کے بھی امکاں ہیں جہاں میں ہوں (میرا ماحول)

شور صاحب کی تخلیقی روح غیر عدلی اور غیر حقیقی معاشرے کے دوران کبھی کبھی چیخ بھی بن گئی ہے کہ وہ اپنی اہمیتوں کا شعور رکھتے ہیں اور بد دیانت لوگوں میں دیانت کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جھوٹے اور مادہ پرست زمانے میں اقدارِ انسانیت، تہذیبِ نفس، عدل محبت اور

جمالیات کی وہ معنویت نہیں ہوتی جو زندہ قوموں کے اور اچھے معاشروں کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ شور صاحب نے اس اندھیرے کے درمیانی حصار میں رہ کر ایک "ایسا ماہِ نخشب" تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے جو رات کے سیاہ لباس کو تیاں آئینوں سے سجا سکے وہ اپنی سمت رکھتے ہیں اور گزشتہ آدھی صدی کے تجربوں کو اپنے اظہار میں لانے کی کوشش کرتے ہیں

ادراک و معنی ہیں جبیں سا میرے آگے
تخیّل بچھاتی ہے مصلیٰ میرے آگے

ہر گل ہے بہارِ سر صحرائے بہاراں
ہر غنچہ ہے اِک نقشِ کفِ پا مرے آگے

ہر شام سیہ پوش ہے پیغمبرِ انوار
ہر شب ہے تجلّی کا صحیفہ مرے آگے

ایک کرب مسلسل ہے غمِ عشق کی فطرت
ہے خاک بسراب بھی زلیخا مرے آگے

تاروں سے پرے ہے مرے تخیّل کی پرواز
بازوئے ملائک ہے شکستہ مرے آگے

ہر عہد کی ظلمت کو اُجالے سے ہے انکار
ہر دور میں مصلوب ہے عیسیٰ مرے آگے (نگاہِ بادیاب)

غالب کے شعورِ نیم یا لاشعوری اثرات سے پیدا ہونے والی اس نظم کے تجرباتی اور تخلیقی کینوس نے زمانے کو کائنات کو اور بشری عظمتوں کو ایک وحدت میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے

شور صاحب زندگی کی ارضیت کے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں تخیّلی رجحان ناپسند نہیں ہے کہ اُن کی شاعری کا ایک افق وہ بھی نظر آتا ہے جہاں وہ اپنی دردمند آواز میں بلند آہنگیوں کے ساتھ ایک ایسے نئے صحیفے کی خواہش کرتے ہیں جو انسانوں کے درمیان آسودگی کا آسمان اور بے خوفیوں کی زمین پیدا کر سکے شور صاحب کی شاعری کا یہی وہ اہم ترین منظر نامہ ہے جہاں اُن کی عمر بھر کی محنتوں کا ارتکاز دکھائی دیتا ہے اور انسانی خواہشوں کے سامنے خوبصورت

رنگ اور ساری بے خزاں موسم اور سارے چمکتے ہوئے سفید اُجالے ایک زندہ خواب کی طرح ہمارے درمیان اُترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں زمین کی جلی ہوئی مٹی چمکنے لگتی ہے اور خواہشوں کا جزیرہ سفید کبوتروں کی اڑان بن جاتا ہے۔

میرے احساس نے سینچیں میرے تخیّل کا نور
ایک ابھرتے ہوئے سورج کا افق پر ہے ظہور
عقل سونے کی سلوں سے نہ تراشے یزداں
لاش جمہور پہ ناچے نہ غرور سلطاں
ڈر کے انسان کے سائے سے نہ بھاگے انسان
آبگینوں پہ نہ ٹوٹے کوئی سنگین چٹان
سینۂ کاہ میں بیدار ہو پربت کا شعور
دم بخود صرصر و طوفاں ہو چراغوں کے حضور
آدمی دیکھ چکا صبح کے خورشید کا خواب
اُٹھ کہ توڑیں شبِ دیجور کے خیمے کی طناب
حرم و دیر کی خاطر نہ کلیسا کے لئے
اک صحیفہ ہو نیا آدم و حوّا کے لئے (نیا صحیفہ)

شور صاحب کو زندگی کے اُس تازہ تہذیبی نظامِ خیال کی خواہش ہے جو صدیوں کے زخمی انسان کو ہنرمندی محنت، سچّائی اور اُجالے کا اعتبار دے سکے جبر کی پرچھائیاں اور خوف کے زلزلے کہیں پسِ دیوار قید کر دیئے جائیں اور انسان کے لئے جسم و جان کی اور خواب و خیال کی روشن آزادیوں کے ساتھ زندہ رہنے کا امکان پیدا ہو جائے وہ ایسے کارواں پر سوچتے ہیں جن کے پاؤں کے نشانات خود خضر کی رہگذاروں کے چراغ بن سکیں۔

سنگ سے آئینے ظلمت سے تراشیں آفتاب
ہر غبارِ راہ سے اک کہکشاں پیدا کریں

وسعتِ صحرا عطا کردیں خسِ ناچیز کو
شبنمِ بے مایہ سے بحرِ رواں پیدا کریں
خونِ آدم ذات سے ہوتی ہے جن کی لَو بلند
اُن چراغوں کے لئے کچھ آندھیاں پیدا کریں
اپنے ہر نقشِ قدم پر ثبت کردیں انقلاب
دھوپ سے سایہ زمیں سے آسماں پیدا کریں
ہر روش پر ایک عہدِ تازہ کو آواز دیں
ہر قدم پر ایک منزل کا نشاں پیدا کریں"
(ہماری آواز)

گزشتہ نظموں کے درمیان معاشرتی تبدیلی کی جو خواہش سامنے آئی ہے اس کی اساس کسی پارٹی لائن کی طرف سے معاشی بدحالی کا کوئی ردِ عمل نہیں ہے بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی انسان کی تبدیلی کی وہ خواہش ہے جسے اپنے اپنے اسالیب اور اپنے اپنے فکر و تجربے میں اقبال اور جوش کی شاعری کے درمیان بھی اظہار میں لایا گیا ہے شور صاحب کو اقبال اور جوش دونوں ہی بہت عزیز رہے ہیں جہاں تک ان دونوں کے اثرات کا تعلق ہے تو کونسا اہم شاعر ایسا ہے جو بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں رہ کر ان آوازوں سے اپنے جسم و جاں کو الگ کاٹ سکا ہو دیکھنا یہ ہے کہ شور صاحب ان آوازوں میں گم ہو گئے ہیں یا انھوں نے ان آوازوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ شور صاحب کے اس مطالعے میں ہم یہ محسوس کرتے چلے آئے ہیں کہ اس شاعری کے داخلی وجود میں جہاں جوش اور اقبال ساتھ دکھائی دیتے ہیں وہیں شور صاحب تازہ تر زندگی کے مسائل کو اپنے منفرد شعری پیکر تراشی کے حوالے کر دیتے ہیں اور اس طرح اقبال اور جوش کی آوازیں شور صاحب کے ذاتی تجربے میں ایک زندہ صورت اختیار کر جاتی ہیں کہ ان کی شعریات اور ان کے اظہار و اسالیب جوش کی محاکاتی تخیلی تعمیمی زاویوں سے مختلف ہیں کہ شور صاحب کی شاعری انسانی فکر اور معاشرتی تجربوں کے تضادات اور ان کے تصادمی رنگ و آہنگ کی نوعیت نئی بھی ہے اور مختلف بھی ہے جو لوگ شور صاحب کی شاعری میں صرف جوش کو تلاش

کرتے رہتے ہیں وہ ہماری ثانوی درجوں کے ان طالب علموں سے کچھ زیادہ نہیں ہیں جو تمام کلاسیکی شاعری کو ایک جیسی شاعری سمجھتے ہیں کہ انھیں عشقیہ اور جمالیاتی موضوعات کے سارے بیان یکساں لگتے ہیں اور وہ ان کے اہم اور خصوصی فرق کو جاننے سے قاصر ہیں اگر آپ اس شاعری سے اقبال کے موضوعات کشید کرنے کی کوشش کریں گے تو ایسی اخذ شدہ شاعری میں دہرانے کا کوئی عمل موجود نہیں پائیں گے بلکہ گذشتہ معلوم سرمائے کو شور صاحب نے اپنی تخلیقی انفرادیت کی تکمیل کے لئے استعمال کیا ہے اس حوالے سے ان کی نظم اقبال ہی سے ایک اقتباس دیکھتے ہیں۔

ہوا کے طاق میں جلتی ہے شمعِ لیل و نہار
کھڑی ہے سیلِ حوادث میں وقت کی دیوار
جو آفتاب کے ماتم میں آسماں کے تلے
شبِ سیاہ سے سورج نئے تراش نہ لے
جسے خلاؤں میں چلنے کا بھی غرور نہ ہو
جسے زمین پہ رہنے کا بھی شعور نہ ہو
اسیرِ دامِ اجل ہے وہ وقت کا بیمار
ہوا کی موج سے بجھتی ہے شمعِ راہگذار
ہے انقلاب کی وادی میں ایک جوئے کم آب
زمین زاد خلاؤں کے خون کا سیلاب

ہماری حدوں تک شور صاحب کی نظموں کا مطالعہ ختم ہونے کو آیا اور سانتا میے پر ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے کا پڑھ لینا غیر ضروری نہیں ہوگا وہ لکھتے ہیں کہ

"شور کی شاعری فکر کی خلاقانہ کارفرمائی اور احساس کی دیانتدارانہ ہنر آزمائی کا اظہار ہے عصرِ حاضر کے درد و کرب معاشرے کی گیر و دار سماجی عوامل کی دور رس کارفرمائیوں سیاسی و مذہبی تصورات کی بدلتی ہوئی صورتوں کے بیان میں شور قدیم و جدید کی حد بندیوں میں نہیں پڑتے جدید انسان کے ذہنی کوائف کے اظہار میں

وہ الفاظ اور ان کی دلالتوں سے خوفزدہ نہیں ہیں انھوں نے قدیم ادبی سرمایے کو بڑی پامردی سے دیکھا بھالا ہے لیکن اپنے آپ کو اس حصار سنگیں میں قید نہیں کیا بلکہ اس کی مدد سے وہ تلازمات کے نئے نئے سلسلے اور افکار کی نئی نئی جہتوں کا سراغ لگاتے ہیں زندگی اور شاعری کے باہمی تعلق کا احساس رکھتے ہوئے بھی وہ تبلیغی سرگرمیوں میں نہیں پڑتے۔"

ہم نے شور صاحب کی شاعری کو اور ان کے اساسی موضوعات و اسالیب کو نمائندہ صورتوں میں پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی طویل نظم "میرے معبود" اور ان کی منفرد "رباعیات" کو ہم اس حوالے سے بھی دیکھتے ہیں کہ ان میں شور صاحب نے اپنی پوری زندگی کو اور اپنی پوری شاعری کو کشید کر کے پیش کر دیا ہے لیکن اس رویّے کی اہمیتوں کا پورا احساس اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کی تمام شاعری سے گزر آیا جائے۔ "میرے معبود" وہ نظم ہے جس میں ایک ایسا المیاتی رزمیہ موجود ہے جو شور صاحب کی ذات کے حوالے سے ہمارے گرد و پیش کو اور ہمارے سماجی اور معاشرتی تضادات کو اور اندھیرے اُجالے کے تصادم کو اپنے اظہار میں لاتا ہے یہ نظم ایک نعرہ ہے جو شور صاحب کے سینے سے برآمد ہوتا ہے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ زمین و آسمان کو روشنیوں سے مجلّا کر جاتا ہے۔ "میرے معبود" ایک ایسی چیخ ہے جو ہونٹوں سے بلند ہوتی ہے اور جسم و جان کے راستوں پر سفر کرتی ہوئی انسانی شعور سے لاشعور تک اتر جاتی ہے اس نظم کو چار لائنوں کے اسٹینزا میں لکھا گیا ہے جس کی چوتھی لائن دہرائی جاتی ہے کہ

میرے معبود کوئی اور سزا دے مجھ کو

اس نظم کا مزاج اور اس کا آہنگ بہت حد تک اسی ایک مصرعے سے اپنے تعیناتی حدود کو مقرّر کر لیتا ہے لیکن اس اسلوب اور اس کی لفظیات میں شدید اضطراب کے ساتھ ایک گداز پن بھی موجود ہے جو ہمیں مسلسل اپنے درمیان رکھتا ہے لفظوں سے مل کر مصرعوں کا آگے چلنا بے ٹھوکر اور بے رکاوٹ رفتار کی بہت اچھی مثال ہمارے سامنے پیش کرتا ہے چند اسٹینزا دیکھتے ہیں

جنبشِ لب بھی جہاں جانِ خلاطوں کو ہو قہر
جس کے زندانوں میں سقراط پیا کرتے ہیں زہر
میں ہوں اُس شہر کی دیوار توڑھانے مجھ کو
میرے معبود کوئی اور سزا دے مجھ کو

کتنی سنگین چٹانوں سے کیا میں نے کلام
میں نے کن برف کے تودوں پہ لکھا آگ کا نام
سازِ زرتشت نہ گوتم کی نوا دے مجھ کو
میرے معبود کوئی اور سزا دے مجھ کو

کتنے اندھوں میں کئے آئینے میں نے تقسیم
کتنے گونگوں کی فصاحت کو کیا ہے تسلیم
اب سکوتِ درو دیوار بنا دے مجھ کو
میرے معبود کوئی اور سزا دے مجھ کو

آدمی چہرہ بہ چہرہ ہیں یہاں قابلِ غور
لوگ باطن میں ہیں کچھ اور بظاہر کچھ اور
اہرمن کوئی نہ جبریل نما دے مجھ کو
میرے معبود کوئی اور سزا دے مجھ کو

شور صاحب کے لئے جھوٹ کبھی جائز نہیں رہا اور اور تبلیغ کو انھوں نے مباح نہیں سمجھا انھوں نے نہ تو فن کا ماہ نخشب، بننا پسند کیا ہے اور نہ ہی وہ ہنر کے حسن بن صباح بنے ہیں انہیں میر اور غالب کے خلعتوں کی خواہش بھی نہیں رہی ہے وہ تو سچائی عدل امن اور خوبصورتیوں کی تلاش میں رہے ہیں جو اچھی زندگی کی کلیدی ضرورتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے عہد کے ایک ایسے سنگم پر کھڑے ہیں جہاں ایک طرف جاگیرداری اور سرمایہ داری کا صدیوں پرانا نظام پارہ پارہ ہونے کو ہے اور دوسری طرف صنعتی سائنسی اور تیکنیکی لشکروں کے سفید اور سیاہ

غبار کو ہم اپنی سمت بڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں چیزیں عقائد فکر اور خواہشیں سب کچھ تبدیل ہو رہی ہیں ہو سکتا ہے کہ انسانی تہذیب بالکل اپنے خدوخال بدل دے اور اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ قدیم اور جدید سے مل کر کسی ایسے چہرے کی تشکیل نو ہو جائے جو انسان کے داخلی اور خارجی خوابوں کو آسودہ کر سکے۔ گمان و امکان کے درمیان ہم بھی شکستہ ہیں اپنی تلاش میں ہیں اور گمشدگی کے عذاب کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں شور صاحب کی بیشتر شاعری اور "میرے معبود" کو ہم اسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں جو ہمیں زندگی کی تشکیل نو کا احساس دلاتی ہے

رباعیات کے بارے میں واضح طور پر یہ بات کہہ دی جائے تو غلط نہیں ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جوش کے بعد منظور حسین شور ہی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی کی صنف کو نہ صرف تازہ اور زندہ کر دیا ہے بلکہ اس کو ایک نئے افق تک پہنچا دیا ہے ہمارے یہاں رباعی کی روایت دوسری نظمیہ شاعری کے تقابل میں کچھ زیادہ بڑی روایت نہیں رہی ہے۔ پھر بھی غزل کے بعد رباعی کی دلچسپی سننے والوں میں پائی جاتی ہے اس کی بحریں محدود ہیں اور سہل نہیں ہیں پہلے رباعی کے موضوعات بھی متعین تھے اب موضوعات کا حصار ٹوٹ گیا ہے اور رباعی خارجی اور باطنی زندگی کو پورے طور پر سمیٹنے کا اختیار رکھتی ہے۔ شور صاحب نے نعتیہ رباعیات بھی لکھی ہیں اور ان میں بہت سی شعریات کو نئی اور تازہ معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے ہماری شاعری میں محمدؐ اور ابوجہل کو خیر و شر کے مابعد الطبیعاتی معنوں میں لکھا جاتا رہا ہے لیکن شور صاحب نے کئی دوسرے لفظوں کے ساتھ ان دونوں کو بھی سماجی اور معاشرتی تناظر میں بڑی اہمیتوں کے ساتھ یوں لکھا ہے کہ

یوں جان کے ساکت تو نہ رہنا ہوگا
سچ کی بھی کڑی چوٹ کو سہنا ہوگا
عرفان محمدؐ ہو تو سب سے پہلے
بوجہل کو بوجہل ہی کہنا ہوگا

شور صاحب کی رباعیات ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں مگر ہم انھیں مشاعروں میں سنتے رہے ہیں کہ انھوں نے رباعی کو فنی تکمیل کے ساتھ مختصر نظم کی معنویت میں تبدیل کر دیا ہے شور صاحب کے

اظہار اور اسلوب کی لسانی قوت اور ان کے تخلیقی انسلاب کی نوعیت ہمارے دوسرے لکھنے والوں سے بہت مختلف ہے تلازمات کا جو منفرد انتخاب اُن کے یہاں موجود ہے اُس نے رباعی کو نظم کا کومپیکٹ دے دیا ہے موضوعات کے اعتبار سے ایک نمائندہ انتخاب دیکھئے۔

عرفان آدم:

صورت کا مظاہر بھی ہے سیرت کا سوال
زنگارِ رُخِ حال بھی ہے صورتِ حال
ہر شخص کے چہرے پہ ہیں اتنے چہرے
ہر شخص سے مِلنے پہ بھی ملنا ہے محال

تو ہیں دل و دانش و ایمان ہیں آپ
تقلید کا فن عقل کا نقصان ہیں آپ
پوشش بھی ہے گر عظمت آدم کی دلیل
درزی کے بنائے ہوئے انسان ہیں آپ

مذہب کا تنفر وہ کلیجے کا ہے داغ
کر دیتا ہے مفلوج جو قوموں کا دماغ
ہر صبر ہو تعصب جنوں خیز تو پھر
بُجھ جاتا ہے انسان کی وحدت کا چراغ

جو لوگ سورج سے آنکھ ملانے کی سکت نہیں رکھتے ہیں انہیں اُجالوں کو مسلوں کرنے کا حق نہیں ہے کہ اس انداز میں عرفان و بصیرت کا قتل بھی ہوتا ہے اور قانونِ قدرت کی رسوائیاں بھی وجود میں آتی ہیں۔ شور صاحب قادر و قیوم سے اپنی نالشوں کا صلہ مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں اندھیرے کے صحراؤں میں نہ اُگایا جائے بلکہ وہ روشنیاں دی جائیں جو ہمیشہ زندگی کے درمیان بچھی رہیں اور ہوائیں اپنی جراتوں کے ساتھ بھی انہیں کبھی بجھا نہ سکیں شور صاحب نے آفاقی نقطۂ نظر کو فن اور انسانیت کے حوالے سے ہمیشہ دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس موضوع کے تجربے میں اُن کی تخلیقی خواہشوں کا بہت بڑا تحریری حصہ موجود ہے جسے ہم اُن کی نظموں

میں دیکھ بھی آئے ہیں۔ وہ تمام سرزمین کو خبث کا دست کدہ نہیں سمجھتے ہیں کہ انھیں انسانی شرف کا اعتبار ہے وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اخلاق و شرافت کو قبیلوں اور نسلوں میں بانٹا نہیں جاسکتا کہ تہذیب و تمدن علوم و فنون انسانیت اور جمالیات اعلیٰ شعور اور بہترین جذبے کسی قوم یا مذہب کی جاگیر نہیں ہوتے بلکہ زندہ قوموں کی پہچان ہوا کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ۔

آفاقیت :

ہے روشنی سینے میں ترے کم کم سہی
تجھ کو بھی ملے کاش نظر اک ہم سی
کھڑکی سے ترے گھر میں اُترتی ہے جو دھوپ
تو اس کو سمجھتا ہے نظام شمسی
آفاق کی وسعت پہ یہاں عقل ہے دنگ
خس کے بھی مضافات میں گم ہیں فرسنگ
لیکن تری نظروں میں خلا ہے نہ ملا
تو اپنے ہی آنگن میں اُڑاتا ہے پتنگ
گر وسعتِ آفاق سے انجان ہیں آپ
اور اپنے ہی ماحول کے انسان ہیں آپ
یا چہرۂ ادراک پہ ہیں کوڑھ کے داغ
یا دیدۂ احساس کے یرقان ہیں آپ

تہذیبِ نفس کو اور انسان کے ذاتی اخلاق کو شور صاحب قبیلوں اور نسلوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے بلکہ اُن کے لئے ظلم اور انسانیت اپنی فکر اور اپنے اعمال کی بنیادوں پر رد و قبول کے مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ شور صاحب کی رباعیات میں بھی علم و فن اور علم و فن کی تنقید کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ جاہل کو تنقید کی مسند پر بیٹھا ہوا نہیں دیکھ سکتے کہ اس طرح تو آن پر ابوجہل کی چھاپ لگ جانے کے اندیشے جنم لیتے ہیں۔

فن اور تنقید:

سُورج کا خلا رات کی ظلمت سے نہ پاٹ
عرفاں کا لہو جہلِ مرکب سے نہ چاٹ
تخلیق کو تخلیق کے ماحول میں دیکھ
ناخن پہ ہو تنقید تو انگشت نہ کاٹ
آنکھوں میں کتابوں کے حوالوں کا خمار
گفتار میں دانش کی سند کا پندار
کچھ عقل ہوئی جہلِ مرکب سے یتیم
کچھ فکر ہوئی فیضِ سند سے نادار
اے خودنگرِ وخیرہ سرِ خود نشناس
دل ہی نہیں سینے میں تو کیا ہے ترے پاس
تو شعر کی تنقید سے پہلے یہ سوچ
یہ تیرا ہے احساس کہ میرا احساس

شور صاحب کا تنقیدی اور تجزیاتی نقطۂ نظر ہم نے اُن کی شاعری میں بھی دیکھا ہے اور اُن کی نثر بھی ہم پڑھ آئے ہیں کہ علم اور فن کے سلسلے میں اس حد تک سنجیدہ ہیں کہ اُن کی آواز بلند آہنگیوں سے آگے تشدّد کی حدوں تک محسوس ہونے لگتی ہے جو اُن کے سچّے اضطراب اور اُن کی تخلیقی دیانت کی تمثیل ہے۔

جبرِ مشیت کے حوالے سے بھی چند رباعیات دیکھتے چلئے۔

جبرِ مشیّت:

بدلا ہے نہ بدلے گا یہ قدرت کا اصول
کھلنے سے نہ باز آئیں گے کھلتے ہوئے پھول
مسموم ہو سقراط کہ عیسیٰ مصلوب
ہر صبح کی تقدیر ہے سورج کا نزول

آواز میں ڈھل جاتے ہیں جب سناٹے
بھرتی ہے پسِ حبس ہوا فسّاٹے
فطرت کا یہ قانون ازل سے ہے اٹل
جو قوم ہوا بوئے بگولے کاٹے
کوشش سے نہ جب گردش افلاک ٹلے
حالات پہ انسان کا جب بس نہ چلے
جب دستِ قضا تاش کے پتّے بانٹے
کیوں ہارنے والا کفِ افسوس ملے

اور یہ ایک آخری رباعی بھی پڑھتے چلئے کہ

آدم کی ہو اولاد کہ جبریل نژاد
نیکی سے بھی ہو جاتا ہے انساں برباد
نیسوں کی ہلاکت سے ہوا راز یہ فاش
تکمیلِ مشیّت کو بھی لازم ہے فساد

شور صاحب نے کچھ نظمیں ایسی بھی لکھی ہیں جو دوسری زبانوں کی کہانیوں سے ماخوذ ہیں ایسی نظموں میں "شیر و خر" اور "کتیا اور ہاتھی" بڑی اہمیت رکھتی ہیں ایک ہی جنگل میں رہنے والے شیر اور گدھے میں گدھا خود کو شیر سے زیادہ قوت ور سمجھتا ہے اور شیر کو ہمیشہ اپنی لات سے ڈراتا ہے اور ایک دن گدھے صاحب شیر کو لات مار کر اپنی طاقت کی آزمائش کر لیتے ہیں اور شیر مر جاتا ہے اسی طرح ایک کتیا کسی ہاتھی کا مذاق اڑایا کرتی کہ چنگاری سورج کی نکتہ چیں تھی۔ عقلمندوں نے سوچا کہ ایسے انسانوں کی نسل بھی ہوتی ہے جو خود کچھ اہمیت نہیں رکھتے لیکن دوسرے اہم لوگوں پر طنز کرتے رہتے ہیں اور جب کتیا کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تو اس نے کہا کہ اگر میں ہاتھی کو شکست نہیں دے سکتی تو کیا ہوا میں اس پر بھونک تو سکتی ہوں۔ شور صاحب کی یہ دونوں نظمیں اور ایسی بعض دوسری نظمیں ان کے طنزیاتی اسلوب کو سماجی انسانی تضادات

کو اور ان کے تصادم کو بہت خوبصورتی سے اپنے اظہار میں لائی ہیں انھوں نے اپنی پسندیدہ شخصیات پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں غالب۔ برٹرینڈرسل۔ اقبال۔ شوپن ہار۔ والٹیر۔ جوش محمد علی جوہر۔ نیاز فتح پوری اور فراق گورکھپوری وغیرہ شامل ہیں یہ نظمیں اردو اور فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اپنی ایک شخصیاتی اور تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔

ہم نے یہاں تک ان کی پوری نمائندہ شاعری کا مطالعہ کرلیا ہے اور اب ہم اس صورتحال تک آ پہنچے ہیں کہ شور صاحب کی شاعری کے باطنی اور خارجی وجود کی اہمیتوں اور کمیتوں کو سمیٹ کر اپنے اظہار میں لائیں اس سے ہماری خواہش شور صاحب کی شاعری کو یا اپنی رائے کو دہرانا نہیں ہے بلکہ اُن کی شخصیت اور اُن کے فن کو ایسے ارتکاز کے ساتھ دیکھنے کی خواہش ہے جو ہمارے اس مطالعہ کا ماحاصل بن سکے پہلی اور سب سے اہم بات تو یہی ہے کہ شور صاحب کی شاعری کی اساس کسی سکولی یا کسی جامد اور خیالی تجربے پر نہیں ہے بلکہ اُن کی شاعری حرکی اور نامیاتی وجود کا استعارہ ہے جس کے معنوی عقب میں تاریخ انسانی کا وہ تغیر موجود ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد انسان کے اندر سیال آگ بن کر جسم و جاں کو جلا رہا ہے اور بہائے لئے جا رہا ہے ہمارے درمیان انسانی رشتے کٹ گئے ہیں اور فاصلے بڑھتے چلے جا رہے ہیں تمام زندہ تصورات اور تمام پائندہ صداقتیں بے معنویت کا غبار ہیں مادّی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی اقدار پاش پاش ہوگئی ہیں اور ہم ایک ایسے نظامِ خیال کی تلاش میں ہیں جو انسانوں کے لئے عدل سچائی محبت اور حسن کے گمشدہ خوابوں کو ہمارے درمیان اتار سکے ہمارا المیہ یہی ہے کہ ہم عبوری راستوں میں ہیں جہاں عمرانیات معاشیات اور سیاسیات کے ساتھ ساتھ صنعتی سائنسی اور تیکنیکی دائرہ زندگی کو کوئی نیا چہرہ دینا چاہتا ہے۔ ہم اپنے باطن کے انتشار اور خارج کے شعور کے بیچ شکستہ ہیں اس سلسلے کا سب سے اہم اور سب سے بنیادی عمل گمشدہ سماجی رشتوں کی بازیافت یا اُن کی تشکیل نو کا عمل ہے جس کے بغیر آسودہ اور مہذب زندگی کا کوئی منظرنامہ مرتب نہیں کیا جا سکتا اس سفر میں شور صاحب کی شاعری اور اُن کی فکر ہم سے کہتی ہے کہ قانون قدرت میں وحدتِ انسان کی تقسیم ایک جرم ہے اور تہذیب و شرافت نہ تو کسی ایک نسل کی جاگیر ہے اور نہ ہی کسی خاص طبقے کی میراث ہے انسانیت کی روح کو رنگ و نسل اور زمین و زبان کی زنجیروں میں

نہیں جکڑا جا سکتا کہ جغرافیائی حدیں کسی بے کنار کو قید نہیں کر سکتیں شور صاحب کا تشخص اُن کی سوچ کی کائناتی پہلو داری، تجربے کی دیانت اور اضطراب، زندگی کا تہذیبی شعور اور اظہار کے تخلیقی کمال اُن کی شاعری کی قدر و قیمت کو متعین کرتا ہے اور اسے اپنے عہد کی ایک تاریخی صداقت بنا دیتا ہے شور صاحب "سماجی شعور اور تاریخی تناظر کے شاعر ہیں"۔ اُن کے فلسفے کا گہرا مطالعہ اور حیاتِ انسانی میں خیر و شر کی کشمکش کا اظہار اہم تخلیقی آہنگ کے ساتھ ہوا ہے۔

شور صاحب نے جہل اور بے ہنری کے خلاف شدّت سے لکھا ہے کہ علم و فن کی ناقدریاں منفی اور سیاہ رجحانات کی پرورش کرتی ہیں اور شور صاحب خاموش تماشائی نہیں ہیں کہ انسانیت کے بڑے مقاصد بھی موجودہ دور میں انفرادی اور اجتماعی کوتاہیوں کا شکار ہو کر اپنی صورتیں بدل چکے ہیں شاعری ایک سماجی عمل ہے اور اس کے ذریعے افراد ایک دوسرے کے تجربوں میں شریک بھی ہوتے ہیں اور ایک نیا شعور بھی حاصل کرتے ہیں شاعری اپنی تخلیقی قوت اور اپنے تجرباتی عمل سے عام انسانوں کے ادراک کو بھی ایک تازہ وجود عطا کرتی ہے یہی شاعری اور زندگی کا رشتہ ہے اور یہی اس کے سماجی عمل ہونے کی معنویت بھی ہے اہم لکھنے والوں کے تجربے کی آفاقی دانش ہمیں پوشیدہ اور گمشدہ صداقتوں سے آگاہ کرتی ہے اور ہمیں انسانی منطقوں سے الگ ہونے نہیں دیتی جو لوگ شاعری کے بغیر زندہ رہنا چاہتے ہیں وہ بھی زندہ رہتے ہیں مگر ایسے لوگ ایک گہنہ بے در کے قیدی ہوتے ہیں اور وحشی حیوانی سطحوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے شاعری بھی کسی آدرش یا کسی نظریئے کو پیش کر سکتی ہے کسی بہتر سماجی نظام کی پابند بھی ہو سکتی ہے لیکن کسی پارٹی کے منشور کے ساتھ شاعری کو تخلیق کا آسمان نہیں مل سکتا کہ اُس میں نظریاتی عصبیت کا پیدا ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے مگر ہر اچھی اور اہم شاعری میں سماجی زندگی کا عکس ضرور پوشیدہ رہتا ہے۔ شور صاحب کی پوری شاعری سماجی اور تاریخی کرداروں اور حوالوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے وہ اُس عصر آگہی کو بھی جانتے ہیں جو شاعر کے حساس مزاج کو ایک ایسا نیا رنگ و آہنگ دیتی ہے جس کے بغیر کوئی بڑا لکھنے والا پیدا نہیں ہو سکتا کہ عصری آگہی ایک ایسی سچائی کو پیش کرتی ہے جو پہلے کبھی اس طرح وجود میں نہ آئی ہو۔

شور صاحب نے ہمیشہ تہذیب کلچر قومی تشخص محبت فن جمالیات آزادی علم، انسانیت، عدل

اور سچائی جیسے موضوعات کو اپنے پورے وجود کے ساتھ پسند کیا ہے اور یہی اُن کی شاعری کے مسلّمے رہے ہیں۔ شور صاحب کی پوری شاعری کو ہم دو بڑے رجحانات کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں ان کی شاعری کا پہلا رجحان تو وہی ہے جو انیس سو اڑتیس سے انیس سو اٹھاون تک آتا ہے کہ اس شاعری میں نرم گوئی خوش کلامی اور مشاعروں کی شہرت و مقبولیت بھی ہے اور ادب پڑھنے والوں کے درمیان اُن کی وہ اہمیّت بھی ہے جو نیاز فتح پوری اور "نگار" کا ایک معتبر حوالہ رکھتی ہے۔ ابتدائی بیس برسوں کی شاعری میں رومانیات اور جمالیات کے ساتھ ساتھ موجودہ شاعری کے مختلف رنگ مختلف آوازیں اور مختلف عکس بھی دکھائی دیتے ہیں کہ اپنے خیال و فکر میں اور اپنے اسلوب و اظہار میں ابتدا ہی سے ایک الگ راستہ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "نفسِ دوراں اور "دیوارِ ابد" بھی اس کی گواہی دیتی ہیں لیکن انیس سو اٹھاون سے انیس سو اٹھاسی تک تیس برس کے اس سفر میں شور صاحب کے یہاں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں انھوں نے ان تیس برسوں کے درمیان اہم تنقیدی مضامین لکھے نفسیاتی تحریروں کا سلسلہ "اندر کا آدمی" لکھا رباعیات لکھیں اپنی طویل نظم "میرے معبود" (۱۹۸۴) لکھی اور سادیسم "تناں" (۱۹۸۳) اور "صلیبِ انقلاب" (۱۹۸۵) کے حوالے سے اُس آفاقی و ارضی انسانی آدرش کو پیش کیا جو ہماری زندگی اور ہماری شعری روایات کا اہم حصّہ ہے۔

شور صاحب کے شخصی وجود کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی کے بہت سے متضاد و منفرد تجربوں سے گزرے ہیں انھوں نے اپنی جسمانی وجاہت و خوبصورتی اور اپنی شاعرانہ شہرت و مقبولیت کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جس میں ہزاروں افراد ان کو پسند کرنے والے موجود تھے پھر ایسا ہوا کہ وہ اپنی تنہائیوں کے اس جاں گداز لمحے تک آ گئے جہاں انھیں گفتگو کے لئے کسی ایک شخص کی تلاش کرنی پڑتی ہے اہم لوگوں کو لکھنے والی المیاتی مقدر کی تحریر نے شور صاحب کو بھی لکھا ہے کہ وہ اپنی مجموعیت سے اپنی نرگسیت تک کا سفر کر چکے ہیں شور صاحب اپنے تشخص کا گہرا احساس رکھتے ہیں انہیں زندگی اور علم و فن کی ناشناسیوں اور ناقدریوں نے ناآسودہ رکھا ہے مگر "دیدۂ بینا" ان کی سچّی انا کو شکست خوردہ ہونے سے بچا لیا ہے کہ پڑھنے لکھنے کے درمیان وہ تھکن زدہ اور عمر رسیدہ نہیں ہوئے ہیں۔ شور صاحب میں [illegible] کی خواہشوں کے سلسلے طویل ہیں وہ اپنے بدن کی مٹی

کو بکھرتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اپنے تخلیقی وجود کے پائیدہ ہونے کا امکان پیدا کرتے رہتے ہیں مصر اور یونان کی تہذیبوں سے ان کی گہری دلچسپی کا سبب بھی یہی ہے کہ شور صاحب علم و فن کے اہرام میں اس لئے دفن ہونا چاہتے ہیں کہ ان میں پلٹ کر آنے اور ابدیت کو دیکھنے کی شدید خواہش موجود ہے ایسی خواہش تو ہم سب بھی کرتے ہیں اور اس کے لئے اپنی اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو آزماتے بھی ہیں لیکن سورج سیاہ دیواروں کے عقب میں گر جاتا ہے اور روشنیوں کے ادھورے پودے رات کا رزق بن جاتے ہیں جو پودے روشن درخت بننے کی سکت رکھتے ہیں وہی زندہ صبحوں کی گواہی دیتے ہیں اور شور صاحب ایسی گواہی کے لئے اپنے افق تک آ پہنچے ہیں۔

شور صاحب کی نظمیں اور ان کے موضوعات تو ہمارے سامنے کھلے ہوئے ہیں مگر ان شعری اسالیب کی انفرادیت کو ہمیں دیکھنا ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ایک خاص مدت تک شور صاحب کا اسلوب اور ان کی شعری زبان رومانی اور جذباتی رہی ہے یہ دور اُن کی محبوبیت اور اُن کی مقبولیت کا دور ہے لیکن دوسرے دور میں وہ زندگی کے سنجیدہ گہرے اور بہت اہم مسائل سے دوچار ہوئے ہیں اس دور میں ان کی محبوبیت اور مقبولیت کم ہوئی لیکن یہی وہ زمانہ ہے جس نے شور صاحب کو ان کی بنیادی شناخت سے ہمکنار کیا ہے۔ شور صاحب کے یہاں زبان و بیان کی وہ مہارتیں نظر آتی ہیں جو اساتذہ کی اسناد سے کم نہیں ہیں وہ لسانیات کے عالم ہیں اور کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان گنت مرکب لفظوں کو تشکیل دیا ہے اور بہت سی لفظیات کو نئے معنی پہنائے ہیں انھوں نے اپنی نظموں کے لئے زیادہ تر مثنوی کی ہیئت کا انتخاب کیا ہے لیکن بحریں غزل کی ہی استعمال کی ہیں اقبال اور جوش کے بعد مثنوی کو کامیابیوں کے ساتھ شور صاحب نے ہی استعمال کیا ہے شور صاحب کی بہت سی نظمیں مکالماتی بھی ہیں جن میں فطرت کو یا انسانی رویوں کو کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اُن کے مکالماتی اسلوب میں ہمیں ایک رزمیہ ڈراما دکھائی دیتا ہے کرداروں کی نوعیت استعاراتی اور تمثیلی ہے اور اُن کے حوالے سے سماجی یا عالمی تغیرات کو اور انسانوں کے درمیان خیر و شر کے تصادم کو لکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اتنی وسعت اور اتنی قوت کے ساتھ شاعری میں کرداروں کو لکھنا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ شور صاحب کی شعریات پر ایک نظر کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری اور اُن کی فکر کے تناظر میں انسان کے

تہذیبی تجربوں کا ایک بہت وسیع لاشعور موجود ہے ایسے چند لفظوں کو دیکھتے چلیے۔

کلیسا، دیر و حرم، ہیکل، اہرام اور تاج محل تہذیب و تمدن، استبداد اور ظلم شہنشاہیت، غلامی اور آزادی، جمہوریت اور جمہور دریائے نیل، یونان، مصر، روم، بابل و نینوا اور عجم۔ جبر مشیت، فرشتے اور خدا، معبود، رسول، خورشید، آفتاب، مہتاب، چراغ، داغ، صرصر، طوفان، مریخ، زہرہ، دجلہ، نہر سوئیز، سقراط، افلاطون، نغمات، مطرب، بربط و چنگ، فرعون، شداد، سیاہی، ظلمات، اندھیرا، خون آدم، ابلیس، چنگیز، زنگی، صابون، چہرہ حسین عیسیٰ، صلیب، حسن بن صباح، یزید، نمرود و شداد، گوتم، قندیل، زہر کا پیالہ، شمع رسالت شرار بولہبی وغیرہ ایسے لفظ ہیں جن میں کچھ لفظ اقبال اور جوش کے علاوہ اور کہیں مشکل ہی سے نظر آئیں گے ان شعریات کے تناظر میں شور صاحب کی فکری و تخلیقی انفرادیت کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے وہ تہذیبی اور صنمیاتی حوالوں سے اپنے کو گزشتہ تاریخ سے جوڑنے کی خواہش رکھتے ہیں کہ مذکورہ لفظ انسانی تاریخ کے کردار بھی ہیں جو شور صاحب کی شاعری میں خیر و شر کے استعارے بن کر شعری لفظیات میں اضافوں کا سبب ہیں۔

نیاز فتح پوری نے شور صاحب کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے انھیں پسند بھی کیا ہے اور "نگار" کے حوالے سے اُن کو ادبی شہرت و اہمیت کے قریب بھی پہنچایا ہے ہم اُن کی ایک مختصر رائے دہرانا چاہتے ہیں کہ اس حوالے سے گفتگو اور آگے بڑھ سکتی ہے نیاز صاحب لکھتے ہیں کہ

> "بارہا جی چاہا کہ آپ کی ترقی فکر پر آپ کو مبارکباد دوں لیکن موقع نہ ملا میں نے آپ کی ذہنی ترقی کی رفتار کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور میں اب یہ کہنے کے قابل ہوا ہوں کہ آپ جس منزل سے گزر رہے ہیں وہ آپ کے لئے بڑے درخشاں مستقبل کی خبر دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک مشورہ بھی عرض ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ اپنی ہر نظم کو کم از کم دو چار مرتبہ معاندانہ نگاہ سے ضرور دیکھ لیا کریں اور جہاں تک ممکن ہو بیان میں کوئی جھول نہ رہنے دیں"۔

نیاز صاحب نے جس مشکل کی طرف اشارہ کیا تھا اسے ہم اور بڑی جسامت کے ساتھ شور صاحب کی نظموں کے درمیان دیکھتے ہیں جوش کے علاوہ اور بھی کئی شاعر ایسے ہیں جن کی نظموں پر یہی اعتراض موجود ہے کہ مصرعے

بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن نظم کا موضوع یا نظم آگے نہیں بڑھتی۔ شور صاحب کی اکثر نظمیں اسی طولانی بیان کا شکار ہوتی ہیں فن اظہار میں جزئیات نگاری کو اور تفصیلی بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن جزئیات اور تفصیل کی ضرورتوں کا اپنا اپنا افق ہوا کرتا ہے مثال کے طور پر شور صاحب نے اپنے بیٹے "علمدار" کے نام جو نظم لکھی ہے اُس نظم میں کچھ ضروری باتیں سمجھانے کے بعد نسلِ آدم سے لے کر "ہندو و فرنگ و شام و حبش" کے دیار تک اور "چنگیز و ہلاکو" تک اور نسل و نسب" کے جنون میں آدمیت کی رگ رگ سے خون پینے تک اور درویش و دہقان و مزدور کو اور اہرمن اور ابولہب کو نبیوں کے نسب سے جا ملانے تک کا اظہار کر دیا جائے تو ایسا رویہ مشکل ہی سے پسندیدہ ہو سکے گا۔ شور صاحب کے یہاں اس طرح کی چند نظمیں اور بھی ہیں جو مطالعے کے درمیان ہمیں روک کر ہم سے کہتی ہیں کہ شور صاحب کی شاعری میں یہی وہ فنی کم قوتی ہے جس نے نظموں کی اثر پذیری کو اور موضوع کے تسلسل کو کھانچوں میں بانٹ دیا ہے اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ان کی بعض نظموں کے خلاف جاتی ہے کہ شور صاحب اپنے مختلف موضوعات کے اظہار میں ایک ہی طرح کے استعاروں کو اور اپنے تحریر کردہ مرکبات کو یکساں تلازمات کے ساتھ اور ایک ہی جیسی معنویت کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں جس کی بنا پر اُن کی بعض نئی نظموں کو پڑھ کر بھی ایسا احساس ہوتا ہے کہ ان منظروں کو اور ان چہروں کو ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں اور نئی آواز بھی آوازِ بازگشت بن جاتی ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا ہے کہ شور صاحب فارسی کے اسکالر ہیں اور اس حوالے سے انھوں نے فارسی کی شعری و ادبی روایات کو اخذ بھی کیا ہے اور فارسی میں اتنا کچھ لکھا بھی ہے کہ وہ کئی سو صفحات کا ایک شعری مجموعہ مرتب کر چکے ہیں فارسی سے استفادہ کرنا لکھنے پڑھنے والوں کے لئے آج بھی بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن فارسی سے دوری کے سبب ہمارا عہد اپنے اظہار و اسلوب میں کم قوتی کا شکار ہو رہا ہے کہ ہماری بڑی اردو شاعری کی اساس فارسی پر ہی ہے مگر ہمارے جدید شاعر سمجھتے ہیں کہ اردو شاعری پر فارسی کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا کہ ہمارے موجودہ قاری کی سائیکی اور داخلی حساسیت بھاشا سے زیادہ مانوس اور قریب ہے شور صاحب کی شاعری میں فارسیت کا سایہ گہرا ہے جس کا دباؤ قاری کو گراں محسوس ہوتا ہے لیکن زندگی اور شاعری صرف اس لئے اہم نہیں ہو جاتی کہ اس کے

درمیان کوئی ناہمواری نہ ہو بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل میں اور اپنے اظہار میں کتنی سچائی کتنی توانائی اور کتنا تسلسل رکھتی ہے شور صاحب کی شاعری کو دیکھیں تو ان کے کامیاب طویل سفر کا احساس ہوتا ہے جس کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے غزل کو کھڑکی میں اس لئے پھینکا تھا کہ کوئی لڑکی پڑھ لے اور آج وہ اپنے خیال و فکر میں اور اپنے تخلیقی تجربے میں ان بلندیوں تک آپہنچے ہیں جہاں سے وہ کہہ رہے ہیں کہ

آفاق پسِ پشت و سماوات بدام
کہتا ہے خلاؤں میں یہ انساں کا خرام
امکان کی دیوار پہ چڑھتے چڑھتے
گر جاؤں تو اے قادرِ مطلق مجھے تھام

شور صاحب کی شاعری کا یہ سفر شمالی سفر لگتا ہے ان کے تخلیقی انسلاکات میں نئی نسل کے لئے تازہ اثباتی روایات اور تہذیبی عہد کی زندہ تجربات آنکھیں روشن ہیں اپنے لوگوں میں اعلیٰ سماجی اقدار کا شعور پیدا کرنا اور عالمی انسان کی وحدت کا ادراک رکھنا شور صاحب کے شدید اضطراب کا بنیادی مسئلہ رہا ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ماضی سے موجودہ لمحے تک روشنیوں اور اندھیروں کے تصادم میں لے آتے ہیں اور پھر آئندہ سفر کے لئے وہ جھوٹے خواب نہیں دیکھتے بلکہ سچے اور تلخ مسائل کو سامنے رکھتے ہیں کہ لوگ خود اپنی گواہیاں تلاش کریں اور زندگی کے ایک بہتر سفر کا آغاز ہو سکے۔

جہاں غبار نہیں ہے

جس زمین پر حسن کی علامت تاج محل کو تراشا گیا اور جس کی مٹی نے میرؔ، نظیرؔ اور غالبؔ کو تخلیق کیا اُس کے تہذیبی شجرۂ نسب میں آخری نام صبا اکبر آبادی کا لکھا ہوا ہے صبا صاحب کی بی سترؔ برسوں سے پڑھنے لکھنے کا کام کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنی عمر کو رہا نسبت فن میں یوں اُتارا ہے کہ صبا صاحب کی بنیادی شخصیت تو شاعری کے حوالے سے بنی ہے لیکن اکبر آباد کے حوالے سے میرؔ، نظیرؔ اور غالبؔ سے لے کر سیماب اکبر آبادی تک زبان و بیان کو جو اہمیت حاصل ہے اسے انہوں نے اثباتی زندگی کے اظہار میں پوری سچائی کے ساتھ اور مکمل لسانی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے صبا صاحب نے نثر بھی لکھی ہے ملّی قومی اور موضوعاتی نظمیں بھی لکھی ہیں اُن کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد دس ہے اور زیر ترتیب کتابوں کی تعداد بھی اتنی ہی ہے ان کے اہم ترین کاموں میں ترجمہ، مرثیہ اور غزل ایک تخلیقی مثلث کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ فارسی سے اردو میں ترجمے کی روایت پرانی ہے اور صبا صاحب کے ترجمے اس روایت کا اثبات کرتے ہیں۔ عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ اُردو میں پہلے بھی ہو چکا ہے لیکن صبا صاحب کے ترجموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے انہوں نے عمر خیام کی کوئی بارہ سو رباعیات کو اردو میں لکھا ہے جس کا ایک مختصر انتخاب "دست زر فشاں" کے نام سے شائع کیا جا چکا ہے انھوں نے عمر خیام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کو بھی دُور کیا ہے ان کا

مطالعہ ہے کہ

"اپنے زمانے میں عمر خیام کا مرتبہ بوعلی سینا کے بعد سمجھا جاتا تھا لیکن اُس نے کچھ اور علوم میں بھی کمال حاصل کیا قرأتِ قرآن پاک اور احادیث کی روایت میں بھی اُس کا بڑا مقام تھا وہ تاریخ اور السنہ کا بھی ماہر تھا نجوم اور فلکیات کے علاوہ میکانکی اختراعات اور سکّے کی مختلف اشکال بنانے میں بھی وہ یدِ طولیٰ رکھتا تھا وہ اپنے متعدد کمالاتِ علمی، راسخ مذہبی عقیدے اور علمِ طب میں مہارت کی وجہ سے ملک شاہ کا ندیم خاص اور خاندانی معالج بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔"

"خیام نے اپنی رباعیوں میں جو اندازِ فکر اختیار کیا ہے اُس کا پہلا اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کو زندگی کی نعمت صرف ایک دفعہ عطا ہوتی ہے وہ روحانی بقا کا علمبردار ہوتا ہے اور جبر و اختیار کے مسئلے میں الجھا ہوا نظر آتا ہے وہ انسانی اعمال کو غیر اختیاری سمجھتا ہے اور جبریہ فلسفے کا قائل ہے عمر خیام ایک پکّا موحّد اور ایک سچّا مومن ہے لیکن وہ مبلّغ بن کر دنیا والوں کے سامنے نہیں آتا بلکہ ایک رند بلانوش کی مانند خود کو پیش کرتا ہے تاکہ لوگ رندی اور مئے نوشی کے اثرات بد کو ایک آدمی کی صورت میں دیکھ سکیں یوں وہ منفی سے مثبت پہلو کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے وہ آزادیٔ انسان کا حامی ہے انسان پر انسان کی بالادستی کا قائل نہیں اس کی شعری اصطلاحیں بعید از قیاس نہیں میں وہ کمہار کے چاک اور کوزہ گر سے اپنے شعری اجزا حاصل کرتا ہے۔ اجرامِ سماوی کو انسان سے زیادہ مجبور جانتا ہے رموز کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ ایک ایسا معلم ہے جو تلخیٔ علم کو شراب کے گھونٹ سمجھ کر پیتا ہے اور اُس کے میکدے میں ایک خانقاہ آباد ہے۔"

صبا صاحب کا یہ تفصیلی بیان اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ وہ سچائیوں کی تلاش میں نکلتے ہیں اور شبہات کے غبار کو کاٹ دینا چاہتے ہیں۔ عمر خیام کی رباعیات کے چند ترجمے دیکھئے۔

گل کہتا ہے دستِ زرفشاں رکھتا ہوں
خود ہنستا ہوں سب کو شادماں رکھتا ہوں
جو کچھ ہے مرے پاس عیاں ہے سب پر
سرمایہ چھپا کے میں کہاں رکھتا ہوں

گردوں میں مری عمر سے فرسودہ ہے
دریا مری چشمِ نم سے آلودہ ہے
دوزخ ہے مرے رنج کی اک چنگاری
جنت مرا اِک لمحۂ آسودہ ہے
جب اُس نے مجھے خاک سے تخلیق کیا
سب جانتا تھا کہ میں کروں گا کیا کیا
ہے حکم سے اُس کے میری نیکی و بدی
پھر مجھ کو جہنم میں جلانا کیسا؟

ان ترجموں کے بارے میں الیاس عشقی نے کہا ہے کہ

"بقول والیٹر ترجمہ ایک عورت کی مانند ہے کہ اگر وہ خوبصورت ہو تو وفادار نہیں ہوتی اور اگر وفادار ہوتی ہے تو خوبصورت نہیں ہوتی کیا تعجب ہے کہ صبا صاحب کے ترجموں کے مطالعہ کے بعد قارئین یہ محسوس کریں کہ زیرِ نظر ترجمے کے متعلق یہ بات بہت زیادہ درست نہیں ہے کیفیت یہ ہے کہ ترجمے کا بڑا حصہ اصل سے وفادار بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ضروری سمجھا ہے ترجمے میں آزادی سے کام لیا ہے جو مترجم کا حق ہے۔"

صبا صاحب کے ترجمے کی دوسری کتاب "ہم کلام" ہے جس میں غالب کی رباعیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے اس ترجمے کی اساس بھی غالب سے صبا صاحب کی ہم کناری ہے وہ غالب سے اس حد تک متاثر ہیں کہ غالب کے پورے دیوان کی تضمین کر ڈالی ہے صبا صاحب کے اس ترجمے کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ہم یہاں غالب کی فکر اور اس کے اسلوب کو اُس کی فارسی شاعری کے حوالے سے دیکھتے ہیں پہلے چند ترجمے پیش کرتا ہوں۔

غالب آزاد ہوں موحّد ہوں میں
ہاں پاک دِلی کا عینی شاہد ہوں میں
کہتے ہیں کہ سب کہہ گئے پچھلے شعراؔ
اب طرزِ سخن کا اپنی موجد ہوں میں

سینے میں غم و زخم نہاں رکھتا ہوں
میں دیدہ و دل کو خوں فشاں رکھتا ہوں
یہ مشتِ غبار کیسے مجھ سا ہو جائے
تو جانتا ہے میں جسم و جاں رکھتا ہوں
ہاتھوں کو ہے ایک کلیدِ مخزن درکار
جب یہ بھی نہ ہو تو پھر ہے دامن درکار
جب کوئی کسی کے کام نہیں آ سکتا
پھر دوست ہے درکار نہ دشمن درکار

ان رباعیات میں غالب کی فکری سطح کو زیادہ پھیلتے ہوئے اور کسی آخری نتیجے پر پہنچتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے" ہم کلام" کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ غالب کی فارسی شاعری اُردو سے زیادہ گہرائی اور وسعت کی امین ہے جس پر غالب خود فخر کیا کرتے تھے مجنوں گورکھپوری ہم کلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ

غالب کی ان رباعیات کا ترجمہ پڑھیں تو ان رباعیات کی پہلی خوبی یہی نظر آئے گی کہ یہ اس مزاج کو سمجھ کے لکھی گئی ہیں جو خود غالب کا مزاج تھا اور صبا صاحب کے مزاج کی ہم آہنگی کا تجزیہ کیجئے تو ان دونوں کی مشترکہ اقدار میں بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اجتہاد کی قوت الگ ہے اور زبان و زبان دبیان کی قدرت الگ ہے اس لئے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر غالب بھی اپنی فارسی رباعیات کا ترجمہ کرتے تو اسی طرح کرتے جس طرح صبا نے کیا ہے"

خوبصورت اور بامعنی ترجمہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا ہے جب تک تخلیق کار اور ترجمہ نگار کے درمیان فکری محسوساتی اور تجرباتی سطحیں ایک نہ ہو جائیں عمر خیام کی رباعیاں ہوں کہ غالب کی رُباعیاں جب ہم صبا صاحب کے ترجموں کو پڑھتے ہیں تو ہمیں وہ تخلیقی نوعیت کی شاعری محسوس ہوتی ہے جہاں زبان و بیان اظہار اور تجربہ یا خیال سب مل کر ایک تخلیقی وحدت

اختیار کر گئے ہیں صبا صاحب کے دونوں ترجمے ہمارے لئے بھی اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی خصوصی مطالعے کا درجہ رکھتے ہیں۔

صبا صاحب کی دوسری اہم شعری جہت مرثیہ نگاری ہے جو غزل کی طرح اپنی ایک ثقافتی اور تہذیبی روایت رکھتی ہے۔ بیسویں صدی میں جدید مرثیہ لکھنے والوں میں جوش ملیح آبادی، آل رضا، جمیل مظہری، نسیم امروہوی اور صبا اکبر آبادی کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں

صبا صاحب کا پہلا مرثیہ ۱۹۴۵ء میں آگرے سے شائع ہوا اس کے بعد سے وہ مسلسل لکھتے رہے ہیں اور اب تک کوئی ڈیڑھ سو سے زیادہ مرثیے لکھ چکے ہیں نعتیں سلام اور نوحے الگ ہیں۔ گذشتہ برسوں میں اُن کے مرثیوں کی تین کتابیں "سر بکف" "شہادت" اور "خونناب" شائع ہو کر ہمارے سامنے آئی ہیں ان کتابوں کے بارے میں اور صبا صاحب کی مرثیہ نگاری کے بارے میں بہت سے اہم لوگ گفتگو کر چکے ہیں لیکن آپ صبا صاحب کی وہ تحریر بھی پڑھ لیں جس میں انہوں نے مرثیہ لکھنے کی ضرورت کو لکھا ہے۔

"مرثیہ واقعات کربلا کے بیان کا نام ہے اور کربلا کوئی جامد اور وقتی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تحریک ہے جو مسلسل سفر کر رہی ہے واقعاتِ کربلا کا روحانی و معنوی ربط آج کے انسان سے اس کی زندگی سے اور اس کے امکان سے کیا ہو سکتا ہے اور انسانی تجربے کی وہ کون سی شکل ہے جسے ہم کارگاہِ حیات میں کربلا کے استعارے سے بیان کر سکتے ہیں میں نے مرثیے ایک خاص حوالے سے لکھنا شروع کئے کربلا آج بھی ایک مسلسل عمل کا نام ہے جو ہماری زندگی، تہذیب اور شاعری کے لئے مستقل طور پر ایک نیا امکان کھلا رہتا ہے مجھے حسینؑ اور ان کے رفقا میں عزم و استقامت کے نمونے نظر آتے ہیں میں خاندان نبوت کی خواتین میں صبر و استقامت کی تصویر دیکھتا ہوں یہی میرا سرمایۂ مرثیہ نگاری ہے جس میں ناحق کے خلاف سر بکف ہو جانے کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے میں چونکہ آلِ رسولؐ کا مرثیہ لکھتا ہوں اور آل کا شرف ذاتِ رسولؐ کو سمجھتا ہوں لہٰذا میرے مرثیے نعتِ محمدؐ مصطفےٰ سے مملو ہوتے ہیں۔"

صبا صاحب نے محمدؐ کو اماموں کا امام اور رسولوں کا رسول کہا ہے وہ انہیں باغ تقدیس کا مہکتا ہوا شاداب پھول لکھتے ہیں کہ جس نے قدرت کے احکامات کو تازہ کر دیا اور جس پر شعاعوں کی طرح آیات مصحف کا نزول ہوتا رہا ہے کہ رسولؐ اکرم کی زندگی تہذیب اور امن کا انتساب ہے وہ زندہ تازہ اور بولتا ہوا عملی قرآن ہیں جن کی مثال اس کرۂ زمین پر نہیں ہے اور جن کی یکتائی کی شہادت خود انسانی تاریخ پیش کر چکی ہے صبا صاحب ایک نعتیہ بند میں لکھتے ہیں کہ

جہل میں صدیوں سے تھی ارضِ عرب بھی مبتلا
ختم ہوتا ہی نہ تھا جوشِ جنوں کا سلسلہ
اس بیاباں میں گلِ وحدانیت آخر کھلا
لفظ واحد جس سے پہلی بار دنیا کو ملا
منکروں کے لب سِلے یارا نہ تھا تردید کا
پتھروں میں بو دیا اُس نے شجر توحید کا

مذکورہ تین کتابوں میں جو مرثیے اپنی متعین روح کے ساتھ صبا صاحب کے ذاتی تجربوں کو اور اُن کے عہد کے مسائل کو اپنے چہروں میں سمیٹتے ہیں اُن میں "وقت" "وحدانیت" "شباب" "انقلاب" "کشمکش" "لفظ" "ہجرت" اور "خاک" بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وقت کے حوالے سے صبا صاحب نے تاریخی بصیرتوں کی بہت سی باتیں کی ہیں اور کہا ہے کہ وقت چھوٹے اور کمزور لوگوں کو ہی اپنا شکار بنا سکتا ہے لیکن بڑے اور اہم لوگ خود وقت کو قید کر لیتے ہیں کہ آدم نوح موسیٰ اور عیسیٰ موجود نہیں ہیں مگر ان کی تمثیلیں انسانی اجتماعی لاشعور کو روشنی دیتی رہتی ہیں اور جس ہستی نے وقت کو مکمل طور پر اپنا غلام بنا لیا ہے وہ رسول اکرمؐ کی ذات گرامی ہے "وقت" کے دو بند دیکھئے۔

رستہ ہے وقت فصل ہے وقت اور سفر ہے وقت
منزل ہے وقت راہزن و راہبر ہے وقت
گلشن ہے وقت نخل ہے وقت اور ثمر ہے وقت
منظر ہے وقت جلوہ ہے وقت اور نظر ہے وقت

طوفانِ وقت کا ہے کنارا ہے وقت کا
کشتی ہے کائنات کی دھارا ہے وقت

"وقت" ہی کا یہ بند امام حسینؓ اور ان کے شہیدوں کے بارے میں کس کرب کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ

زخموں سے چور چور ہیں کچھ نور کے بدن
ایسے بدن کہ جن پہ تقدس گل و ثمن
کچھ طفل کچھ جوان ہیں کچھ پیر خستہ تن
جیسے جمی ہوئی ہو شہیدوں کی انجمن
اس انجمن میں ایک جسد مثل بدر ہے
معلوم ہو رہا ہے شہیدوں کا صدر ہے

کرار حسین کا کہنا ہے کہ۔

"صبا اکبر آبادی کے مرثیوں کی اساس بھی عظمت حسین پر ہے اُن کی شاعری میں فکر اور جذبے کا ایک ایسا امتزاج ہے جو انہیں جدید مرثیہ گو شاعروں میں سب سے الگ بلند مقام عطا کرتا ہے ایک عرصے سے یہ بحث جاری ہے کہ میر انیس کے بعد مرثیے میں کوئی وسعت ہوئی ہے یا نہیں کسی ادبی صنف میں وسعت نئے مضامین سے نہیں بلکہ زندگی کے کسی نئے پہلو کو روشن کرنے سے ہوتی ہے اور یوں دیکھا جائے تو صبا صاحب کے مرثیے میں نئے رخ اور نئے حوصلے شامل کئے گئے ہیں مرثیہ کا جتنا خوبصورت چہرہ صبا صاحب لکھتے ہیں وہ کم ہی لوگوں کے حصے میں آیا ہوگا یقیناً صبا اکبر آبادی کی آواز جدید مرثیہ گو شاعروں میں اپنے عہد کی سب سے توانا اور معتبر آواز ہے۔"

کرار صاحب کی اس رائے کے ساتھ چند بند مختلف مرثیوں کے مختلف مقامات سے پیش کئے جاتے ہیں۔

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں کہاں کے ہیں کہاں ہیں
سو نام و نشاں رکھ کے بھی بے نام و نشاں ہیں

ہم برگِ خزاں دیدہ ہیں یا ریگِ رواں ہیں
اک گمشدہ تہذیب کے اب مرثیہ خواں ہیں

اس بے خبری پر کوئی مغموم نہیں ہے
ہم کیا تھے نئی نسل کو معلوم نہیں ہے

گھر بار کو چھوڑا در و دیوار کو چھوڑا
صدیوں کے بنائے ہوئے آثار کو چھوڑا
جو پیار تھا اُس شہر سے اُس پیار کو چھوڑا
پتھر کیا دل کو چشمۂ دلدار کو چھوڑا

اصنامِ دلارام کے محور سے نکل آئے
قرآن حمائل کیا اور گھر سے نکل آئے

(ہجرت)

یہ دو بند "ہجرت" سے لئے گئے ہیں اس مرثیے میں صبا صاحب کا ذاتی تجربہ شدت سے اُتر گیا ہے شاید ایسے ہی حوالوں سے سلیم احمد نے لکھا تھا کہ

"غالباً جوش کے بعد آنے والوں میں یہ پہلے شاعر ہیں کہ جنھوں نے نئے مرثیہ کو بنیاد بنا کر مرثیے لکھے ہیں اور ان میں اپنے تجربوں کی روح بھر دی ہے۔ صبا اکبر آبادی صاحب انسانی قدروں کے زوال کے ماتم میں اپنے تخیل اور اپنے فن کا بھرپور اظہار کرتے ہیں بلکہ ایک ملال انگیز کسک ہے جو مرثیوں کی روح کو متعین کرتی دکھائی دیتی ہے ہم ان مرثیوں میں امام حسینؓ کی شخصیت کے پسِ منظر میں خود صبا صاحب کی شخصیت کو دیکھتے ہیں جن کے اندر اپنے اقدار کی پاسداری اور ان کی شکست و ریخت کا غم ایک دوسرے سے پیوست ہے۔"

زمین اور مٹی سے انسان کا تعلق ایک ابدی تعلق ہے کہ اس تعلق میں کسی چھوٹے جذبے یا کسی اندھے عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے انسان بھی خاک ہے اور خاک سے خاک کا رشتہ اپنی اپنی صداقتوں اور اپنی اپنی حیثیتوں کے مطابق بنتا اور بگڑتا رہتا ہے۔ صبا صاحب کا

مرثیہ "خاک" اپنی تخلیقی اور معنوی حوالوں سے بڑی اہمیت کا حامل ہے یہ مرثیہ ایک ایسی میزان کی طرح ہے جس میں آدمی کا عمل اور اس کا بدل دونوں ہی برابر نظر آتے ہیں یہ مرثیہ فطرت کے عدل کو اور تاریخ کی سچائی کو اظہار میں لاتا ہے۔

مٹی کا آج تک نہیں بدلا کوئی اصول
اپنی حدوں پہ سطح و بلندی وارض و طول
بے لطف سادگی ہے نہ آرائشِ فضول
اس کے لباس میں کہیں سبزہ کہیں ہے پھول
دامن میں گل ہیں لعل و جواہر ہیں سنگ ہیں
مٹی کا ایک رنگ نہیں لاکھ رنگ ہیں

زمین ہمارے اعمال اور ہماری فکر کی ایک ایسی امتحان گاہ بھی ہے جہاں ہماری حقیقت کے برابر ہمیں جواب ملتا رہتا ہے صبا صاحب نے اِن مرثیوں میں سوچنے اور پڑھنے کی بہت سی راہگذاریں پیدا کی ہیں ان کے ایک اور مرثیے کا ذکر بھی ضروری ہے پہلے اس مرثیے کے دو بند پڑھ لیجئے۔

لفظ کیا ہے فکرِ انسانی کا ایک سادہ لباس
باوجودِ سادگی ہیں رنگ جن کے بے قیاس
لفظ بنیادِ تخیّل لفظ خطبوں کی اساس
لفظ اظہارِ تکبر لفظ اندازِ سپاس
لفظ پتھر بھی ہے موتی بھی شجر بھی پھول بھی
لفظ ہی مردود بھی ہے لفظ ہی مقبول بھی

لفظ تھے اپنے کھلونے لفظ اپنے مشغلے
زندگی لفظوں میں گزری ان کے سائے میں پلے
ہر قدم پر سامنے الفاظ کے تھے مرحلے
لفظ ہر جانب ہمیں انگلی پکڑ کر لے چلے

گرد شیں کرتی رہی لفظوں پہ ساری زندگی
ہم نے لفظوں کے مکانوں میں گزاری زندگی

صبا صاحب نے جس تخلیقی قوت اور جس لسانی تکنیکی قدرت اور مہارت کے ساتھ اپنی داخلی اور خارجی تجربوں کو ملا کر یہ مرثیے لکھے ہیں وہ اس طرح زندہ ہیں جس طرح ہماری زبان اور ہمارا عہد ہم میں زندہ ہے۔ کرار صاحب نے ان مرثیوں کے چہروں کی جو تعریف کی تھی اس کی تصدیق جگہ جگہ ہوتی ہے ان چہروں کی اثر پزیری کی بنیاد ایک طرف صبا صاحب کی تخلیقی قوت ہے تو دوسری طرف وہ لمحہ موجود ہے جو ہم سب سے جڑا ہوا ہے وہ لفظ جو ہماری زندگی کو لکھتے ہیں ان لفظوں کے بارے میں وزیر آغا کا کہنا ہے کہ

"لفظ کی یہ خوبی ہے کہ جب اسے صیقل کیا جائے تو یہ ستارہ بھی بن جاتا ہے اور استعارہ بھی مگر ستارے کو دیکھنے کے لئے بینائی اور استعارے کے مفہوم کو جاننے کیلئے آگہی کی ضرورت ہوتی ہے صبا اکبر آبادی کو اردو شاعری میں جو مقام اعتبار حاصل ہے ہم سب اس کے معترف ہیں۔ انہوں نے لفظ کے حوالے سے واقعۂ کربلا کی ایک بالکل نئی تفسیر پیش کر دی ہے اُن کے اِس مرثیے سے امام حسینؓ کے مرثیوں کے باب میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے"

سلیم احمد کو اس بات میں بہت شک تھا کہ مرثیہ دوبارہ زندہ ہو سکے گا یا نہیں اُن کے شک کی اساس کتنی ہی مضبوط سہی لیکن ہمارے موجودہ لکھنے والوں میں اُمید فاضلی، سردار نقوی سیف زلفی، جلیل حشمی، عبدالرؤف عروج اور ہلال نقوی جیسے مرثیہ نگاروں نے جس طرح مرثیے کا رشتہ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی معاملات سے جوڑا ہے اور مرثیے کو ایک نئی معنویت دی ہے اس حوالے سے ہم نئے مرثیہ نگاروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مرثیہ کی روح کو باقی رکھتے ہوئے موجودہ عہد کے رجعت و جمود کو اور فرسودگی کے حصار کو توڑ کر مرثیے کو ایک ایسی آواز میں تبدیل کر دیں گے جو زندگی کے خوف سے ہمیں نکال سکے گی عبدالرؤف عروج کے بعض مرثیے اس اعتبار سے اہم ہیں کہ انھوں نے مرثیے کی قدیم ہیئت کو بدلنے کی کوشش کی ہے اور مسدس سے نکال کر مرثیے کو آزاد نظم میں بھی لکھا ہے جس کی سماعت کا دورانیہ کوئی دو گھنٹوں پر مشتمل ہے

صبا اکبرآبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شاعری کی ہر صنف سے اپنے معیار کے ساتھ گزرنے کی قوت رکھتے ہیں ابھی ہم نے ان کے ترجمے اور مرثیے دیکھے ہیں جس سے اُن کے توانا اسلوب اور لسانی و تکنیکی حاکمیت کا اندازہ ہوتا ہے "اوراق گل" ہمارے لئے ان کی غزلیہ شاعری کا پہلا پیش نامہ ہے۔

صبا صاحب نے اس زمانے میں غزل لکھنے کا آغاز کیا تھا جب پورا برصغیر ایک سمت اقبال اور جوش کی نظموں سے متاثر ہو رہا تھا تو دوسری طرف یگانہ حسرت، جگر، فانی اور اصغر غزل کی تہذیب میں عشق کی موت کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پورا ہندوستان سیاسی تحریکوں اور آزادی کے عملی خوابوں میں جگرا ہوا تھا اور آتش فشاں بن کر اندر ہی اندر جل رہا تھا زندگی کی تہذیبی اقدار اور غزل کی جمالیاتی عنائیت شکست ہو کر پارہ پارہ ہو جانا چاہتی تھی اجتماعی شعور روحانی کلیت کا انکاری بنا ہوا تھا انقلاب اور تبدیلیوں کی خواہش رستہ رستہ بچھی ہوئی تھی ایسے انتشار کے دنوں میں صبا صاحب کے یہاں نظم و ضبط، صبر و برداشت اور اپنی ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑنے کا جو شعور ملتا ہے وہ اُن کی شاعری کا پسِ منظر بھی بناتے "اوراق گل" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اُن کے پسندیدہ موضوعات میں انسان اور انسان کا وہ عشق جو بدن کی خواہشوں کے گرد طواف کرتا ہے اِس کے ساتھ ہی کچھ اور مختلف خیال بھی ان کی غزل کے دائرے میں گردش کر رہے تھے۔ صبا صاحب کا وہ زمانہ جذبوں کی شدت اور خوش رنگ خوابوں کی اڑانوں کا زمانہ تھا جب انھوں نے ایسے شعر لکھے تھے کہ

شوقِ دل دونوں طرف باعثِ رسوائی ہے
ادھر آغوشِ طلب ہے اُدھر انگڑائی ہے

بزمِ سیمیں قداں میں دیکھے ہیں
روشنی کے اُٹھے ہوئے مینار

ہاتھ اٹھیں ترے حل کر تو دعائیں مانگوں
ماتھ دیکھ رہا ہوں تری انگڑائی کا

ادھر تو آ تری زلفوں کو پھول پہنا دوں
اسے بہار کا موسم گزرنے والا ہے

وفا شعار نہیں آپ یہ حقیقت ہے
مجھے وفا کی نہیں آپ کی ضرورت ہے
دُنیا سمٹ کے آ گئی آغوشِ شوق میں
کچھ اس طرح گلے وہ ملے ہیں میں کیا کہوں

کوئی خوبصورت نظر جب ان کی شاعری میں تحلیل ہوئی تھی تو انھوں نے اپنی ادھوری غزلوں کو مکمل کر لیا تھا اور زندگی کے خوش رنگ تجربے ان کے تخلیقی دروازے پر دستک دیتے رہتے تھے "اوراقِ گل" میں ایسے شعر تو بہت ہیں لیکن محسوس ایسا ہوتا ہے کہ صبا صاحب کے یہاں ان جذباتی معاملات کو زیادہ تر پوشیدہ رکھا گیا ہے کہ عشقیہ سچائی کو چھپانے کا یہ ڈھنگ کوئی شعوری نہیں ہے بلکہ تہذیبی اور معاشرتی اثرات کی پیدا کردہ مجبوری ہے صبا صاحب نے خارجی زندگی کے پیش منظروں میں پسِ منظروں کے تجربوں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور انہیں غزل کی جمالیات کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے کرار صاحب نے شاعری کی دائمی اقدار کے حوالے سے صبا اکبر آبادی کی شعری اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"دائمی شاعری میں جذبے کے خلوص اور فن کی گہرائی کے ساتھ جو بات سب سے اہم ہوتی ہے وہ زندگی کا احاطہ کرنے کی قدرت ہے جو کسی شاعر کے شعر میں نظر آتی ہے تو نہ صرف اس کے وجود کے متعلق فیصلہ کر دیتی ہے بلکہ ہمیں زندگی کے وہ خدوخال دکھاتی ہے جو شاید ہماری نظر سے پوشیدہ تھے یا ہم نے محسوس نہیں کئے تھے یا ہم نے محسوس بھی کئے تھے تو ہم بیان نہیں کر سکے تھے صبا اکبر آبادی کا شاعرانہ ادراک جس طرح زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور جس طرح ہماری نگاہ کو نادیدنی تناظر پر متوجہ کرتا ہے اس سے ان کی فنکارانہ مہارت اور شعری عظمت کا بھرپور اظہار ملتا ہے اور ان کی شاعری کا پیغام اُن کی مرتبہ شناسی اور احترام ٹھہرتا ہے۔"

اس حوالے سے صبا صاحب کے کچھ شعر دیکھتے ہیں

کیوں مبتلا ہوا تھا وفا کے سراب میں
اب دل کی خاک اُڑتی ہے چشمِ پُرآب میں

کارواں میرے بعد آئے گا
گرد ہوں کارواں نہیں ہوں میں
اگر یقیں ہے رسائی ہے اُن کی منزل تک
تو پھر گزار دو شعلوں کے درمیاں سے مجھے
تیرگی میں ڈوبنے والے ابھی ہمت نہ ہار
ایسے بھی ساحل ہیں جن پر روشنی ہوتی نہیں
ایک دل بجھ گیا تو ایک جلا
انجمن میں چراغ کم نہ ہوئے
ذرا دیکھو اُنھیں اے شہسوارو
سفر جو پا پیادہ کر رہے ہیں

"اوراقِ گل" کی غزل میں ایک ایسی رجائیت ہے جو خود اختیاری بھی ہے سوچتی بھی ہے راستہ بھی دکھاتی ہے اور بہت سے سیاسی و سماجی پوشیدہ منظروں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لاکر بھی رکھ دیتی ہے۔

سب چل رہے ہیں رہبزنوں کو لئے ہوئے
ہر قافلے کا ایک ہی دستور ہو گیا
کیا ختم کر دیا ہے سفر اہلِ شوق نے
رستے پڑے ہوئے ہیں مسافر نہیں رہے
ہزار عکس اُبھرتے ہیں دہر میں لیکن
اس آئینے میں کوئی عکس پائیدار نہیں
چمن میں شعلۂ گل بھی ہے سوزِ بلبل بھی
بڑے چراغ جلا کر بہار گزری ہے
وحشتوں کے رستے میں باغ ہو کہ جنگل ہو
پھول بھی کچلتے ہیں خار بھی کچلتے ہیں

ہم کو بقراط و فلاطوں ہی ملتے ہیں صبا
ہر طرف بس یہی تکرار ہے تم کیا جانو

"اوراقِ گل" کی غزلوں کا سلیقہ داخلی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی نظر آتا ہے اور تصوّف کی ایک ایسی موج اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو آگے چل کر ایک دھارا بن گئی ہے۔

یہ کیا ہے کہ اے خلوتِ گوشۂ وحدت
ہر بھیڑ میں ہم نے تری آواز سُنی ہے
تم تو بے مثل ہو توحید محبت کی قسم
تم سا کیا ہوگا جہاں میں کوئی مجھ سا بھی نہیں
آج اپنے نام سے آواز دے کر دیکھ لوں
آج تک ان کو پکارا ہے انھیں کے نام سے
چونک اُٹھا حُسن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

صبا صاحب کی غزل میں حیرتوں کے جو آئینے سجے ہوئے ہیں ان میں خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے آزمودہ روایت کو اور لمحۂ موجود کے تجربے کو لکھنا ایسا مشکل نہیں ہے جیسا مشکل خیال کو لکھنا ہے کہ خیال ایک ایسی نئی امیجری چاہتا ہے جو غیر مرئی کو مرئی میں تبدیل کر سکے یا تجربہ کو تجسیم کر دے خیال کو ذاتی سطح سے اُبھر کر اجتماعی شعور کی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے خیال ایک ایسے عکس کی مانند ہوتا ہے جو حدِ سفر تک پھیلتا جائے اور خیال تسلسل کے ساتھ دکھائی بھی دیتا رہے۔

وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بہک کے چلتے ہیں
گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں
نظر بگولوں سے ہٹتی نہیں مری ورنہ
وہاں بھی قافلے ہوں گے جہاں غبار نہیں

کچھ بھی نہ تھا شرارۂ بے رنگ کے سوا
پروانہ قربِ شمع سے پروانہ ہو گیا
تیلیاں خشک نہ رکھ اپنے قفس کی صیاد
میرے پہلو میں دہکتی ہوئی چنگاری ہے
آج تک ہے روح محبوسِ جسد
یہ قفس اب تک نہیں بدلا گیا
جو آئے خاک فتادہ کو خودنمائی کا ہوش
ہر ایک ذرّہ ہے صد آفتابِ در آغوش
"اوراقِ گل" جو بادِ خزاں سے بکھر گئے
افسانۂ بہار کی تکمیل کر گئے

"اوراقِ گل" کی مجموعی نوعیت معروضی ہے خیال ہو یا عشق ہو ذات ہو یا معاشرہ ہو سب کی آنکھیں زیادہ تر باہر کی سمت کھلی ہوئی ہیں یہ طرزِ اظہار دلچسپ اور اہم ہے اس غزل نے اپنی تہذیبی و ثقافتی تخلیقی اور لسانی اہمیتوں کے ساتھ بہتر امکانات کی معتبر خبر دی ہے۔ صبا صاحب کی سچائی نے بے خوفی اور اپنی اقدار سے محبت کو بہت واضح طور پر ظاہر کیا ہے اس حوالے سے کرار صاحب کا ایک تجزیہ بڑی افادیت رکھتا ہے کہ

"ہمارے زمانے کے خوفوں میں سے ایک خوف یہ بھی ہے کہ کوئی دقیانوسی نہ سمجھ لے ہمیشہ آگے کی صف میں رہنے کی نفسیات بھی زندگی کے خوف کی ایک قسم ہے صبا صاحب کی جمعیت خاطر اس خوف سے آزاد ہے۔ روایتی علامتیں تو شاعری کا اجتماعی لاشعور ہیں وہ کبھی پرانی نہیں ہوتیں ہاں ان کا تخلیقانہ استعمال شاعر کی نظر اور فن پر منحصر ہے اور صبا صاحب کی فنکارانہ خلاقی اس طرف متوجہ ہوتی ہے تو ماضی کے یہ سارے استعارے صرف حال ہی کے نہیں بلکہ مستقبل کی آواز بن جاتے ہیں۔"

صبا صاحب کا ایک شعر ہے کہ

نکھار دی چمن روزگار کی صورت
جلا کیا ہوں چراغ بہار کی صورت

"چراغ بہار" صبا صاحب کی غزلوں کے دوسرے مجموعے کا نام بھی ہے جس کی غزل ایک طول سفر کے بعد ہم تک پہنچی ہے جہاں زندگی اور زندگی کے تجربے عشق اور اس کی کلیت کا شعور انسان اور اس کی محبتیں رشتے اور ان کا تعلق تہذیب اور اس کی پاسداری زبان و بیان اور اس کی اہمیت اور بہت سی ظاہر و پوشیدہ حقیقتیں صبا صاحب پر اپنا انکشاف کر چکی ہیں کہ کاغذ کے پھول خوشبو نہیں رکھتے مگر خوبصورت ضرور لگتے ہیں شب ہجراں میں عمر کٹ جاتی ہے مگر وصال کے موسم نہیں آتے اور صحراؤں میں وہ لوگ پھول کھلاتے ہیں جن کے پاؤں زخمی ہوں صبا صاحب یہ بھی جان چکے ہیں کہ سچی خواہشوں کے درمیان "بوالہوس عشاق" بھی چھپے ہوئے ہیں اور جتنی صورتیں ہیں وہ آئینے میں آ کر بدل جاتی ہیں لیکن صبا صاحب مصلحت پرست نہیں ہیں وہ جن سے ملے ہیں بغیر پس و پیش ملے ہیں۔ سچ بولنا سچ لکھنا اور سچ کی حمایت کرنا ایک اچھے انسان اور ایک سچے شاعر کی پہچان ہوا کرتی ہے "چراغ بہار" کی غزل ان ہی منطقوں سے مل کر تشکیل پاتی ہے اور حسن کی محبوبیت بدن کی لمسیاتی خواہشوں سے آگے بڑھ گئی ہیں وہ کہتے ہیں کہ

کوئے جاناں کی خاک ہے سر پر
منکرِ تخت و تاج ہیں ہم لوگ

آپ نے خود مجھے صدا دی ہے
یا مری قوتِ ارادی ہے

مختلف ہیں تصوراتِ جمال
یہ عقیدہ بھی انفرادی ہے

آئینہ بن کے مرے سامنے آیا ہے کوئی
میرا ہی عکس ہے وہ جس کا میں گرویدہ ہوں

www.taemeernews.com

تری تصویر کیسے بن سکے گی
ہر اک سادہ ورق کو دیکھتا ہوں
تمہیں سو رنگ نظر آئیں گے اپنے
میں آئینہ ہوں اور ٹوٹا ہوا ہوں
آپ آئے ہیں نواب گھر میں اُجالا ہے بہت
کہیے جلتی رہے یا شمع بجھا دی جائے
آئینے میں قریب آ کر دیکھ
تیری صورت بھی مری صورت ہے

اور جب دو صورتیں ایک عکس بن جاتی ہیں تو زندگی کی محدود سمتیں بدلنے لگتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خواہشیں بڑے بڑے خوابوں کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں سفر کی دھوپ اور راستوں کی تھکن دیوار نہیں بنتی پھر آدمی اپنے جلنے کا غم نہیں کرتا جل کر خاک ہو جانے کی دُعا مانگتا ہے اور منزل کی طلب سے زیادہ شکستہ پا ہونے کی لذت بڑھ جاتی ہے۔

سورج ہی رہا سر پہ تری راہگذار میں
ہر دھوپ سہی سایۂ دیوار کی خاطر
پسِ دیوار یار بیٹھا ہوں
کیا خبر دھوپ ہے کہ سایا ہے
جو دل جلے تو شبِ ہجر اپنی روشن ہو
چراغ جس میں جلاتے ہیں یہ وہ رات نہیں
جب چلے تو ساری دنیا راہ میں حائل ملی
دل سے دل تک ایک نظر کا فاصلہ سمجھے تھے ہم
اپنے جلنے میں کسی کو نہیں کرتے ہیں شریک
رات ہو جائے تو ہم شمع بجھا دیتے ہیں

رات گلشن میں جس تھا کتنا
پھول تر ہو گئے پسینے میں
خدا کو بھی پکارا ہے بتوں کو بھی پکارا ہے
کسی کی سمت سے کوئی صدا اب تک نہیں آئی

جس نرم گفتاری اور جس دھیمے لہجے میں صبا صاحب نے خود کلامی کی ہے اُس کو کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اثباتی زندگی کے لئے ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتے ہیں اور بکھر بکھر کر سمٹ جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ صبا صاحب کی وہ غزلیں ہماری شاعری اور ہماری زندگی کا اہم سرمایہ ہیں جن میں انہوں نے انسانی تجربوں کو اپنی ذات کے حوالے سے لکھا ہے۔ صبا صاحب نے اپنے موضوعات اور اپنے اسالیب و شعریات کے بارے میں نثری رائے بھی دی ہے جو پڑھنے والوں کے لئے کسی طرح بھی بے قیمت نہیں وہ لکھتے ہیں کہ

"میں الفاظ کو معنی کا ستر پوش سمجھتا ہوں اور الفاظ بے جوڑ لباس شخصیت میں جو خرابی پیدا کر دیتے ہیں اس سے تو سب ہی واقف ہیں لیکن میں خوفزدہ بھی رہتا ہوں اس لئے میرا ایقان ہے کہ الفاظ کے صحیح استعمال کے بغیر شاعری کرنا آہن تراش کر گلاب کی تخلیق کرنا ہے اس کوشش میں گلاب کی شکل تو بن جائے گی لیکن خوشبو تو دُور کی بات ہے نقل تک کا دھوکا نہ ہوگا۔ میرے نزدیک اصل بات انسانی جذبہ اور اس کا ایک خالص تجربہ ہوتا ہے میں زندگی کے جس تجربے کو اپنی شاعری کی سطح پر بیان کر سکتا تھا اس میں کسی قسم کی بناوٹ سے کام نہیں لیا ہے شاید اس لئے میری شاعری میں آپ کو وہ جذبہ اور وہ زندہ و بیدار معاشرہ نظر آئے جو انسانوں کو انسانوں سے محبت پر آمادہ کرتا ہے اس معاشرے کو بہت سے لوگ روایتی کہنے لگے ہیں لیکن زندگی مجرد شے نہیں ہے یہ خود ایک روایت کا تسلسل ہے مجھے یہ تسلسل بہت عزیز ہے لہٰذا روایت کے اس دھاگے کو آج کے عہد تک لے آیا ہوں لیکن یہ کام عہد بہ عہد اور نسل در نسل جاری رہتا ہے اس لئے کہ تہذیب نفس کا بنیادی کام اسی شاعری کا عمل انجام دیتا ہے۔"

صبا صاحب کی اس فنی و تنقیدی رائے کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری کو دیکھتے ہیں

شمع کا نور عارضی ہے میاں
روشنی دل کی روشنی ہے میاں

میں موسم آشنا ہوں کہ موسم گزیدہ ہوں
پھولوں کا مرثیہ ہوں خزاں کا قصیدہ ہوں

اجالا کر کے ظلمت میں گھرا ہوں
چراغِ رہگذر تھا بجھ گیا ہوں

تہمتِ سایۂ دیوار جو سر آتی ہے
ہم وہاں بیٹھتے ہیں دھوپ جدھر آتی ہے

اچھا ہوا کہ سب در و دیوار گر پڑے
اب روشنی تو ہے مرے گھر میں ہوا تو ہے

ہم جلے مثلِ چراغِ رہ گذر
چلنے والے روشنی پاتے رہے

ساتھ ساتھ چل کر بھی منزلیں مخالف ہیں
جسم کا سفر تنہا روح کا سفر تنہا

بلندی سے اُسے گرنا پڑے گا
جو چشمہ خاک سے پھوٹا نہیں ہے

قلعے میں رہ کے فصیلوں سے ہوشیار رہو
کوئی دشمن پسِ دیوار بھی ہو سکتا ہے

دیوار سے پسِ دیوار تک جاننے کا شعور زندگی کی خارجی یا معروضی تجربوں سے ممکن نہیں ہے ساری زمین اور سارا آسمان ہمارے اندر موجود ہے اگر ہمیں ان کا شعور ہو جائے تو باہر کا سارا ادراک روشن ہو سکتا ہے اگر بصیرت جاگ اٹھے اور اندر شعلہ بھڑکنے لگے تو مٹھی

دھوپ کا تازہ موسم ہمارے درمیان اُتر آتا ہے اور پوشیدہ روشنیاں اظہار میں آتی چلی جاتی ہیں۔ خارج اور باطن کی وحدت اور اس کا شعور ہر اہم شخصیت کی فکر میں شامل رہا ہے یہ شعور خود صبا صاحب کی شاعری میں بھی موجود ہے یہیں سے روایت اور جدت کے مرحلے سامنے آتے ہیں کہ کرار حسین نے کہا تھا کہ

"آج کل روایت کے نام سے ایک چڑ ہو گئی ہے اور جدت ہر نوع ایک مستحسن صنعت شمار کی جاتی ہے لیکن ایک جدت قدرتی ہوتی ہے جو اپنے عہد سے قوت نمو حاصل کرتی ہے اور ایک مصنوعی جدت ہوتی ہے۔ صبا صاحب روایت کے تسلسل کے ساتھ جب شاعری میں آگے کا سفر کرتے ہیں اور اپنے عہد کا المیہ بیان کرتے ہیں تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ ان کی شاعری اعلیٰ شاعری کی طرح جدید اور قدیم کی تقسیم سے بے نیاز ہو کر سچی شاعری کے منصب پر نظر آتی ہے جو ہر عہد اور ہر معاشرے کی زبان بن کر زندہ رہتی ہے۔"

اس حوالے سے صبا صاحب کے کچھ شعر پڑھتے ہیں

جس طرف جاؤں وہی قید عناصر سامنے
مجھ کو اس زنداں میں رکھا جس کا دروازہ نہ تھا

ہمیں خشک صحرا میں یہ حکم ہے
دعا مانگتے رہیے برسات کی

مخالفت کا زمانے کی مجھ کو کیا غم تھا
کہ میرے ہاتھ میں اپنی انا کا پرچم تھا

صبا جو یاد نہ آیا مجھے مصیبت میں
وہی تو اِسم حقیقت میں اسم اعظم تھا

کیا تعجب ہے زمانے میں جو نادیدہ ہوں
میں خود اپنے ہی حجابات میں پوشیدہ ہوں

میری حالت کو نہ دیکھو مرا ماضی دیکھو
اپنے اجداد کا اک خلعت پوسیدہ ہوں
عین ممکن ہے کبھی ڈھونڈ لے کوئی مجھ کو
اک خزانہ ہوں نگاہوں سے جو پوشیدہ ہوں

اوپر سے ہیں مومن سراپا
اندر سے تمام بولہب ہم
ساحل پر سوائے خاک کیا تھا
غرقاب ہوئے ہیں تشنہ لب ہم

صبا صاحب کی شاعری میں اس تشنگی کے یا اس ڈوبنے کے معنی قنوطی انفعالی یا منفی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے انفرادی شعور اور اجتماعی رویّوں کا اثبات کرنے کے ہیں اور ایسی سچائی کا ادراک دینے کے ہیں جس کے لئے جسم کا فنا ہو جانا ہی زندہ رہنے کی علامت ہے "چراغ بہار" کے اِس اسلوب میں سائے پوشیدہ گمان زندہ امکان بنتے چلے گئے ہیں

ہجرت ہمارے لئے ایک سفر بھی ہے ایک استعارہ بھی ہے یہ ایک ایسی وحدت ہے جو اکائیوں میں بٹی ہوئی ہے بیسویں صدی میں یہ سفر یہ ہجرت اپنی وسعتوں میں اور اپنی گہرائیوں میں بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ملکوں شہروں سڑکوں اور گلی کوچوں سے لے کر اپنے گھر اور اپنی ذات تک میں آدمی ہجرت زدہ ہے۔ تنہائیوں کے عذاب میں ہے انسان کی اس حالت کو اگر کوئی قنوطیت پسندی یا احساسِ شکست کہتا ہے تو کہتا رہے لیکن یہ ایک صداقت ہے ایک معنویت ہے یہ ہمارے عہد کی ایک بڑی سچائی ہے ایک ایسی بڑی سچائی جس کا زخم تازہ ہے اور جلتا رہتا ہے۔

کتنے دن لگتے ہیں اے خانہ خرابی یہ بتا
اس زمیں پر در و دیوار کو گھر ہونے تک
ہر شہر کو میں سمجھ کر اپنا
ہر شہر میں اجنبی رہا ہوں
بس اتنا واسطہ ہے کارواں سے
لٹا ہوں میں نے کچھ لوٹا نہیں ہے

اک عذاب مستقل ہے فکر تعمیر جہاں
ساکنِ صحرائے بے در و دیوار ہو جایئے

گھر نہیں سایۂ اشجار سہی
بے ٹھکانوں کے ٹھکانے ہیں بہت

گھر ڈھونڈتے ہیں اجنبی منزل پہ مسافر
اتری نہیں چہروں سے ابھی گردِ سفر بھی

اے دل اسیر حلقۂ دیوار و در نہ ہو
دنیا بہت بڑی ہے نہیں ہے جو گھر نہ ہو

قسمت کا سارا کھیل تھا اک در بنائے صبا
یہ شہر ناشناس کہاں اور ہم کہاں

صبا صاحب ہمیشہ اپنے تہذیبی آداب کی قید میں رہے ہیں اور یہی سبب ہے کہ وہ سوکھے ہوئے زرد پتوں سے بھی اپنے تعلق کو ختم نہیں کرتے کہ یہ بھی تو باغ کی اتاری ہوئی پوشاک ہوتے ہیں سلوک اور محبتوں کا ایسا اختیار انہیں تصوف کی طرف لے گیا ہے ماورائے رشتہ جوڑنے کے بعد کوئی زمین سے اپنا کوئی تعلق نہیں توڑ سکتا کہ زندگی کی اساس توڑنے پر نہیں ہے جوڑنے پر ہے

ہے تری یاد خود فراموشی
کس کو سوچیں ترے خیال کے بعد

شاید ان تک مری آواز نہیں پہنچی ہے
در جو ہے بند تو کوئی پسِ در بھی ہوگا

کیا ان پر نظر پڑے کسی کی
دیوار کھڑی ہے روشنی کی

انہیں تلاش کیا اور مل گئی دنیا
ہزار کام اس سعیٔ رائگاں سے چلے

میری نظر سے ان کے حریم جمال تک
سورج بچھے ہیں راہ میں ذرّات کی طرح
رکھا ہوا تھا پسِ پردہ ایک آئینہ
ہمیں خود اپنے مقابل تھے جب حجاب اٹھا

صبا صاحب کے جو اشعار ہم نے پڑھے ہیں وہ ایسی سرگوشی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ شاعری انکی ذاتی زندگی کے تجربوں سے پیدا ہوئی ہے لیکن وہ نمائش پسند نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اگر کہیں طنزیہ طرزِ بیان آ بھی گیا ہے تو بے حد دھیما پن لئے ہوئے ہے وہ شعاعوں کے تیر کمان رکھتے ہیں لیکن خاک پر بچھے ہوئے ہیں وہ اندھیروں میں چراغ کی طرح جلتے ہیں شعلہ بن کر بھڑکنا انہیں پسند نہیں وہ حیرتوں کے درمیان اپنے طنز کو اتارتے ہیں اور پڑھنے والے کو اپنی سچائی کی گہرائیوں تک لے جاتے ہیں وہ شیش محلوں کی تعمیرات کو دیکھتے ہیں تو انہیں پتھروں کی کمی کا خیال آتا ہے۔

میری کسی پکار کا ملتا نہیں جواب
موجود ہو جو کوئی یہاں تو صدا بھی دے
اے زمیں تیری خاکساری پہ
کیا بدل جائے گا مزاجِ سپہر
دستِ گلچیں ابھی سلامت ہے
کھلتی ہے شاخ پر کلی تو کیا
جلا نہ دامنِ گلچیں بڑا تعجب ہے
جو پھول باغ میں تھا شعلہ مجسّم تھا
پھر بھی ہوں قافلۂ اہلِ جہاں میں شامل
پاؤں میں خار نہیں سر پہ مرے خاک نہیں
گاہ توڑا ہے مجھے گاہ بنایا ہے مجھے
میں کھلونا ہوں مشیّت کا پسندیدہ ہوں

میں حلق بریدہ ہوں مرے لب نہیں کھلتے
اب میری طرف سے کوئی قاتل کو دعا دے

مقتول ہو کر قاتل کو دعا دینا اور ان جبابوں کو پیاسا دیکھ لینا جو کبھی طوفانوں کا وجود بنے ہوئے تھے زندگی کی اعلیٰ بصیرت اور صبرِ عظیم کی انتہائی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہاں تک پہنچ کر آدمی جو کچھ سوچتا ہے جو کچھ بولتا ہے وہ کسی پیش گوئی سے کم نہیں ہوتا صاحب کی تخلیقی دانش اور عملی تجربہ بہت کچھ سکھاتا ہے کہ ہماری روایتی تہذیب میں شاعری کا زندگی سے ایسا تعلق رہا ہے کہ اس نے مضبوط شخصیت بننے میں شاعر اور قاری دونوں کو ہی مدد دی ہے۔

سوزِ دل سے گوشۂ تنہائی میں کیا فائدہ
اسطرح جلئے چراغِ رہگذر ہو جائیے
قفس میں مژدۂ گل تو کبھی نہ آئے گا
پر شکستہ سے خود پردۂ خزاں کھولو
خلاؤں کی خندق دیرینہ کو عبور کرو
فلک کے گنبدِ بے در کی کھڑکیاں کھولو
وقت تاریخ میں کچھ نام بدل دیتا ہے
ورنہ شدّاد نہیں آج کہ ضحاک نہیں
زندگی خود کوئی اکائی نہیں
موت کی بھی مدد ہے جینے میں
موت وہ ڈھیٹ بھکارن ہے کہ جان لینے کو
لاکھ چاہے کہ نہیں آئے مگر آتی ہے
لئے جاتی ہے کہاں ہم کو خلاؤں کی کشش
دوسری کوئی زمیں تو پسِ افلاک نہیں

زمین سے افلاک تک کا سفر اور پسِ افلاک کسی نئی زمین کا گمان ہونا مادیت اور روحانیت کے حوالے سے جسم و جان میں توازن پیدا کر لینے کا استعارہ ہے ہم میں سے کتنے لکھنے پڑھنے

والے ہیں جو سچائی کے ساتھ صبا صاحب کی طرح یہ کہہ سکیں کہ

اے صبا دل میں نہ ہو کیوں احترامِ شاعری
شاعری نے تربیت دی ہے مجھے ماں کی طرح

شاعری کو صبا صاحب نے پیغمبر ماں سمجھا اور ساری عمر اس کی محبت میں اور اس کے احترام میں گذار دی لیکن تخلیقی عمل کی رائگانی صورتِ حال کے تجربے نے صبا صاحب سے یہ تلخ شعر بھی لکھوائے کہ

جنسِ بے مایہ پہ کتنا ناز کرتے تھے صبا
شاعری کو اک متاعِ بے بہا سمجھے تھے ہم

کون سنتا ہے صبا کون سمجھتا ہے صبا
میر کی طرح کہو شعر کہ سودا کی طرح

ادبِ عالیہ ہے وہ تحریر
جب نہ لفظوں میں ہو کوئی مفہوم

ہر ایک شاعرِ بے علم کو گماں ہے صبا
کہ وہ بھی غالبِ معجز بیاں سے بہتر ہے

جس معاشرے میں علم و ہنر کو بھی منافقت اور دھوکے کا چہرہ پہنا دیا جائے وہ ایک اچھا انسانی معاشرہ نہیں بن سکتا کہ علم و ہنر ہی فرد میں افراد میں یا معاشرے میں انسانی اہمیتوں کو پیدا کرتے ہیں ورنہ وحشت اور حیوانیت کینسر کی طرح سماج کے اندرونی وجود میں پھیل جاتی ہے اور اقدار کے شجر کو دیمک کا رزق بننا پڑتا ہے صبا اکبر آبادی کو زندگی اور فن کی ان بنیادی ضرورتوں کا احساس رہا ہے اور وہ زندگی کے کڑوے تجربوں کے باوجود اپنے آدرش کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکے ہیں۔

شعروں میں مرا خونِ جگر بول رہا ہے
الفاظ ہیں خاموش ہنر بول رہا ہے

کہیں خیال کی رنگینیاں نہ گم ہو جائیں
ہم اپنے شعر میں الفاظ سادہ رکھتے ہیں

جب سیفِ قلم مجھ کو عطا کی ہے خدا نے
چلتی رہے یہ ہاتھ کی تلوار نہ ٹھہرے

یہ احترامِ روایت تو کم نہیں ہوگا
تمام عمر کا حاصل ہے کیا کیا جائے

مذکورہ شعر صبا صاحب کی تازہ شعری کتاب "ثبات" میں موجود ہیں اس کتاب کے مطالعے سے چند نئی باتیں سامنے آئی ہیں کہ اُن کے والد محترم ایک سیاسی اور سماجی شخصیت تھے اور صبا صاحب نے اُن کی مصروفیتوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا لیکن خود صبا صاحب کی شاعری میں سماجیات یا سیاسیات کا اظہار بہت کم ہوا ہے "ثبات" میں انھوں نے اُس رجحان کو کچھ زیادہ اظہار میں لانے کی کوشش کی ہے جو عمومی انداز میں مُلکی سطح کو اور خصوصیّت کے ساتھ سندھ کی صورت حال کو پیش کرتا ہے

اے سائلانِ شہر گوارا نہ ہو اگر
لے جائیں ہم اٹھا کے یہ دیوار و در کہیں

رُکتے جاتے ہیں چلتے جاتے ہیں
قافلے گھر نہیں بناتے ہیں

مِل کے باہم جو رہ نہیں سکتے
لوگ کیوں بستیاں بساتے ہیں

جل رہے ہیں پھر غریبوں کے مکاں
پھر بنے گی جنتِ شدّاد کیا

دُھوپ کا رُخ ایک سا رہتا نہیں
سایۂ دیوار کی افتاد کیا

ہم جیسے کچھ غریبوں کے گھر جل گئے تو کیا
یہ تو ہوا کہ شہر میں ظلمت نہیں رہی
بے ضرر روشنی سے بھی مجھے ڈر لگتا ہے
آشیانہ نہ جلا دے کوئی جگنو میرا

صبا صاحب زندگی کا حوصلہ نہیں ہارتے بلکہ اس جلی ہوئی مٹی سے نئے چہرے تخلیق کرنے کی خواہش کرتے ہیں وہ بیابان کی حدوں تک پہنچ کر بھی کسی آواز پر پلٹ جانے کی گنجائش رکھتے ہیں وہ زندگی کو بے رنگ دیکھتے ہیں لیکن کسی کی خواہش پر جینا بھی چاہتے ہیں وہ دوسرے غریب الوطنوں سے ملتے ہیں تو اپنی غربتوں کو بھول جاتے ہیں صبا صاحب جانتے ہیں کہ آشیانے سے قفس تک کا فاصلہ عمر بھر کا فاصلہ ہے شبِ غم گزارنے کے بعد اپنے چراغ کی چمک کو کم پاتے ہیں لیکن خود کو بجھنے نہیں دیتے ان کا تجربہ بتاتا ہے کہ کسی کشتی کے ڈوبنے سے سمندر کی سطح بڑھا نہیں کرتی اس لئے وہ پھولوں کو دھوپ کے مرکز سے بچا کر شبنم کا سائبان دینا چاہتے ہیں وہ آسائشوں کی گنجائش دیکھتے ہیں اور زر دموسموں سے بھی شکستہ نہیں ہوتے وہ دھوپ کے سفر میں سایہ دار درختوں کی خواہشوں کو کم نہیں کرتے کہ انہیں معلوم ہے کہ اندھیرے کے بعد اجالے اور زخم کے بعد گلاب ضرور کھلتے ہیں وہ دکھوں کے آنسوؤں کے امین ہیں لیکن زندگی کو پھولوں کے رنگوں اور خوشبوؤں میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ محرومیوں سے رجائی حوصلے تراشتے ہیں اور آگ سے گزرتے ہوئے بہار کے اثبات کی خواہش کرتے ہیں کہ

ظلم کے دور میں داغوں کو نمایاں کرنا
جب چلے تیز ہوا خوب چراغاں کرنا
خشک پتوں پہ لہو رونا ضروری تو نہیں
پھول کھل جائیں تو پھر جشنِ چراغاں کرنا

صبا صاحب کی یہی رجائیت ان کی شخصیت اور ان کے فن کا اثبات کرتی ہے اور داخلی و خارجی آگہی کو اپنے اظہار میں لاتی ہے۔

صبا لکھنوی صاحب کے یہاں جس جمالیات کو ہم دیکھ چکے ہیں وہ اپنی تاثیر میں اور اپنی اقدار میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ انھوں نے عشق اور محبوب کے حوالے سے کسی انفعالی قنوطیت یا کسی رقت آمیزی کا اظہار نہیں کیا ہے وہ اپنی محبتوں پر اور اپنی سچائیوں پر اعتماد رکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی عشقیہ جمالیات سے ہوس پرستوں کا جیسا کوئی شکستہ پن محسوس نہیں ہوتا وہ اپنے تعلق کو ہر موسم میں اور ہر تبدیلی کے درمیان زندہ سمجھتے ہیں ان کے تجربوں میں منفی نتائج بھی آتے ہیں لیکن انہیں ایک ایسے اثبات کا اعتبار رہتا ہے جو عمر بھر انہیں اپنے تمام رشتوں سے جوڑے رکھتا ہے وہ گمان کو امکان سے اور معلوم کو نامعلوم سے ہم کنار رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی حدوں تک ثابت قدمی کے ساتھ گزرے ہیں ہمیشہ انہیں خوب سے خوب تر کی تلاش رہی ہے اور وہ اپنے اس خواب سے ملتے بھی رہے ہیں اسی نسبت سے "ثبات" کی کچھ اور مثالیں بھی دیکھتے چلیے۔

دن کے ہنگامے جب تمام ہوئے
اس کی آواز رات بھر آئی
تمھیں بچھڑے ہوئے اک عمر گزری
مجھے دیکھو کہ اب تک جی رہا ہوں
اُس رنگِ رُخ کا عکس پڑے گا کب اے صبا
ہر پھول کو کچھ اور حسیں چاہتا ہوں میں
اُمید تو یہی ہے کہ پھر کل ملیں گے ہم
یہ اور بات ہے نہ ملیں عمر بھر کبھی
رکھتی ہے محو قامت زیبا کی دلکشی
جاتی نہیں نگاہ ترے خدوخال تک
وہ اِک حصارِ فکر بنا کر چلے گئے
محدود کر گئے مجھے میرے خیال تک

اک شرارے سے جلا جاتا ہے پہلو میرا
نہیں معلوم یہ تیرا ہے کہ آنسو میرا

حسن اور حسن کی خواہش کی ایسی یکجائی اور ایسی وحدت ہمارے عہد کے لوگوں میں گم ہوگئی ہے۔ جس محبت نے دنیا میں ایک ربط پیدا کر رکھا تھا اور جو زمین سے آسمان تک انسانوں کا مشترک حاصل اور ضرورت بنی ہوئی تھی وہ محبت ہمارے درمیان تقسیم ہوگئی ہے اب ہم محبوب کی گلی سے نکل کر دھوپ میں نہیں جلتے اور اس کی خواہش میں اپنے جینے کو اہمیت بھی نہیں دیتے ہمارے بدن پر محبوب کے راستوں کی گرد نہیں ہے بلکہ ذاتی خواہشوں کا غبار ہے اب ہم اندھیری رات میں کسی کے وعدوں کے چراغ نہیں جلاتے کہ ہم اپنے اندر سمٹتے جا رہے ہیں مادی خواہشات کا ایک ہجوم ہمیں شکست دے رہا ہے لیکن صبا صاحب کا داخلی تجربہ اور اس کی خواہشوں کا رنگ اس محدود تجربے اور اس چھوٹے آدرش سے مختلف ہے جسے ہم لوگوں کے درمیان دیکھتے ہیں۔ صبا صاحب کی ذات ایک مانوس اور خوبصورت گھر کی طرح ہے جہاں کھڑکیوں میں تازہ ہواؤں کا گزر ہے اور اس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اُن کی شعری خلاقیت میں بڑی وسعت ہے کہ دوست اور دشمن سب ہی اس سائبان کے نیچے آسودہ ہو سکتے ہیں ذات کے حوالے سے صبا صاحب نے بہت لکھا ہے یہاں ہم ایک مختصر انتخاب مطالعے کے لئے پیش کر رہے ہیں۔

جو چاہے آئے وہ آ کر ہمیں چرا لے جائے
غریب خانے کا ہم در کشادہ رکھتے ہیں
ہمارے دوستوں کو ہم سے یہ شکایت ہے
کہ دشمنوں سے مراسم زیادہ رکھتے ہیں
یہ اور بات کہ اظہار کم سے کم ہی کریں
ہم اپنے دل میں محبت زیادہ رکھتے ہیں
اپنے کسی حریف سے واقف نہیں ہوں میں
اپنے سوا کسی کا مخالف نہیں ہوں میں

غم و اندوہ نے کتنی امیدیں بڑھا دی ہیں
کہ آندھی بھی غبارِ کارواں معلوم ہوتی ہے
بھڑک کے رہ گئے خاشاک خشک کی صورت
چراغ ہوتے تو ہم دیر تک جلا کرتے
مجھ سے بہتر تو بہت آئیں گے
کوئی مجھ سا نہیں پیدا ہوگا

صبا صاحب کو اپنی اہمیت کا احساس ہے لیکن انھوں نے کبھی دوسروں کے رستے میں دیوار نہیں اٹھائی کہ وہ اقدار اور اثبات کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں اور انہیں اس تاریخی حقیقت کا شعور بھی ہے کہ خیر و شر کا رزمیہ ازل اور ابد کے درمیان کبھی ختم نہیں ہوگا اور اس رزمیے کے ظالم اور مظلوم دونوں کردار انسان ہی رہیں گے انھیں خیر کا کردار اچھا لگا ہے اور اسی حوالے سے وہ اپنی زندگی اور اپنے فن کو پیش کر رہے ہیں صبا صاحب کے یہاں ہم تصوف کو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں اور یہاں بھی چند شعر دیکھتے ہیں۔

سب نقشِ خیالی کے تعاقب میں رواں ہیں
پہچان سکیں کیا جسے دیکھا ہی نہیں ہے
اچھا ہوں یا برا ہوں مجھے کچھ خبر نہیں
تصنیف ہوں کسی کی مصنف نہیں ہوں میں
وہ کہہ رہے ہیں ہم تری صورت میں ہیں نہاں
آئینہ دیکھنا نہ پڑے عمر بھی کہیں

صبا صاحب کی حیات و شاعری سے جو شخصیت تشکیل پاتی ہے اُس کا شمار ان لوگوں میں ہے جنھوں نے انسان، کائنات اور خدا سے اپنے رشتوں کو استوار رکھا ہے۔ وہ "چشم بینا" رکھتے ہیں اور خرابوں میں بھی تعمیر دیکھ لیتے ہیں۔ وہ پتھروں کے زخم کھاتے ہیں اور پھول کی طرح مہکنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ زندگی کے سفر میں شکستہ پا رہتے ہیں اور گردِ سفر کے سوا کسی کا آسرا نہیں رکھتے۔ وہ تمام عمر اختلافات اور اتفاق کے درمیان رہے ہیں لیکن اندھیرے میں روشنی بن

کر چکنے کی خواہش کسی لمحے بھی اُن سے جُدا نہیں ہوئی۔ انسان اور انسان کی سچائیوں نے ہمیشہ انہیں اندھے اور گونگے موسموں سے بچائے رکھا ہے ان کی شاعری موجودہ تجربوں کی ایک ایسی زندہ آواز ہے جو دوسروں کو تبدیل کر سکتی ہے

غمِ انسانیت رکھا ہے دل میں
نظامِ جبر کا باغی رہا ہوں
زمانے نے مجھے بدلا نہیں ہے
کہ میں جیسا تھا ویسا ہی رہا ہوں
بزرگوں کی روایت کو بچانے
شکستہ قلعہ کے فوجی رہا ہوں
فضا دیکھی ہے ہر اک سرزمیں کی
ہمیشہ اکبر آبادی رہا ہوں

صبا صاحب کے اکبر آبادی ہونے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس رائے سے اختلاف موجود ہے کہ

"صبا صاحب اگر اکبر آبادی نہ ہوتے تو وہ ایسے شاعر بھی نہ ہوتے۔"

ہم سمجھتے ہیں صبا صاحب شاعر تھے شاعر ہیں اور ان کا تعلق کسی بھی شہر سے ہوتا۔ وہ ایسے ہی شاعر ہوتے کہ شاعر ہونے کے لئے اکبر آباد کا ہونا ضروری نہیں اس مطالعے کو ختم کرتے ہوئے ہم صبا صاحب کے شعری مزاج کی ایک اور خصوصی صفت کو دیکھتے چلتے ہیں کہ ان کے شخصی مزاج میں جو درویشی موجود ہے وہ تخلیقی سطح پر بھی اظہار میں آئی ہے اس حوالے سے خصوصیت کے ساتھ صبا صاحب کی وہ غزلیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں جو "سائیں" اور "بابا" کی ردیفوں میں لکھی گئی ہیں۔ جن کے مطلعے ہیں کہ

شمع کا نور عارضی ہے میاں، روشنی دل کی روشنی ہے میاں
خود ذوقِ سفر ہے رفتہ رفتہ بابا، ہر گام پہ دیوار ہے بابا

اس مزاج میں انسانیت کی وہ عالمی لے سنائی دیتی ہے جو ہمارے معتبر صوفیوں اور زندہ

قلندروں کی لے رہی ہے۔

صبا صاحب اس شاعری میں انسانوں کے جسم و جان سے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ درمیان کے سارے غبار کٹ کر ہواؤں میں تحلیل ہونے لگتے ہیں اور یہی انسانی وحدت کا تصور بھی ہے۔

مجنوں گورکھپوری کا وہ موازنہ بھی مطالعہ چاہتا ہے جس میں انھوں نے دو مختلف شاعروں کے درمیان باہمی اشتراک کو تلاش کرتے ہوئے دونوں کے کلیدی فرق کو ظاہر کر دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"مجھے فراق اور صبا میں جو قدر مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ فراق نے اپنی انگریزیت اور دُنیا بھر کی شاعری سے جو انھوں نے پڑھی ہے اپنے آپ کو "ازبح" کیا اور صبا صاحب نے زیادہ تر کلاسیکل اور مشرقی شاعری کو اپنے اندر جذب کیا لیکن باوجود ایک دَور کی روح دونوں میں شریک ہے اور ان دونوں کا فرق ان دونوں کی اپنی اپنی انفرادیت ہے ایک ایسا اپنا پن جو شاعر کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور جس سے اس ذات کا تشخص قائم ہوتا ہے۔"

ہم نے یہاں تک صبا اکبر آبادی کی ترجمہ نگاری مرثیہ نویسی اور غزل گوئی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی اہمیت کو ان کے مذکورہ تخلیقی و لسانی مثلث کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے۔ جس کے حوالے سے کہی ہوئی باتوں کو یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ اُردو اور فارسی کی شعری اقدار کو صبا صاحب نے اپنے وجود کا اظہار بنایا ہے وہ ہماری تہذیبی زندگی اور ہمارے اثباتی کلچر کے امین ہیں وہ موجودہ انقلابی صدی کو جانتے ضرور ہیں لیکن انھوں نے اس کے تغیرات کو اور اس کے اثرات کو اپنے فن میں داخل ہونے نہیں دیا ہے وہ اپنی شاعری کے خالص پن کو اور اپنے اظہار کی اصلیت کو منفی کثافتوں" سے بچا لائے ہیں۔ فارسی کی محبت نے عمر خیام کو اور غالب کو ان سے بہت قریب رکھا ہے میر اور اقبال ان کے پسندیدہ شاعروں میں ہے ہیں اور ان سب کے رنگ صبا صاحب کے طرزِ احساس میں اس طرح سمٹے ہوئے ہیں جیسے آئینے میں عکس سمٹ جاتے ہیں اور اس عکس میں جو چہرہ دکھائی دے رہا ہے وہ صبا اکبر آبادی کا اپنا چہرہ ہے۔

صبا صاحب کا عشق مجرّد علم کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی کیفیات کو اظہار میں لاتا ہے

کہ جو چراغ ان کے گھر میں روشن ہیں وہ ان کے داخلی وجود میں بھی جل رہے ہیں انکی لسانی و تکنیکی مہارت سے کون انکار کرے گا ان کی ترجمہ نگاری نے فارسی اور اردو کے درمیانی فاصلے کو کم کیا ہے ان کی مرثیہ نویسی رسمی مرثیے کے بعد تخلیقی مرثیے کی ایک اہم کڑی ہے اور ان کی غزل روایتی اور جدید غزل کے درمیان تعمیمی محاکاتی اقدار کے توازن کی وہ اثباتی غزل ہے جس کی افادیت و اہمیت تہذیبی سالمیت کا استعارہ ہے اور بیسویں صدی میں دبستانِ اکبرآباد کے آخری نمائندہ شاعر ہونے کا جو اعزاز صبا صاحب نے پایا ہے وہ ادبی تاریخ میں اپنا ایک اہم حوالہ رکھتا ہے۔

دیوار پر دائرے

"میرے بزرگانِ خاندان اُردو اور فارسی دونوں زبان میں شعر کہنے کے عادی تھے۔ میں بھی دونوں زبانوں میں سخن سرائی کا عادی ہُوں۔ عادی کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے کیونکہ شعر گوئی واقعی اِس طرح ہمارے معاملاتِ شب و روز میں داخل تھی جس طرح زمینداری و جاگیرداری۔"

"شعر سے میرا رشتہ اکتسابی نہیں موروثی ہے میں نے ہوش کی آنکھیں نہیں اپنے سر کی آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش میں شاعری اور شعر کو ہی جلوہ گر پایا ہے۔ میری جسمانی اور ذہنی تربیت دیوان خانوں اور حویلیوں کے ماحول میں ہوئی ہے جہاں شطرنج کی بساط بچھتی تھی شعر کی بیاض کھلتی تھی حقّے کے دور چلتے تھے اور بیت بازی کے جلسے جمتے تھے شفیق حسن میرے جسمانی باپ ہی نہ تھے روحانی اور ذہنی آقا بھی تھے میرے جسم و جاں کے ایک ایک ذرّے پر اُن کا نقشِ وجود ثبت ہے والدِ مرحوم بیک وقت دو دنیاؤں میں زندگی بسر کرتے تھے عالمِ راز میں اور عالمِ مجاز میں۔ میں بھی اُن ہی کی طرح دو دنیاؤں کا شہری ہوں۔"

یہ تحریر رئیس امروہوی کی ہے جس کے ذریعے ہم اُن کی گزشتہ کی چند جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ رئیس امروہوی ہمارے درمیان موجود ہیں اور دو دنیاؤں کے مسافر ہیں اُن کی خارجی زندگی میں حویلی، حُقّہ، مشروبات اور ملاقاتی شریک ہیں اور باطنی دُنیا میں انھوں نے شعر و ادب کی شطرنج بچھا رکھی ہے جس پر اُن کی نثری تحریروں کے اور شاعری کے مہرے گردش کرتے رہتے ہیں تقریباً ساٹھ برس کی اس بازی گری میں جو تربیت اور جو مہارت انھوں نے حاصل کی ہے وہ کم ہی لوگوں کو حاصل ہوئی ہوگی۔ رئیس امروہوی میں لکھنے کی جو قوت موجود ہے اُن کی بنیادوں میں فارسی اُردو اور ہندی کی مطالعاتی روایات کا لہو دوڑ رہا ہے غالب اور اقبال اُن کی ریاضتوں میں خصوصیت کے ساتھ شریک ہیں انھوں نے غالب کی نفسیات اور عقلیت کو اپنے فکری اظہار کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی ہے اور اقبال کی طرح بیسویں صدی کے معروضی موضوعات کو علم و آگہی کی نظر سے دیکھا ہے انھوں نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے کہ

"میری فکر کے مایۂ خمیر نے بڑے پیچیدہ مادّوں سے ترکیب پائی ہے میں شعر کی پرانی روایتوں سے مطمئن نہیں ہوں اور مجھے اجتہاد کی وہ صورتیں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں جن کا تذکرہ بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے جہاں تک شعر کی میکانکی تخلیق کا تعلق ہے تو بغیر کسی پس و پیش کے اور بغیر کسی انکساری کے یہ حقیقت بیان کر دینی چاہیئے کہ اس میدان میں اردو کے کسی قادر البیان شاعر سے میں پسماندہ نہیں ہوں اور اُردو شاعری کی روایتوں پر میری گرفت اتنی ہی مضبوط ہے جتنی کسی صاحب کمال یا صاحبِ کلام کی ہو سکتی ہے۔"

رئیس امروہوی نے اس حاکمیت کو اپنی تخلیقات سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے اس کے علاوہ ان کے نام کوئی ایک لاکھ خطوط آ چکے ہیں جن کے جوابات انہوں نے خود لکھے ہیں اور کوئی سولہ برس پہلے سات اہم ادبی انجمنوں نے مل کر رئیس امروہوی کا جشن تاج پوشی منایا تھا۔ ٹیلی وژن ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے اُن کی شاعری اور ان کی تحریروں کی نشر و اشاعت کو تقریباً چالیس برس ہو گئے ہیں۔

رئیس امروہوی پاک و ہند برصغیر ہی میں شہرت نہیں رکھتے بلکہ عالمی سطح پر اُن کو پڑھا جاتا ہے حکومتِ پاکستان سے انہیں تمغۂ حسنِ خدمت بھی مل چکا ہے۔

رئیس امروہوی کی نثری تحریروں پر گفتگو تو پھر کبھی ہوگی لیکن اُن کے موضوعات میں نفسیات و مابعد النفسیات۔ عجائبِ نفس، جنسیات۔ توجیہات اور مراقبے۔ جنات اور ہپناٹزم عالمِ برزخ، عالمِ ارواح اور حاضراتِ ارواح۔ المیۂ مشرقی پاکستان طبیعات اور مابعد الطبیعات اور طنزیات وغیرہ شامل ہیں اس کے علاوہ کالموں اور مضامین میں بہت سے دوسرے معاملات بھی ہیں جن پر انھوں نے لکھا ہے۔ تنقید و تبصرہ بھی اُن کی نثری تحریروں میں شریک ہیں اس حوالے سے ایک بہت اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ انھوں نے تخلیق کو اور تخلیق کار کو تو ہمیشہ اہمیت دی ہے لیکن تنقید اور تنقید لکھنے والوں کو وہ غیر اہم سمجھتے رہے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

> "شعر فہمی کے باب میں جو موشگافیاں اور نکتہ طرازیاں آج کی جاتی ہیں میں اُن پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں شعر بھی کوئی سمجھنے سمجھانے کی چیز ہوتی ہے وہ تو سوچی سمجھی حقیقت کی حیثیت سے نازل ہوا کرتا ہے شعر بہر حال شعر ہے تنقید کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ فلاں اور فلاں وجوہ سے یہ کلام صنفِ شعر سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا درجہ یہ ہے حقیقت یہ ہے کہ ادبی تنقیدیں ہمیشہ میرے لیے اجنبی اور نامانوس رہی ہیں۔"

تنقید سے رئیس امروہوی کی اس اجنبیت کا مجھے کوئی نفسیاتی تجزیہ نہیں کرنا ہے مجھے تو صرف یہ خیال آرہا ہے کہ اگر انھوں نے نقاد کو ضروری نہیں سمجھا تو کیا نقاد بھی انھیں غیر اہم سمجھتے رہے ہیں۔ ہم تو رئیس امروہوی کی اسی کشادہ دلی کو برسوں سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں کے بارے میں بھی اور نئی نسل کے بارے میں بھی خوشگوار اور رجائی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔

رئیس امروہوی کی شاعری کی جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں اُن میں "الف" اور "پسِ غبار" تو بنیادی کتابیں ہیں اس کے علاوہ "حکایات" نے "ملبوسِ بہار" بحضرتِ یزداں۔ اور نجم السحر کو کچھ نئی

اور کچھ پرانی نظموں اور غزلوں کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ "آثار" میں ملکی قومی موضوعاتی نظمیں اور ترانے شامل ہیں اسی کتاب میں امیر خسرو اقبال، قائد ملت، جوش، اکبر الہ آبادی جگر، نیاز فتح پوری اور لاہور و کشمیر پر بھی نظمیں موجود ہیں۔ "انا من الحسین" میں رئیس امروہوی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بارے میں نعتیں اور اُن کے خاندان کے مختلف لوگوں کے بارے میں منقبتیں تحریر کی ہیں یہ کتاب رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے اُن کی عقیدتوں اور اُن کی محبتوں کو اظہار میں لاتی ہے رئیس امروہوی کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُن کا جو شعری اسلوب اور جو طرزِ اظہار ابتدائی شاعری میں بن گیا تھا اُن کی بنیادوں میں کبھی کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ انہوں نے پہلی غزل ۱۹۳۱ء میں لکھی تھی جس کا مطلع ہے کہ

قصہ نہ پوچھ مجھ سے شبِ انتظار کا
ہر اشک آئینہ ہے مرے حالِ زار کا

اس پہلے شعر کو ان کی کہی ہوئی آخری غزل سے ملا کر دیکھیں تو علم و آگہی کے فرق کو چھوڑ کر دونوں کے رنگ و آہنگ میں اختلاف کم ہی ملے گا۔ "الف" اور "پسِ غبار" کی غزلوں کو دیکھنے سے پہلے ہم اُن کی نظموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں کہ ان نظموں کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک حصّہ وہ ہے جو فکری و موضوعاتی علم و آگہی کو سامنے لاتا ہے اور دوسرے حصّے میں وہ رومانی اور ذاتی نظمیں شریک ہیں جو کم عمری کی شکستہ خواہشوں اور خوبصورت خوابوں کے اظہار کا حوالہ بنتی ہیں۔ "الف" کی نظموں میں عالمِ ناآفریدہ۔ انسان کا زوال شاعر کی ذات عہدِ نو کا سوال۔ جوہری عہد۔ وقت۔ عدم۔ اولین شعاع وغیرہ خوبصورت نظمیں ہیں اور "پسِ غبار" میں تقدیر اجرامِ فلکی اور وقت۔ قتیلِ آدم۔ قلم اور شمشیر۔ جبر مشیت حیاتِ فانی۔ مشاہدہ۔ جنتِ گم گشتہ اور جسارت جیسی متاثر کرنے والی نظمیں شامل ہیں ان میں سے چند نظموں کے مختصر اقتباسات دیکھئے۔

عجب تضادِ بشر ہے خوشا تضادِ بشر
ستارے جس کے لئے آسماں پہ چشمِ براہ

نشیبِ ارض پر اُس کو قدم قدم پہ خطر
عجب کہ خاک پہ درماندۂ نشیب و فراز
وہ جس کے زیرِ قدم جبرئیل کے شہپر
عجب کے فرشِ زمیں پر اسیرِ پست و بلند
وہ جس کی فکرِ رسا کا مقام گردوں پر
شگافِ سینۂ ذرّات میں سما جائے
وہی کہ جس میں غروبِ اِک جہانِ شمس و قمر
سوادِ ظلمتِ شب میں بھٹک کے رہ جائے
وہی کہ جس کی جبیں سے طلوعِ نورِ سحر (یہ کیا تضادِ بشر)

جی میں آتا ہے شہر میں گھوموں
اور کوئی مجھے نہ پہچانے
خوف و حیرت سے لوگ دھرائیں
میری جادوگری کے افسانے
یوں مرے جسم و جاں ہوں پُر اسرار
یوں میرے خال و خد ہوں انجانے
جیسے میرے وجود میں مدفون
گمشدہ مقبروں کے تہہ خانے
جیسے میرے غبار میں ملبوس
موت کی وادیوں کے ویرانے
جی میں آتا ہے شہر میں گھوموں
اور کوئی مجھے نہ پہچانے (عفریت اور دیوتا)

ان نظموں کے درمیان انسان کی خواہشوں کو اُس کی مجبوریوں کو اور اُن کے تضادات کو لکھا گیا ہے رئیس امروہوی کی نظموں میں انسان ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد وجود کی تمام قوسیں اور عدم کے تمام دائرے بنتے بگڑتے دکھائی دیتے ہیں اُن کی نظموں کے موضوعات بہت کشادہ ہیں جو تظیں اُن کا داخلی حوالہ اور ذاتی تجربہ بنی ہیں ان میں گستاخ حکایات۔ اے انجمن آرائے جان من۔ مجھے گیا۔ آ میرے چاند۔ کوچۂ محبوب اور بجارت میں متاثر کرنے کے کئی امکانات موجود ہیں۔ رئیس امروہوی جانِ من کی شکایات کو قبول کرتے ہیں کہ موجودہ شاعری میں پہلی جیسی سچائیاں اور محبتیں باقی نہیں ہیں وہ انداز تبدیل ہو گئے ہیں جو روح و وجدان کو زندہ کر دیتے تھے وہ رعنائی آواز اور وہ شناسائی خیال گم ہو گئی ہے جو جسم و جاں کو آسودہ کرنے کا ہنر جانتی تھی اس کا سبب شاید یہی ہے کہ دنیا کو خوابوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ خواب گاہیں بند ہو چکی ہیں اور تجربہ گاہوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ایسے کالے موسموں میں رئیس امروہوی کی آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ

رات تاریک ہے اے شمعِ شبستانِ جمال
تیرے جلووں سے نگاہوں کو چراغاں کر دوں
آج تو وقت کی رفتار کو دے دوں میں شکست
آج تو نظمِ مشیت کو پریشاں کر دوں
گل سے پہلے ترے رخساروں کو دوں حکمِ شگفت
صبح سے قبل تجھے چاک گریباں کر دوں
چوم کر تیرے خد و خال کو اے جانِ بہار
آ کہ سر تا بہ قدم تجھ کو گلستاں کر دوں (آ میرے چاند)

ان پر گفتگو سے پہلے ایک اور اہم نظم دیکھ لیجئے۔

میں نے ایک بار جوانی میں محبت کی تھی
اپنے ویرانے میں جنت کو بلا لایا تھا

گھر میں بازار کی زینت کو بلا لایا تھا
نوجوانی کی ضرورت کو بلا لایا تھا
راہ چلتی کسی عورت کو بلا لایا تھا
کثرتِ شوق سے تنگ آ کے یہ جرأت کی تھی
میں نے ایک بار جوانی میں محبت کی تھی (تجارت)

رئیس امروہوی کی یہ نظمیں اور اس طرح کی دوسری کئی نظمیں اپنے تہذیبی دائرے سے کٹ گئی ہیں ہم آپ یا خود رئیس امروہوی جوانی کی شدتوں کو کتنا ہی جواز میں پیش کریں لیکن ان نظموں میں اس زندگی کو اظہار میں لایا گیا ہے جس کا طرزِ احساس بھی بدلا ہوا ہے اور ان کی لفظیات و اسلوب میں بھی فرق آ گیا ہے کہ یہ نظمیں فارسی کے گراں آہنگ سے نکل کر بھاشا کے سادہ و سبک لفظوں سے قریب ہیں اور نوجوان لکھنے والوں کے اثرات کو اور انقلابی طرزِ احساس کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہیں اور ہمیں متاثر کرنے کی زیادہ قوت رکھتی ہیں۔

رئیس امروہوی کی غزل اپنے آہنگ اور اپنی لفظیات میں نظموں سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے کہ ان کی غزل داخلیت کے مقابلے میں معروضیت کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اس غزل میں بہت سے رنگ بہت سی پرچھائیاں اور بہت سی آوازیں مل کر ایک ایسی شکل اختیار کر گئی ہیں جن کے موضوعات کو اور اسالیب کو الگ الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کریں تو سب سے پہلے وہ غزلیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو ہجرت کو اور گزشتہ زندگی کے خوف کی بازیافت کو اظہار میں لاتی ہیں پہلے ہجرت کے حوالے سے ایسی چند مثالیں دیکھتے ہیں جن میں رئیس امروہوی اقلیمِ مشرق کے کسی شہر زرنگار کے شاہزادے ہیں اور فقیر بن کر شہرِ سبا سے آئے ہیں

دیارِ شاہدِ بلقیس ادا سے آیا ہوں
میں اک فقیر ہوں شہرِ سبا سے آیا ہوں
تمہارے غنچہ و گل سے غرض نہیں مجھ کو
اِدھر اشارۂ بادِ صبا سے آیا ہوں
مہجورِ ہر انجمن ہیں ہم لوگ
اپنے میں جلا وطن ہیں ہم لوگ

ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم
کوئی پکارتا ہے ہر ایک حادثے کے ساتھ
تخلیقِ کائناتِ دگر کر رہے ہیں ہم
ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیس
یہ کس کی زیست ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم
دستِ غربت کی ہے آوارہ بگولوں کو تلاش
آخر ان خانہ بدوشوں کو وطن بھی چاہیئے
اف یہ سناٹا کہ اپنی روح سے ہوں ہم کلام
ایسے سناٹے میں کوئی ہم سخن بھی چاہیئے

ہجرت کا سفر پاکستان کی تاریخ میں ایک زندہ صداقت کی طرح ہے اور گذشتہ چالیس برسوں کے شعر و ادب میں اس کی بہت سی آوازیں اور بہت سے چہرے ہمارے درمیان اترے ہیں رئیس امروہوی نے اس تجربے کو دوسروں سے الگ ہو کر بھی لکھا ہے کہ ان کے یہاں یہ سفر رقت آمیزی، خود رحمی یا انفعالی لہجے میں بیان نہیں ہوا بلکہ نئی زمین و آسماں کے درمیان آنے والوں کا تذکرہ اپنی اہمیتوں اور اپنے حوصلوں کی علامت بنا ہے۔ رئیس امروہوی کے یہاں ہجرتی سفر کے اظہار کی سطح ناصر کاظمی، منیر نیازی، محشر بدایونی اور عالمتاب تشنہ سے مختلف ہے کہ رئیس امروہوی نے ایک بڑی حویلی چھوڑ کر دوسری بڑی حویلی میں خود کو آباد کر لیا ہے اور وہ نئی زمین کی خوشبو اور اس کی حرارت سے اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ انہیں پرانی زمین اور وہاں کے موسم خوف بن کر ڈراتے رہتے ہیں رئیس امروہوی کی غزل میں ماضی کے خوف کی یہ بازیافت ایک منفرد نوعیت رکھتی ہے کہ عہدِ گذشتہ تو سب کے لئے خوبصورت اور خوشگوار ہوتا ہے لیکن رئیس امروہوی جب گزشتہ کو یاد کرتے ہیں تو خوف کی جنائی شکلیں اظہار میں آنے لگتی ہیں اس حوالے سے

اُن کے یہاں بہت سے شعر کہے گئے ہیں یہاں کچھ شعروں کا مطالعہ ضروری ہے۔

وہ سائیں سائیں کے کتنے عجیب سنّاٹے
وہ سنسنی وہ پُراسرار ایک عالم ہُو
وہ کھڑکیوں میں ہواؤں کی سرکشی تُندی
وہ بام و در پہ مسلّط جہنمی جَادو
وہ پیچ و تاب بگولوں کا میرے آنگن میں
چڑیلیں گھر میں گھس آتی ہیں کھول کر گیسو
وہ لُو کا زور کہ سارے کواڑ بجتے ہیں
کہ جیسے لشکرِ جنّات کا عمل ہر سو

یہ فقط شورش ہوا تو نہیں
کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں
ذہن پر ایک کھردری سی لکیر
کھنکھجورے کا راستہ تو نہیں
نوک ہر خار و خس ہے خوں آلود
روح صحرا برہنہ پا تو نہیں
پیڑوں کے گھنے مہیب سائے
یہ کون ہے مجھ پر حملہ آور
پتّوں میں جھپک رہی ہیں آنکھیں
شاخوں پر چمک رہے ہیں خنجر
یہ کون قریب آ رہا ہے
خود میرے ہی نقشِ پا پہ چل کر

اس طرح کی ایک بڑی تعداد رئیس امروہوی کی غزل میں موجود ہے جو اُن کے کسی گذشتہ خوف کو ظاہر کرتی ہے اس حوالے سے ان کی ایک اہم غزل ہے کہ

گرد میں اڑ رہے ہیں احساسات
دھیمے دھیمے برس رہی ہے رات
ہائے ماضی کی دلنشیں یادیں
ہائے خونخوار بھیڑیوں کی بارات
چیونٹیاں جیسے ذہن پر رینگیں
اُف یہ میرے لطیف احساسات
دفعتاً کس نے قہقہہ مارا
یہ اندھیرے میں کون ہے مرے ساتھ
کون آیا مرے تعاقب میں
وہی فکر و خیال کے جنّات
بھوت بن کر مجھے ڈراتے ہیں

میری ناآفریدہ تخلیقات

ایسا لگتا ہے کہ یہ خوف اور مافوق الفطرت طرزِ احساس موجودہ لمحے سے پیدا ہوا ہے لیکن اس کے حوالے سے انسانی نفسیات کی ایک ضرورت سامنے آتی ہے ہم لوگوں میں ایسے لوگ کچھ کم نہیں ہیں جو اپنے پوشیدہ خوابوں اور خرابوں کی بازیافت کے لئے فکری یا عملی راستوں سے گزرتے رہتے ہیں۔ رئیس امروہوی نے بھی شاعری میں اپنے ماضی کو تلاش کرکے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ذات کی داخلی سیاحت کے پسِ منظر اور پیش منظر کھول دیئے ہیں وہ سورج کے سائبان میں بیٹھ کر جب کسی کبوتر کو منڈیر پر رقص کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اُن کے دل پر ایک دیوار سی گرنے لگتی ہے پرندہ شاخ پر خاموش رہتا ہے لیکن خود رئیس امروہوی کے اندر کوئی ماضی کے دفتر الٹنے لگتا ہے وہ خیال کی آندھیوں میں ڈوب کر کھوئے ہوئے راستوں کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں چراغِ افکار ہوں میری سمت آؤ کہ رات کے تہہ خانوں میں پرچھائیاں ٹکراتی ہیں اور آسمان پر چاند ستارے تھرانے لگتے ہیں کہ نگاہ و نظارہ کی آویزش اصل میں کبوتر اور باز کی جنگ ہے ایسی مبارزت طلب آنکھوں میں جب نیند اُتر آئے تو

وہ آنکھیں اُجاڑ بستیوں کے خواب کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔

کل رات کئی خواب پریشاں نظر آئے
جو شہر کہ آباد تھے ویراں نظر آئے
جس گھر میں فرشتوں کی ضیا تھی اُس میں
ارواحِ خبیثہ کے چراغاں نظر آئے

غزل میں عشق ایک بنیادی تصوّر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کے رنگ و آہنگ میں یکسانیت کبھی نہیں رہی ہے رئیس امروہوی کی غزل کا بیشتر وجود خارجی صداقتوں کی گواہی دیتا ہے ذاتی تجربوں کے حوالے سے اُن کی غزل میں عشق کے منظر کھلتے تو ہیں مگر کم کھلتے ہیں اور ان منظروں کا موسم ستاروں کی آسودہ چھاؤں اور مہتابیوں کے خوبصورت اُجالے نہیں رکھتا ہے رئیس امروہوی کے عشقیہ عکس دکھی تجربوں کے بگولے اوڑھے ہوتے ہیں گہرے اور سچے زخم اپنے رنگوں میں اور اپنی روشنیوں میں زندہ ضرور ہیں لیکن جسم و جاں کو شکستہ کرتے ہیں تازگی کی خوشبو نہیں دیتے وہ حقیقت کو خواب بنا کر نہیں لکھتے بلکہ خواب کو حقیقت کی طرح بیان کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی موضوعیت بھی معروضیت کی شکلیں اختیار کرتی چلی جاتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جا نہ سکی
تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک
تمہیں شکستہ دلوں کا خیال ہی تو نہیں
خیال ہو تو کرم کے ہزار ہا پہلو
ہر شخص نے کسی نہ کسی سے نباہ دی
ہم کو تو دہر میں نہ کوئی بے وفا ملا
کہیں سے سازِ شکستہ کی پھر صدا آئی
بہت دنوں میں ایک آواز آشنا آئی

—

یارب غمِ عشق کیا بلا ہے
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے
شروعِ عشق میں شعلہ سا ایک بھڑکتا ہے
پھر اُس کے بعد کہیں روشنی نہیں ہوتی
دوریوں کی تباہیوں پہ نہ رو
ساری دنیا تباہ ہے پیارے
ہر اک ذرّے میں ہے تصویران کی
غبار آیا مرا اُڑ کر کہاں سے
یہ راہِ شوق تیری رفاقت میں کٹ گئی
اے دوست اور چند قدم قتلگاہ تک

محبتوں کی کتاب کو ادھوری کتاب کہنے والوں سے رئیس امروہوی اختلاف کرتے ہیں اور اس کتابِ محبت کی اکملیت کی تصدیق کرتے ہوئے عملی اور خیالی طور پر گمشدہ لوگوں کی بے احتیاطی کو سامنے لاتے ہیں کہ انھوں نے خود کچھ "اوراق" گرا دیئے ہیں یا لوگوں کی بے حسی نے کتابِ محبت کو پڑھنا ہی ترک کر دیا ہے۔

رئیس امروہوی اپنی غزل کے ان اشعار میں عشق کو بہت قریب سے محسوس کرنے والوں کی طرح نظر آتے ہیں وہ تمام شب دروازۂ انتظار کو کھلا رکھتے ہیں اور کسی آواز کو سنتے رہتے ہیں اُن کا دل یوں لرزتا ہے جیسے شاخِ گل سے کوئی پرندہ پرواز کر گیا ہو وہ اس عشق کو کفر سے بدتر لکھتے ہیں جو ہمیں زندگی سچائی اور عقل تک نہ پہنچا سکے وہ بیابان گردن کر اُن کے پیراہن سے لپٹ جاتے ہیں جو اپنے طور پر بیابان بننے کی قوت نہیں رکھتے لیکن کسی پیرِ حکمت نے ان کو یہ بھی تعلیم کیا تھا کہ "گاہے گاہے ہوس گل بدناں لازم ہے"۔ اور اس طرح وہ عشق کو "شکوہ سرا" ہونے سے نہیں روکتے کہ آواز سے جدا ہو کر نغمہ مرجھاتا ہے لیکن ایسا نہیں ہو پایا ہے شاید اس کا سبب یہی ہے کہ وہ زندگی کو ٹوٹ انتہا پسند چیز نہیں سمجھتے اور عشق میں بھی احتیاط کو لازم رکھتے ہیں۔

میری آنکھیں تو محبت میں کبھی نم نہ ہوئیں
کون روتا ہے الٰہی میرے دل میں چھپ کر
ذکرِ غمِ جاناں میں بسر ہو تو کہاں تک
وہ عمر کہ فکرِ غمِ دنیا کے لئے ہے

یہاں رئیس امروہوی اپنے عشق کی نوعیت کو اظہار میں لاتے ہوئے اُس فیصلہ کن موڑ تک آتے ہیں جہاں غمِ دنیا غمِ جاناں سے بڑھ جاتا ہے۔ تاہم حسن کی بہت سی خوبصورت تصویریں اُن کی غزل میں اُترتی رہی ہیں۔ وہ دوست کی رفاقتوں کے تجربے کرتے ہیں اور زندگی کی کم مائیگیوں پر اور دونوں کے ادھورے پن پر سوچتے رہتے ہیں وہ اپنے چاہنے والے سے مل کر بھی یہی لکھتے ہیں کہ وہ ایک جوئے بے آب ہے اور میں ایک بے سایہ شجر ہوں لیکن انہیں خوبصورت بدن کے رنگ اچھے لگتے ہیں اور وہ اسے پیار بھی کرتے رہتے ہیں

اگر نقاب اُلٹ دے تو کیا قیامت ہو
وہ جانِ گل کہ کبھی رنگ ہے کبھی خوشبو
یوں لگا جیسے کہ بل کھا کے دھنک ٹوٹ گئی
اس نے وقفہ جو لیا ناز سے انگڑائی میں
اللہ رے جوشِ ناز کہ ملبوس رنگ و بو
اس گلبدن کے قامتِ زیبا پہ تنگ ہے
شعلۂ حسن کو کچھ بھا ہی گیا جامۂ رنگ
پھول اگر پھول نہ ہوتے تو شرارے ہوتے
گِلہ نہ کر جو گلے لگ کے پیار کرتا ہوں
ترے بدن کا یہی اقتضا ہے کیا کہئے

رئیس امروہوی دل کی سرزمین سے سرسری گذرنے والوں کو روکتے ہیں اور کہتے کہ یہ وہ زمین ہے جو آسمانوں سے آئی ہے لیکن وہ خود "غمِ دو جہاں" میں ڈوب جاتے ہیں اور بے کراں سے مل کر بے کراں بننے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنی ذات کو مکان و زماں

سمجھتے ہیں اور باہر کے مکان و زمان میں غرق ہونے کا المیہ دیکھتے ہیں وہ خود اپنی "خاکسترِ جاں" میں یوں دفن رہتے ہیں جس طرح کوئی سرمایہ کسی خرابے میں پوشیدہ رہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے حصار میں اندھیری رات بھیانک کھنڈر اور مہیب موسم ہیں اور وہ ابد کے سیاہ خانوں میں زنجیر ہیں۔ رئیس امروہوی فرد ہو کر اجتماع تک آتے ہیں اور انسان کی موجودہ سیاسی و سماجی جبریہ پرچھائیوں کو اپنی ذات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آدمی کی تخلیق نغمے سے ہوئی تھی لیکن صرف آواز بن گیا ہے وہ ملتوں کے اختلاف اور دیر و کعبہ کے تعصبات سے پیوند نہیں رکھتے دوسروں کے زخم ان کے اپنے بدن سے اظہار پاتے ہیں انجم اعظمی نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے

"جب میں اپنے اندر اس آدمی کی جھلک پاتا ہوں جو ابدی ہے تو مجھے اپنی ذات میں ایک پورا معاشرہ آباد نظر آتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے جسم و جاں سے نکال کر آباد کر دوں۔"

رئیس امروہوی کہتے ہیں کہ

گرا ہے شاخِ گل سے ایک پتّا
کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے
کانٹوں سے فگار انگلیاں ہیں
ملبوسِ بہار سی رہا ہوں

ہمارے سامنے ان کے ایسے شعروں کی تعداد بہت ہے جو ہماری مشترک آواز کا اشعار ہیں رئیس امروہوی اپنی شاعری کی اس سمت میں تنہا نہیں ہیں بلکہ ایک جلوس دل فگاروں کا اور ایک ہجوم شکستہ بدنوں کا بھی اُن کے ساتھ ہے اور کہہ رہا ہے کہ

رہِ طلب میں مرے پیش رو جو چھوڑ گئے
برہنہ پا انہیں کانٹوں پہ چل رہا ہوں میں
مرے فریب نہ آ اے بہشتِ بے خبری
خود آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں
میں اُن کو بھول کر اپنی تلاش میں گم ہوں
یہ وہ مقام طلب ہے جہاں خرد نہ جنوں

اپنی رگ جاں پہ جی رہا ہوں
عفریت ہوں خون پی رہا ہوں
اللہ کے قرب کے علاوہ
ابلیس کے ساتھ بھی رہا ہوں
میں جو تنہا رہ طلب میں چلا
میرا سایہ مرے عقب میں چلا
نہیں، کھلتا کہ کون شخص ہوں میں
اور کس شخص کی طلب میں چلا
اپنے کو تلاش کر رہا ہوں
اپنی ہی طلب سے ڈر رہا ہوں
تم لوگ ہو آندھیوں کی زد میں
میں محبط ہوا سے مر رہا ہوں
دیوار پہ دائرے ہیں کیسے
یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں

کائنات سے ذات کی سمت پلٹ کر آنا اور باہر کی پرچھائیوں میں اپنی تلاش کی خواہش کرنا شاید سب سے بڑی صداقت کو پالنے کی خواہش ہے اس سفر میں باہر کے تمام راستے اور خارج کے تمام تجربے انسان کے باطن کی طرف ہی جاتے ہیں رئیس امروہوی اپنی اس غزل میں دنیا کے کھیل سے گذر کر سچ بولنے کی صلیب تک تو آ گئے ہیں لیکن جمال سے زیادہ جلال کا رنگ دعا بن کر ان کے زخمی ہاتھوں سے بلند ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ اس پورے عہد کو اور اس کے زمین و آسمان کو بدلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں وہ ایک ایسی دعا مانگتے ہیں جس کی عملی صداقت کشتی نوح پر لکھی ہوئی تھی۔

سیاہ ہے دل گیتی سیاہ تر ہو جائے
خدا کرے کہ ہر اک شام بے سحر ہو جائے

کچھ اس روش سے چلے باد برگ ریز خزاں
کہ دُور تک صفِ اشجار بے ثمر ہو جائے
بجائے رنگ رگِ غنچہ سے لہو ٹپکے
کھلے جو پھول تو ہر برگِ گل شرر ہو جائے
بقدرِ یک دو نفس بھی گراں ہے زحمتِ زیست
حیات نوعِ بشر اور مختصر ہو جائے

رئیس امروہوی کی اس نظم کی خارجی پرت منفی اسلوب میں سامنے لائی گئی ہے لیکن اس کی تمام داخلی معنویت اثبات کی علامت ہے یہ نظم اپنے تاثر میں اور اپنی سچائی کے اظہار میں بہت متاثر کرنے والی نظم ہے میں اس نظم کو رئیس امروہوی کی بہترین نظموں میں رکھتا ہوں کہ اس کی تجرباتی فکری سطح کو تخلیقی ہنر کے ساتھ شعلۂ جسم و جاں سے ہم آمیز کر دیا گیا ہے اس نظم کا مرکز انسان کے بگڑے ہوئے چہروں کو اور بگاڑ کر نئے چہرے بنانے کی طلب سے تعلق رکھتا ہے اس حوالے سے براہِ راست لکھے ہوئے چند شعر اور دیکھئے۔

ابھی تک آفرینش کا لبادہ
بقدرِ قامتِ آدم نہیں ہے
عروجِ نسلِ آدم ہو رہا ہے
وقارِ آدمی کم ہو رہا ہے
آدمی کی تلاش میں ہے خُدا
آدمی کو خُدا نہیں ملتا
تخریبِ دو عالم کا سبب بن کے رہے گی
وہ جنگ کہ جاری ہے بشر اور خدا میں
کچھ ہے تو تیرگی ہے تجلّی کی رازداں
یزداں کے دل کی بات فقط اہرمن سے پوچھ

اہرمن اور یزداں کا رشتہ انسانی تاریخ سے بہت پہلے وجود میں آیا تھا۔ زمین، خلا، وقت اور آسمان کے درمیان جس چیز نے تاریخ کو پیدا کیا ہے وہ انسانی جستجو ہے جو جامد زندگی کو حرکی اور بجھے ہوئے وجود کو شعلۂ جاں بناتی ہے۔ تاریخ وقت کے ایک تصور اور روایت کے ایک تسلسل کا نام ہے روایت کے اس تسلسل کا قیام انسانوں کے تجربات کی صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے روایت انسانوں کو نئے تجربات کی طرف لے جاتی ہے اور تجربہ ہی اس روایت کو زندہ رکھتا ہے۔ گزشتہ اور موجود جہاں پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں وہیں سے دروازۂ آئندگاں کھلتا ہے اور انسانی تاریخ کو ارتقا مل جاتا ہے زندگی کا سارا سفر ارتقا کی داستان ہے انسان کا عمل انفرادی ہو یا اجتماعی دونوں ہی جدلیاتی ہیں۔ زمانہ در زمانہ اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کے رنگ و آہنگ کی آگہی سے تاریخی شعور وجود میں آتا ہے زندگی بھی وقت کی طرح اپنے تسلسل میں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے بہت سی دنیائیں وجود سے عدم تک پہنچ چکی ہیں بہت سے خواب زندہ ہو رہے ہیں اور بہت سے نئے انسان ابھی آنے والے ہیں ہمارا تاریخی شعور تو یہی ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے ہم اسے اپنے عہد اور اپنی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کریں اسی کوشش کو روحانی، مادی اور تجرباتی آفاقیت بھی کہتے ہیں۔ رئیس امروہوی کا اپنا تاریخی شعور نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں بھی سامنے آیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

گماں نہ کر کہ زمانہ کبھی نیا ہوگا
یہی جو ہے یہی ہوگا یہی رہا ہوگا
جو نئی دنیا ابھی تخلیق کی منزل میں ہے
اس کا کرب آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے
زمانہ صدیوں کی گردشوں میں جنھیں بمشکل سمجھ سکے گا
سنا ہے اس عہد کے لبوں پر کچھ ایسے نازک مقام بھی ہیں
جو عہد تازہ کے منتظر ہیں وہ کاش یہ حادثہ بھی دیکھیں
کہ عصر حاضر سسک رہا ہے مگر کوئی نوحہ خواں نہیں ہے

خدا جانے یہ کس نے لکھ دیا ہے باب زنداں پر
یہاں تو صرف وہ جیتے ہیں جو مر کر نکلتے ہیں
پڑھے کیونکر کوئی اس دفتر تہذیب انساں کو
ورق اکثر کتابوں کے لہو میں تر نکلتے ہیں
شگافِ سنگ سے اُبھرا ہے لالۂ کہسار
یہ کوہکن کا کوئی زخم خونچکاں تو نہیں
شمیم گُلِ قفس گل سے کر بھی جا پرواز
سُبک روی ہو تو عزمِ سفر ضروری ہے

رئیس امروہوی بہار اور خزاں دونوں ہی میں تازگی دیکھنا چاہتے ہیں لیکن بہار کی روشنیوں کو برق انگنی اور شعلہ و شرار کی میزان پر رکھنا نہیں چاہتے طنز کی شعاعیں اُتر آتی ہیں انہیں اپنا عہد اور اپنے لوگ جدّتِ تخلیق سے گریزاں دکھائی دیتے ہیں وہ اپنے اس گمان کو یقین کے امکان تک بھی پہنچاتے رہے ہیں کہ

خلوتِ غیب میں نقاشِ ازل سے کہہ دو
صرف تخلیق علاجِ غمِ تنہائی ہے

انجم اعظمی نے لکھا ہے کہ

"ادب ایک کلّی حقیقت ہے جس میں انسان کے خارج و باطن ایک ہو جاتے ہیں اور جس طرح انسان خارجی حقائق سے رشتہ جوڑ کر اپنے وجود کی تکمیل کرتا ہے اسی طرح انسانی تخیل سارے علوم کی دریافتوں کو اپنے اندر سمو کر ایک ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ شعر و ادب کے معیار کی بنیاد ایسے انسانی جذبات پر ہوتی ہے جن کی تربیت زندگی کے گہرے شعور نے کی ہو۔"

شعر و ادب کے حوالے سے تخلیق کے نئے پن کو رئیس امروہوی نے کچھ اس طرح سمجھا ہے کہ

"جدید یا جدید تر شاعری کو لیجئے ردیف قافیہ کی قید سے آزاد اور تسلسلِ مفاہیم و معنی کی حدود سے ماورا ہے اس قسم کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش تا حال

جاری ہیں اور بجانے کب تک جاری رہے گی مجھے جدید تر شاعری میں خواہ آپ
اُسے علامتی کہیں یا تجریدی کوئی عجوبہ پن نظر نہیں آتا میں نے بچپن میں
ایسی بہت سی مُرصع مسجع اور پر شکوہ نظمیں سنی ہیں جن میں الفاظ کو بڑی
دروبست سے کھپایا اور معنی کو تہہ در تہہ پردے میں چھپایا جاتا تھا علم بیان
میں شعر کے اسی صنف اور سخن کی اس ترکیب کو معمّہ اور چیستان کہتے
ہیں فارسی شاعری میں بدر چاچ اِسی معمہ گوئی کے لئے مشہور تھے میں نے کبھی
کسی اسلوبِ شعر سے کراہیت محسوس نہیں کی دوآبۂ گنگ وجمن کی چار
بیتوں سے لے کر شاہ نامہ کی داستانوں تک زہر عشق سے لے کر مثنوی مولانا
روم کی حکایتوں تک بلکہ جعفر زٹلی کے زٹل قافیوں اور جان صاحب کی ریختیوں
سے لے کر مومن اور غالب کی غزلوں اور انیس و دبیر کے مرثیوں تک فکر و ابلاغ
کے جتنے نمونے ہو سکتے ہیں میں نے انھیں بکشادہ پیشانی قبول کیا ہے اور حسبِ توفیق
ہر اندازِ سخن سے لطف اٹھایا ہے شاعری نئی سے نئی ہو یا پرانی سے پرانی
مجھے ہر لباس میں اچھی لگتی ہے۔"

رئیس امروہوی کی اس تحریر سے یہ بات تو سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ اپنے اندر نئی چیزوں
کی قبولیت رکھتے ہیں اور اپنے انداز میں اسے اپناتے بھی ہیں لیکن جدید شعر و ادب کا اور
جدیدیت کا جو تصوّر وہ رکھتے ہیں وہ قدیم ہے کہ جدید تحریروں کے معنی صرف نیا اور تازہ
لکھنے کے نہیں بلکہ اُن مسائل کو اور اُن تغیرات کو اپنے طرزِ احساس میں شامل کرنے کے
ہیں جو خصوصیت سے بیسویں صدی کے تاریخی شعور کا حصّہ بنے ہیں پچھلی گفتگو میں ہم رئیس
امروہوی کی شاعری میں اُس ایک اہم رجحان کی نشاندہی کر چکے ہیں جس میں گزرے ہوئے
وقت کو اپنے موجودہ لمحے سے جوڑ کر زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو حال میں ماضی کو
بازیافت کر لینے کی ایک کوشش ہے اس کے برعکس رئیس امروہوی کی غزل میں ایک ایسا
رویّہ بھی دیکھنے میں آتا ہے جو لمحۂ موجود کو اپنے گزشتہ سے جوڑنے کا عمل کرتا ہے۔ اس بات
کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ رئیس امروہوی کی کئی غزلوں میں سیاسی و سماجی عملیات کو

طنزیہ لب ولہجہ دے کر لکھا گیا ہے کہ شامِ غم کے درمیان اڑتا ہوا غبار فروغِ جاں کا استعارہ بھی نہیں ہے اور اس کے عقب میں کسی تازہ کارواں کے آنے کی خبر بھی نہیں ہے بلکہ کالی رات گہری ہو گئی ہے اور سناٹوں کی دہشت اپنی آوازوں کو اس پار تک بچھاتی چلی جا رہی ہے

کیسی نجات مل نہ سکے گی پناہ تک
اب تیر آ رہے ہیں مری خیمہ گاہ تک
دیدنی ہے بہار کا منظر: زہر چھڑکا گیا درختوں پر
چیل کوؤں کو تکتے رہیے: چاند تاروں سے تھک گئی ہے نظر
بُن رہے ہیں عروسِ گل کا کفن: مگسِ برگ رشتۂ شجر
کون میرے لئے ہے شب بیدار: کیوں برستے ہیں رات بھر پتھر
جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں: وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں
سنا ہر بار میرا کلمۂ حق: مگر ہر بار ٹھکرایا گیا ہوں
جہاں ہے رسم قتلِ انبیاؑ کی: وہاں مبعوث فرمایا گیا ہوں
ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو: لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں

ہم نے یہاں تک رئیس امروہوی کے مرکزی موضوعات کو اور اُن کے اپنے اسالیب کو دیکھ لیا ہے ہماری کلاسیکی شاعری میں صوفی ازم کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے کہ سب ہی شاعروں نے کہیں نہ کہیں تصوّف کو برتا ہے یہ اور بات کہ خواجہ میر درد جیسا صوفی شاعر اردو میں کوئی اور نہیں ہو سکا۔ رئیس امروہوی کے یہاں بھی اس لہر کی پیاس سی ملتی ہے۔

پیارے سب کچھ تیرے اندر بول و مادم مست قلندر
بول و مادم مست قلندر بول و مادم مست قلندر
ذرّہ صحرا پتّا جنگل دانہ کھیتی بجلی بادل
مانجھی ناؤ لہر سمندر بول و مادم مست قلندر
اونٹ الاؤ ریت اندھیرے اور ملنگوں کے یہ ڈیرے
بول و مادم مست قلندر بول و مادم مست قلندر

اے دل شریک طائفۂ وجد و حال ہو
پیالے یہ عیب ہے تو بحدِّ کمال ہو
شبلی و بایزید و گرو نانک و کبیر
ہنگامۂ جلال میں رقصِ جمال ہو
سبکی زباں پہ مست قلندر ہو دم بدم
پھر اس کے بعد رات میں ڈٹ کر دھمال ہو

یہاں رقص کرنے اور گم ہو جانے کی جو صورت ہے وہ انفعالی یا تنوطی نہیں ہے بلکہ حرکی اور عملی ہے اور وہ ان تصوّرات کو طلسمِ خیال میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے ہیں کہ اس کا رشتہ شاہ لطیف سے اور سندھ کی مثالی روایتی محبتوں سے جُڑا ہوا ہے رئیس امروہوی نے اس حوالے سے کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن جہاں جہاں یہ کیفیتیں موجود ہیں وہ ہمیں اندر سے تازہ کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

فارسی اور اُردو کی پیوند کاری کا آغاز امیر خسرو نے کیا تھا اور درمیان میں چند لوگوں نے اس روایت میں بکھنے کی شوقیہ کوششیں ضرور کی ہیں مگر وہ آگے نہیں بڑھ سکیں، رئیس امروہوی کے یہاں بھی یہ روایت ملتی ہے اور پہیلیوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ اس حوالے سے نظر آتا ہے مختصر مثالیں دیکھئے۔

میں نے پوچھا کہ ہجر کے آنسو
گفت زہرے لذیذ تر از قند
میں نے پوچھا کہ سرگذشتِ قدیم
گفت خوابیست یا خیالے چند
میں نے پوچھا کہ رختِ جاں تو کہا
یک لباسِ کثیف و صد پیوند
میں نے پوچھا کہ خانوادۂ قیس
گفت قومے ضعیف و نزار و نژند

من نگر جس کی جوت سے روشن
اے سکھی چاند نا سکھی چندن
اے سکھی تیری آنکھ اور آنسو
نا سکھی قطرہ ہائے گنگ و جمن
کون ٹیڑھا ہے یہ پہیلی بوجھ
اے سکھی ناچ نا سکھی آنگن

اب تک ہم نے رئیس امروہوی کی شخصیت کے اور اُن کی شاعری کے بنیادی مرکزوں کو تلاش کیا ہے لیکن اُن کے فکری و علمی تاریخی و ادبی اور موضوعاتی اور بیانیہ اظہار کا تکمیلی اندازہ کرنا کچھ سہل نہیں ہے کہ انہوں نے انسان کے معروضی و موضوعی اور پیچ در پیچ مسائل کو اتنے پھیلے ہوئے اور اتنے بکھرے ہوئے پس منظروں اور پیش منظروں میں لکھنا چاہا ہے، اور اس حوالے سے انھوں نے شعور سے لاشعور تک جو سفر کیا ہے اور علم و عمل کی اور خیال و آگہی کی جتنی جہتیں اختیار کی ہیں اُن کا تنوع اور اُن کی رنگا رنگی ہمارے عہد کے کسی دوسرے لکھنے والے کے یہاں نہیں ہے۔

رئیس امروہوی نے باقاعدہ کسی فلسفے یا کسی خصوصی نظریئے کی تبلیغ نہیں کی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اپنے داخلی اور ذاتی تجربوں سے زیادہ علم و فکر کی روایت کو اور غمِ عشق سے زیادہ غمِ جہاں کو اور اس کی افادیت کو اظہار میں لائے ہیں اُن کے یہاں آدمی ایک خیال کی صورت نہیں ہے بلکہ خیال خود آدمی بن گیا ہے۔ اُن کے سوچنے اور لکھنے کا انداز غیر مرئی اور تجرید کو تجسیم کرنا چاہتا ہے انھوں نے ہیئت کا کبھی کوئی تجربہ نہیں کیا ان کے یہاں نئی علامت یا جدید امیجری بھی نہیں ہے لیکن اساطیر سے کام لینے کا کلاسیکی طرزِ اظہار اُن کی شاعری میں ضرور نظر آتا ہے۔ رئیس امروہوی کی اردو شاعری پر فارسی شاعری کے گہرے عکس ثبت ہیں لیکن وہ جہاں فارسیت کے نامانوس رنگ سے باہر آئے ہیں وہاں کی شاعری میں متاثر کرنے کی کیفیت اور اپنی مٹی سے ہم آہنگی اور ہمارے عہد کی سائیکی سے ہم کناری کا احساس بڑھ گیا ہے رئیس امروہوی نے اپنے نکتہ چینوں میں ناقدریوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن اپنی

ناقدریوں کا سبب جاننے کے بجائے اس بات سے اپنے آپ کو آسودہ کر لیا ہے کہ اُن کے شعر "اہلِ دل" کے سینوں میں اتر جاتے ہیں۔ وہ کبھی کم گو نہیں رہے وہ بڑے زود گو ہیں اُن کا نطق کبھی مجبولیت بالانفعالیت کا صید نہیں ہوا لیکن بہتر ہوتا کہ وہ اپنی غزل اور اپنی نظم دونوں ہی کو کامیابیوں کے ساتھ پوری طرح سمیٹ کر لکھتے اور اپنے ارتکاز کی اس اہمیت و انفرادیت تک جاتے جو تخلیقی دنیا کی ارتکازی اہمیت و انفرادیت کہی جاتی ہے ان کی شاعری کا خارجی وجود اقبال اور جوش جیسا ضرور ہے لیکن ان کے داخل میں اس تندی صہبا کی مرکزیت کو کچھ اور تیز و شدید ہونا چاہیئے جو آبگینے کو پگھلا دیتی ہے میں یہ بات شاعری کے اعلیٰ ترین معیارات کو سامنے رکھ کر کہہ سکا ہوں۔

رئیس امروہوی نے غزل اور نظم کے معنوی اور صوری اختلاف کو ختم کر کے دونوں کو ملانے کی کوشش بھی کی ہے لیکن ہمارے زیادہ تر پڑھنے والے نظموں میں خیال یا فکر کو اور غزلوں میں احساس اور جذبے کو دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ابھی تک نظم کو خارجی اور غزل کو داخلی اظہار سمجھتے ہیں۔ رئیس امروہوی کے نثری اور شعری موضوعات میں کوئی تضاد نہیں جو ان کی شخصیت کو دو لخت کرتا ہوا دکھائی دے بلکہ ان کی بہت سی غزلوں اور نظموں کی معنوی جہتیں ان کی نثری تحریروں سے مربوط ہیں جس کے مطالعہ سے ایک اہم ترین بات جو سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ رئیس امروہوی برصغیر کے تقسیم شدہ انسان کو اور اس کی وحدت کو ہمارے سامنے رکھنا چاہتے ہیں وہ منقسم لوگوں میں اپنی تہذیب اور ثقافت کے آثار دیکھتے ہیں اور موجودہ نسل تک اس کے شعور کو پہونچانا چاہتے ہیں ان کی نثر کی آگہی اور ان کی شاعری کا ارتعاش ہمارے عہد کے ایک ایسے ذہن کو مرتب کرتا ہے جو عقلیت پسند ہونے کے باوجود داخلی تجربوں کا اور تخلیقی اظہار کا بھی خواہش مند ہے۔

رئیس امروہوی کو بہت سے لوگ ایک اہم سیاسی سماجی اور انقلابی شخصیت کے طور پر بھی جانتے ہیں انھوں نے تخلیق کی بڑی قدروں کے ساتھ ساتھ دنیاداریوں کو بھی اہم سمجھا ہے انھوں نے روحانی و وجدانی کیفیات کے سامنے بدن اور مادی ضرورتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے وہ بہتر زندگی کے لئے بہتر نظامِ حکومت کو ضروری سمجھتے رہے ہیں۔

اگرچہ خود سرِ راہ طلب ہوں افتادہ
کسی عظیم مسافر کا راستا ہوں میں

یہاں تک جو باتیں کہی گئی ہیں اس میں انکار و افرار کی گنجائشیں نکل سکتی ہیں لیکن رئیس امروہوی کی قطعہ نگاری اور بیسویں صدی میں اس کی منفرد حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

جو ناسخ آثار کہن ہے وہ کتاب
بے خطرۂ تنسیخ لکھی ہے میں نے
آئینۂ امروز میں میرے قطعات
اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے

رئیس امروہوی کہتے ہیں کہ

"اصنافِ سخن میں اگرچہ مجھے غزل و نظم سے زیادہ دلچسپی بلکہ دل بستگی ہے مگر عجیب بات ہے کہ اردو دنیا میں میری شاعرانہ شناخت کا اہم حصہ وہ چار مصرعے ہیں جو تقریباً چالیس سال سے پیشہ ورانہ انداز میں لکھے جا رہے ہیں۔"

"تاریخ کا یہ جبر بھی عجیب ہے کہ غالب کو پسند فارسی شاعری ہو اور اُن کی شہرت اردو شاعری کے خانے میں ڈالی جائے۔ ناسخ بہتر شاعری کے لئے اصلاحِ زبان کا کام کریں تو شاعر ہی نہ رہ پائیں اور رئیس امروہوی غزل و نظم کو اپنی پہچان بنانا چاہیں تو ان کے پیشہ ورانہ قطعات ان کی شناخت ٹھہریں۔ ایسی بہت سی مثالیں لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان اپنی اپنی پسند و ناپسند یا اہمیت و کم اہمیت کے خیال سے پیدا ہوتی ہیں اور اس فطری رویّے کو بہت ہوشمندیوں کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

رئیس امروہوی کے لئے یہ اعزاز ہی کیا کم ہے کہ وہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے قطعہ نگار شاعر ہیں کہ رئیس امروہوی کے قطعات نے گذشتہ چالیس برسوں کی سماجی سیاسی و تاریخی واقعاتی انفرادی و اجتماعی تصویریں اتاری ہیں یہ قطعات پاکستان کی نظیہ

داستان بھی ہیں اور ہماری معاشرتی تاریخ بھی ہیں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں واقعات جو ہماری یادداشتوں میں گم ہیں وہ ان قطعات کے حوالے سے زندہ ہو جاتے ہیں ان گنت خارجی و باطنی جبر اور ان سے پیدا ہونے والے المیے جن کے اثرات ہمارے ذہنوں اور ہماری روحوں پر ثبت ہیں یہ قطعات ان کے امین ہیں اس کے علاوہ ان قطعات کے اظہار و اسلوب کے بہت سے رنگ و آہنگ اپنی سنجیدہ و خوشگوار اور اپنی طنزیہ مزاحیہ ادبی انفرادیت کو سمیٹے ہوئے زبان و بیان کی جو جدتیں اور جو نزاکتیں ان قطعات میں اپنی گوں ناگوں آوازوں میں بول رہی ہیں وہ اس عہد بے ہنراں میں تمثیل فن کا اعلامیہ ہیں رئیس امروہوی کے قطعات اور ان کے طویل ترین سلسلے اپنی طلسماتی حقیقت کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں کہ اگر رئیس امروہوی اور کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی یہ قطعات صحافتی و ادبی تاریخ میں انھیں زندہ رکھنے کے لئے بہت تھے۔

صبح نو ہم تو ترے ساتھ درخشاں ہوں گے
اور ہوں گے جو ہلاکِ شبِ ہجراں ہوں گے

لفظ تھے میرے آشنا

میں نے اُن کی نظم و نثر کی کتابیں پڑھیں اور اُن کی خود نوشت کو دیکھا تو مجھے احساس ہُوا کہ اُن کی شخصیت میں ایک ایسا گہرا عکس موجود ہے جو تہذیبی و ثقافتی انسان اور اعلیٰ اقدار کی بازیافت کرنا چاہتا ہے ان کی خود نوشت کے حوالے سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ موجود لمحے میں اکثر غائب رہتے ہیں مگر غائب لمحوں کو زندہ کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں شعوری صورتحال میں وہ ایک "بھلکڑ" اور کم گو نظر آتے ہیں اور لاشعور کی بازیافت کرتے ہوئے اُن میں لکھنے اور بولنے کی بڑی قوت پیدا ہو جاتی ہے کوئی تین برس کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی پرورش اُن کی پھوپھی نے اور ان کے والد مولوی احتشام الدین دہلوی نے کی تھی۔ مولوی احتشام الدین دہلوی کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملتا ہے وہ خود بھی اپنے عہد کے نامور عالم اور ادیب تھے جن کی بعض تصانیف "افسانۂ پدمنی" "مطالعۂ حافظ" اور "ترجمان الغیب" آج بھی علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اس کے علاوہ وہ ایک بہت اہم لغت ساز بھی تھے اس خود نوشت میں سوانح نگار نے اپنا نامۂ اعمال نہیں لکھا ہے بلکہ جستہ جستہ واقعات بیان کیے ہیں جس کے ذریعے بعض بہت سی دلچسپ باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں مثلاً وہ

سوٹ پہن کر سڑک پر نکلتے ہیں اور دوستوں کے چیلنج پر فقیر بن کر بھیک میں چونی مانگ لاتے ہیں ڈراما کرتے وقت زنانہ کپڑے پہن کر جنس کو تبدیل کر لیتے ہیں اُن کی ہم جولی جب ملک سے باہر نکلتی ہے تو وہ ایک خاتون کے ساتھ ایسے کلب میں جا بیٹھتے ہیں جو کلب مرد ہم جنسوں کا ہوتا ہے اور وہاں کوئی خاتون نہیں ہوتی اپنی ڈیڑھ سال کی عمر کی کہانیوں سے لے کر والد والدہ تک کی شیر خوارگی کی کہانیاں بیان کرتے چلے جاتے ہیں وہ گاندھی جی کی ہندی تقریروں کو جمع کرتے ہیں اور اُن میں عربی فارسی اور اُردو کے لفظوں کی طویل فہرست مرتب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گاندھی جی کو اُردو نہیں آتی تھی تو اُن کو یہ الفاظ کس نے سکھا دیئے تھے؟ اس طرح اُن کی یہ خود نوشت پڑھنے والوں کے درمیان خواب اور حقیقت کا ایک ایسا ذائقہ پیش کرتی ہے جو دلچسپ بھی لگتا ہے اور معلومات بھی پہنچاتا ہے لیکن ایک کمی کا احساس بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے اس خود نوشت میں اپنی علمی اور ادبی منظروں کو بہت حد تک نظر انداز کر دیا ہے جس کی وجہ سے اُن کی تخلیقی و لسانی مرکزوں سے پوری شناسائی نہیں ہو پاتی ہے یہ خود نوشت شان الحق حقی کی ہے جن کی تربیت گاہوں میں گورنمنٹ کالج لاہور، دہلی، پشاور، علی گڑھ کے نام شامل ہیں انہوں نے انگریزی میں ایم اے کیا اور شملہ، کلکتہ اور دہلی کی مختلف اشتہاری ایجنسیوں میں کام کرتے رہے پاکستان میں برٹش کونسل میں، محکمۂ مطبوعات و فلمسازی میں اور پاکستان ٹیلی وژن میں اہم ذمہ داریوں سے گزرے حقی صاحب کی ادبی اور قومی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انھیں ۱۹۶۹ء میں تمغائے قائد اعظم اور ۱۹۵۸ء میں ستارۂ امتیاز دیا ہے وہ خود کہتے ہیں کہ

"میں نے ادب کو کیریئر کبھی نہیں بنایا میری دفتری ذمہ داریاں بالکل غیر ادبی نوعیت کی رہی ہیں جن کی سبب مجھے علم و ادب کی خدمت کرنے کا وقت بہت کم مل سکا ہے۔"

لیکن اس کم وقت میں بھی انہوں نے اتنا کام کر دکھایا ہے کہ مثالی صورت رکھتا ہے اُن کی صحافتی زندگی کو دیکھئے تو آجکل (دہلی) ماہِ نو (کراچی) اور اُردو نامہ (کراچی) میں انہوں نے اعزازی کام کئے قومی زبان (کراچی) میں لسانیات پر بعض بڑے اہم مضمون لکھے جو مجموعے کی صورت میں ترتیب پا رہے ہیں اُن کی زیر ترتیب کتابوں میں آوارہ گرد کے (مزاحیہ مضامین)

شاخسانے (افسانوں کا مجموعہ) تنقیدی، اور لسانی مضامین کا مجموعہ شریک ہے "جواہر مالا" (جو ہندی، فارسی، عربی کے درمیان رائج بندشوں کو دور کرنے کی کوشش ہے) ان زیر ترتیب کتابوں کو دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ حقی صاحب کی علمی و ادبی جہتوں میں بڑا تنوع ہے بڑی ہمہ رنگی ہے ان کی مطبوعات میں خیابانِ پاک۔ نشیدِ حریت، صور اسرافیل، سہانے ترانے۔ نذرِ خسرو۔ یادش بخیر قہرِ عشق۔ درپن درپن۔ تارِ پیراہن۔ حرفِ دل رس۔ نکتۂ راز اور نقد و نگارش ہمارے سامنے ہیں ان کی کتابوں کی بنیاد تہذیبی روایات، ثقافتی اقدار اور تعلیمات و لسانیات کے تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر پر ہے اختر حسین رائے پوری نے حقی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ

"نثر و نظم پر انھیں یکساں قدرت ہے اور دہلی مرحوم کے روز مرّہ پر تو اُن سے بہتر عبور اب کسی کو نہیں بہ ایں ہمہ اُن کے ذہن کو جدید علوم کی آنچ گرماتی ہے اور وہ جس موضوع کی طرف بھی توجہ دیں اُسے منطق کے نور سے روشن کرتے ہیں اور حسنِ بیان کے پنکھے سے ہوا دیتے ہیں اُن کے ادبی ذوق اور علمی شغف کا مجھے مدّت سے اعتراف ہے۔"

سہانے ترانے میں حقی صاحب نے بچّوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں ہمارے یہاں بچّوں پر بہت کم لکھا گیا ہے تاہم محشر بدایونی، رئیس فروغ، شبنم رومانی اور شریف کمال عثمانی بچّوں کے لئے بڑی خوبصورت اور دلچسپ نظمیں لکھتے رہے ہیں حقی صاحب بھی اِس کارِ دشوار میں شریک ہیں۔ جمیل جالبی نے "سہانے ترانے" کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ان نظموں میں وہ سب کچھ ہے جو بچے پسند کرتے ہیں، دلچسپ کہانیاں بھی مشاہدات بھی، معلومات بھی اور چہلیں بھی تو تُو مَیں مَیں بھی اور لڑائی جھگڑا بھی ہنسی مذاق بھی اور دھینگا مُشتی بھی ان نظموں کو پڑھ کر میلے کا سماں بندھ جاتا ہے بہت عرصے بعد بچّوں کو ایسی اچھی نظمیں پڑھنے کو ملی ہیں۔"

"نذرِ خسرو" حقی صاحب کی ایک اہم کتاب ہے کہ اس میں انھوں نے کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں پیش کی ہیں۔ امیر خسرو نے ان اصناف کو ایجاد کیا تھا لیکن آنے والے شاعروں نے ان پر توجہ نہیں کی اور یہ اصناف تقریباً مردہ ہو گئیں۔ حقی صاحب نے ان کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی

ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ

"کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں کے بارے میں کیا لکھوں اس کو معیار بنا کر کبھی پرکھا نہیں گیا وہ تو تمام تر لطف لینے اور بوجھنے کی شے ہے کہہ مکرنی وہ ہے جو آدمی کو گدگداتی ہے بعض اوقات لطیف پیرائے میں اُس کے جنسی جذبے کو بلا ضرر طور پر ذرا ابھار کر اُس کے ذہن کو خوش اسلوبی کے ساتھ اُس طرف سے ہٹا دیتی ہے۔ اس قسم کی کہہ مکرنیاں سب سے پہلے ہندی میں امیر خسرو نے لکھی تھیں اب جو حقی" کو اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا تو یقین آیا کہ کوئی صنف کبھی فنا نہیں ہوتی پھر یہ کہ ان کہہ مکرنیوں میں سے بعض ایسی ہیں کہ خسرو کی کہہ مکرنیوں کے ساتھ پہلو مارتی ہیں اور چونکہ خسرو نقاشِ اوّل تھے اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان ہی کا جھنڈا بلند کیے ہوئے نظر آتی ہیں یہی حال پہیلیوں کا بھی ہے ایک سو ایک پہیلیاں انھوں نے ایسی نظم کی ہیں جو خاص طور پر اٹھتی ہوئی عمر کیلئے سرمایہ لطف مہیا کرتی رہیں گی۔"

حقی صاحب کی کچھ کہہ مکرنیاں دیکھئے۔

پہروں مجھ کو گود بٹھائے
چھوڑ چلوں تو بل بھر لائے
سب وہ بھلا دے جیکی چولھا
اے سکھی ساجن نا سکھی جھولا

پہروں ڈال رکھے گل بیاں
جیسے یہ ہی میرا سیاں
جب دیکھو چھاتی پہ سوار
اے سکھی ساجن نا سکھی ہار

انھوں نے کہہ مکرنیوں کو نئے عہد اور نئے تلازمات سے جوڑنے کی کوشش بھی کی ہے

پہروں بیٹھا سجا سجائے
سوانگ بھرے اور کتھا سنائے
تاکنے آئے پڑوس کی بیوی
اے سکھی ساجن ناسکھی ٹی وی

چال دہکتی پاؤں میں چکر
بھاگے بھاری بوجھ اٹھا کر
کتنوں ہی سے رکھے میل
اے سکھی ساجن ناسکھی ریل

ان کہہ مکرنیوں کے ساتھ چند پہیلیاں بھی دیکھتے چلئے جن کی بوجھیں بھی لکھی جاتی ہیں:

رحمت تجھ پر شوق کے پورے
وہ چت لیٹے اور تو گھورے (کتاب)
وہ رکھوالی کرنے والا
اُس کی نار کا میں رکھوالا (قفل)

چال چلن کی ایسی نیک
رکھتی ہے بس ساجن ایک
ساجن اُس کا پہرے دار
وہ نر اور یہ اُس کی نار (چابی)

وہ تو میرا پہنچا پکڑے
اب میں کروں کیا پردہ پوشی
آدھی رات کو چلتے چلتے
جوڑے ہاتھ کرے سرگوشی (گھڑی)

لنگڑا اُجلے فرش پہ ٹاپے
چھوڑتا جائے پاؤں کے چھاپے
دم دم جا کے پیوے پانی
ہو گئی پر یہ بات پرانی (قلم)

آنکھ اٹھاؤ دیکھو اوپر
اک پنچھی کے تین ہیں شہہ پر (پنکھا)

ان کہہ مکرنیوں میں اور پہیلیوں میں بیشتر ایسی ہیں جو عمومی زندگی کی چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اُن کے لکھنے میں ایک پاکیزہ جنسی رجحان کا احساس بھی ہوتا ہے جس کے سبب بڑوں کے لئے بھی دلچسپ اور خوشگوار چیز بن گئی ہیں۔

شاعری میں تاریخ نگاری بھی ایک روایتی صنف ہے جو ہمارے عہد میں بھی زندہ ہے رئیس امروہوی اور محشر بدایونی بہت اچھی تاریخیں نکالتے ہیں حقی صاحب نے بھی شاعروں ادیبوں اور دوستوں کے بچھڑ جانے پر اُن کی تاریخیں نکالی ہیں جسے "یادش بخیر" کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے یادش بخیر میں میراجی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔ جی اے آنا پنڈت کیفی دہلوی۔ اسرار الحق مجاز۔ رضا علی وحشت فیض احمد فیض، جگر مرادآبادی۔ مولوی عبدالحق امتیاز علی تاج۔ حفیظ ہوشیارپوری ممتاز حسن۔ جاں نثار اختر۔ افسر صدیقی امروہوی منظر اکبر کرنل مجید ملک، ابن انشا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ رازق الخیری، احسان دانش، فراق گورکھپوری جوش ملیح آبادی۔ اطہر نفیس۔ میر رسول بخش تالپور۔ ذہین شاہ تاجی اور سلیم احمد کے علاوہ بہت سی دوسری اہم شخصیتیں شامل ہیں اس کتابچہ کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ ان تمام مرحومین کے بارے میں مختصر تعارفی معلومات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

اُردو میں ترجمے کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی خود اُردو زبان ہے اور اس روایت نے ہر عہد اور ہر زمانے میں اپنے آپ کو تازہ رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے یہاں تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ دنیا کی زبانوں کے بہترین ترجمے بھی موجود ہیں۔ ترجمے ایک طرف ہماری زبان میں وسعت اور پھیلاؤ کا سبب بنتے ہیں تو دوسری طرف نئے اور تازہ اسالیب

بھی اُردو میں داخل ہوتے رہتے ہیں پھر اس کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں اور دوسری نسلوں کے مزاج سے اُن کی تاریخ سے اُن کی معاشرت سے اور ان کی تخلیقی و یکانکی اہمیتوں سے بھی اردو زبان نے استفادہ کیا ہے حقّی صاحب کو ترجمہ نگاری سے بڑی دلچسپی رہی ہے اُن کی دو اہم کتابیں قہر عشق اور "درپن درپن" اسی حوالے سے ہمارے سامنے آئی ہیں۔

"درپن درپن" میں جن مختلف زبانوں کے بہترین شاعروں کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے ان زبانوں میں انگریزی، عربی، فارسی، ہسپانوی، بنگالی، چینی، جرمنی، ترکی، سندھی، بلوچی، پنجابی پشتو اور ہندی شامل ہے۔ درپن درپن کے ترجموں میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ مشرقی و مغربی زبانوں کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی حقّی صاحب نے شریک کیا ہے ان ترجموں سے ایک طرف تو حقّی صاحب کی زبان دانی اور لسانی مہارتوں کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت اصل تخلیق کی روح کو اور اُس کے ایکسپریشن کو اپنے ترجمے میں کامیابی کے ساتھ اُتارنا چاہا ہے اس حوالے سے حقّی صاحب کی کتاب "قہر عشق" کو خاص اہمیت ملی ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "انطونی اور قلوپطرہ" کا یہ ترجمہ کئی برسوں میں مکمل ہوا ہے اور اس مشقت کو وہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی زندگیوں کو علم و ادب کے حوالے کر رکھا ہے۔ حقّی صاحب مشرقی تہذیب اور مشرقی روایات کے آدمی ہیں اور انھیں ہر وہ چیز متاثر کرتی ہے جس میں مشرقی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی ہو۔ اس ڈرامے کے ترجمے کا سبب بھی ان کی مشرقیت پسندی بنی ہے انہوں نے خود لکھا ہے کہ

> ترجمہ کے لئے اس ڈرامے کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں مشرقی فضا تھی قلوپطرہ کا کردار (جو پورے ڈرامے کی جان ہے) ایک مشرقی کردار ہے رومی لوگ جو اس ڈرامے میں آئے ہیں، اس تفریق کا گہرا احساس رکھتے ہیں قلوپطرہ کی سہیلی شارمین بھی اُس کی موت پر اُسے "جبین مشرق کا ستارہ" کہتی ہے جو ڈوب گیا ہے۔

انطونی و قلوپطرہ شیکسپیئر کا سب سے طویل ڈرامہ ہے اس میں پانچ ایکٹ اور کُل بیالیس سین ہیں ان میں سے بعض مختصر ہیں اور بعض بہت طویل ہیں بعض حصّے جو نثر میں تھے ان کا ترجمہ بھی نثر ہی میں کیا گیا ہے لہٰذا کوئی ڈھائی سو سطریں نثری مکالموں کی بھی

ہیں۔ شکسپیئر نثر کو یا تو غیر سنجیدہ مزاحیہ مکالموں کے لئے استعمال کرتا ہے یا بہت اہم پُرجوش مقامات کے لئے جہاں کسی غیر معمولی کیفیت کے اظہار کے لئے مخصوص اور منفرد آہنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرار حسین کا ایک اقتباس دیکھئے جو اس ڈرامے کے ترجمے کی اہمیت کے بارے میں

"حقی صاحب نے اس ڈرامے کی روح کو گرفتار کیا ہے اور مختلف مواقع کے لحاظ سے اپنے لہجے اور آہنگ میں لوچ پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے ڈرامے میں کتنے مختلف اور متنوع مواقع ہیں کہیں قلوپطرہ انطونی کا ذکر کرتے ہوئے یا انطونی اپنی محبت جتانے کے لئے دونوں حسن و محبت کا ایک مینار تعمیر کرتے ہیں کہیں چھوٹے کرداروں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ اور کہیں بڑے لوگوں کی زندگیوں کے کھوکھلے پن اور کمینے پن کا طنز اور حقارت سے اظہار کیا گیا ہے متنوں میں اتنے لہجے اور اتنے آہنگ پیدا کرنا اور شکسپیئر کے قدم بہ قدم تمام تقاضوں کو پورا کرنا حقی صاحب کا بڑا کارنامہ ہے۔ ترجمے میں مناسب الفاظ کی تلاش خود ایک بڑا بنیادی اور ابتدائی کام ہے ترجمے کے الفاظ یا عبارت اصل کی بھی ترجمانی کرتی ہے اور ترجمے کی زبان کے لحاظ سے بھی آہنگ سے خارج نہیں ہوتی ڈرامے میں تو یہ بات اور بھی ضروری ہو جاتی ہے حقی صاحب نے جس جس مقام پر اور جہاں جہاں اردو کا روزمرہ اور محاورہ استعمال کیا ہے اُسے اپنی نظم میں پیوند نہیں کیا ہے بلکہ پیوست کر دیا ہے انگریزی ترکیبات کا ترجمہ کرنے کے لئے اردو ترکیبیں ایجاد کی ہیں اور یہ بات اردو کی فطرت اور مزاج سے اُن کی پرانی اور گہری آشنائی کا ثبوت ہے۔"

مثنوی ہمارے یہاں بیانیہ نظم کی زبان ہے اس کا استعمال قصہ کہانیوں کے لئے ہوتا رہا ہے المیہ مثنوی کو ڈرامائی نظم کے موزوں اور مناسب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ بیان کے عنصر کو دبا کر اس میں عمل کو پیش کرنے اور مکالمے کی تنوع کی صلاحیت کو سمویا جائے اور حقی صاحب نے یہی کیا ہے انھوں نے قلوپطرہ کے محلات کی فضا اور شاگرد پیشہ کی بول چال

میں اُردو کا روزمرہ بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ انسانی فطرت کے بنیادی حقائق اور ہمہ گیر تاثر شکسپیئر کے یہاں ہر جگہ موجود ہے۔ انطونی قلوپطرہ ایک تاریخی رومان ہے جس میں ایک معروف نسوانی کردار کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے اور دوسری طرف ایک ایسے ممتاز سیاسی شخص کا زوال دکھایا گیا ہے جو قلوپطرہ کی محبت میں مبتلا ہو کر اقتدار کھو بیٹھتا ہے یہ ڈراما قلوپطرہ کی آخری اور سچی محبت کا افسانہ بھی ہے اور زمانے کے اٹل فیصلوں کی ایک تمثیل بھی ہے۔

حقی صاحب کا جو کچھ کام اب تک ہمارے سامنے آیا ہے اُس کی اساس زبان و بیان کی مہارت لسانی خدمات اور میکانکی و ترجمانی خواہشوں پر زیادہ ہے اسی حوالے سے انہوں نے ایک مشہور انگریزی اخبار میں اُردو کے مسائل کے بارے میں بہت سے خطوط لکھے ہیں جو مرتب ہو جائیں تو ایک کتاب کی شکل اختیار کر سکتے ہیں

حقی صاحب نے لغت سازی کے ذریعے زبان و بیان کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ پہلی نظر میں لغت کا کام بہت آسان بہت سہل نظر آتا ہے لیکن یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی تہذیب و ثقافت سے اپنی روایت سے اپنی اقدار سے اور اپنی زبان سے سچا تعلق رکھتے ہوں لغت کسی ایک شخص کے لئے مرتب نہیں کی جاتی بلکہ وہ آنے والی نسلوں کا ورثہ ہوتی ہے یا شعور لوگ لغات کے ایک ایک حرف کی سچائی کو اور اُس کی ظاہری اور باطنی شکل کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ ہر لفظ ایک تازہ اور زندہ چہرہ بن کر پڑھنے والوں کے ذہن پر ثبت ہو جاتا ہے حقی صاحب نے کئی لغات مرتب کی ہیں اور اُن پر تحقیقی اور لسانی جائزے بھی لکھے ہیں اس حوالے سے انہوں نے اُردو زبان کے بارے میں بعض شدید کج فہمیوں کو بھی دُور کیا ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

> "بعض ناواقف لوگ اُردو کے بارے میں یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ صرف مجلسی یا درباری زبان ہے یہ گمان ایسا ہی ہے جیسے صرف ہاتھی کی سونڈھ کو چھو کر اس کی جسامت کا غلط اندازہ کر لیا جائے۔ زبان ہر طبقہ اور ہر زمرے کی ہوتی ہے اور اُردو تو عوامی زبان سے چل کر ہی ادبی و علمی زبان بنی ہے اس میں

بے شمار الفاظ محاورے اور کہاوتیں خالص دیہاتی ماحول سے تعلق رکھتی ہیں پھر بے شمار حرفوں اور پیشوں کے مخصوص کلمات ہوتے ہیں۔ مولوی ظفر الرحمان دہلوی کی مرتب کردہ "فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وراں" کے آٹھ حصوں میں کتنے ہی لفظ ایسے ہیں جن سے ہم واقف ہی نہیں اُن بے شمار کاموں اوزاروں اور مسالوں کے نام جنھیں وہی لوگ جانتے اور برتتے ہیں اور اُن سے اُن کی زبردست اختراعی صلاحیت کا پتا بھی چلتا ہے کہ بلاشبہ یہ اُنھیں طبقوں کی ایجاد ہے اور جدید علمی و فنی اصطلاحوں کی طرح مصنوعی طور سے ڈھال کر صرف کتابوں میں بند ہونے کے لئے نہیں ہیں۔"

حقی صاحب کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف لغت ہی کو مرتب نہیں کرتے بلکہ زبان کی اہمیتوں اور زندگی سے اُس کے رشتوں کا علم بھی رکھتے ہیں وہ اُردو بطور قومی زبان کے حوالے سے بہت کچھ لکھ چکے ہیں کہ اُنھیں اس زبان کی صلاحیتوں کا اندازہ بھی ہے اور اس کے درمیان جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں وہ بھی اُن کے سامنے ہیں وہ مختلف رخوں سے زبانِ اُردو کی اہمیتوں کو اپنے پڑھنے والوں کے سامنے لاتے ہیں انہوں نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ

"اپنی جامع اصوات، فراواں لغات اور اسالیبِ اظہار کے لحاظ سے یہ ایک بسیط و محیط اور بڑی باصلاحیت زبان ہے جس میں ترقی کے بے پناہ امکانات موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ بعض جدید ضروریات سے خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی سے اس کو جبراً الگ کر رکھا ہے حالانکہ اس کی بنیاد اور وسائل اُن زبانوں سے کہیں زیادہ وسیع ہیں جو دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں کہلاتی ہیں مہذب زندگی کے دوسرے شعبوں میں انسانی روابط، علم مجلس افکار و جذبات کے اظہار و اسالیب کلام کے تنوع اور اختراع و ایجاد کی صلاحیت میں یہ کسی طرح معذور نہیں ہے قباحت ہے تو اتنی کہ ہمیں خود اپنی زبان پر اعتماد نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اُردو زبان زندگی کے اکثر شعبوں سے اب

تک عملاً بے دخل ہے جس کی وجہ سے اس کا قیمتی سرمایۂ الفاظ حتی متروک ہوتا جا رہا ہے اختراع کا عمل رُک گیا ہے اصطلاحیں جو مصنوعی طور پر بنائی جاتی ہیں داخل لغت تو ہو جاتی ہیں چلن نہیں پاتیں کیونکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ محدود ہوتا ہے اور زبان کا استعمال مفقود۔"

زبان کے زندہ رہنے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ظاہر و باطن میں اُتر کر پوری زندگی کا استعارہ بن جائے وہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اظہار میں کام آ سکے زندگی اور اس کی رنگا رنگی کو سمیٹ سکے تخلیقی دیمکا نکی رویّوں کا بھرپور وسیلہ بن سکے زبان تو قوم کی روح ہوتی ہے اور وہ جتنی زندہ ہوتی جاتی ہے دوسری نسلوں کو اور دوسری قوموں کو متاثر کرتی چلی جاتی ہے زبان کا دائرہ جتنا وسعت و کمیت رکھے گا وہ اتنی ہی آفاقیت کے قریب ہو گا۔ بڑی زبانیں دُنیا کے لئے اجنبی نہیں ہوتیں بلکہ وہ تو مانوس اور سچے دوستوں کی طرح سارے انسانوں کے کام آتی ہیں زبانوں کی کشادگی لوگوں کے تعصبات کو ختم کر کے ان میں انسانی محبتوں کی خواہش کو پیدا کرتی ہے حقی صاحب وسیع تر لغت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ہر لغت کی کچھ حدود ہوتی ہیں البتہ دورِ جدید میں ایک وسیع ترین لغت کا تصور ضرور پیدا ہوا ہے جو تمام زبان کی تاریخ پر حاوی ہو اشتقاق کے سلسلے میں ہر لفظ کی اصل اور دوسری زبانوں کے الفاظ سے اس کے رابطوں کا پتا لگائے ہر لفظ کے استعمال کی مثالیں ہر دور سے فراہم کرے ایسی لغت عام ضروریات کے لئے تو مفید نہیں ہو گی لیکن اس میں سے مخصوص ضروریات کے لئے مختلف چھوٹی بڑی لغات اخذ کی جا سکتی ہیں ایسی لغت کی پہل انگریزی نے کی تھی اور اب خزن زبان میں بھی بن چکی ہے ہمارے یہاں بھی اس سے ملتے جلتے منصوبے پر گزشتہ پچیس برسوں سے کام ہو رہا ہے جس کی چھ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں اور بہت سے نقائص کے باوجود اپنی نوعیت کی واحد اور سب سے جامع تالیف ہے۔"

یہی وہ لغت ہے جس کے لئے حقی صاحب نے کوئی ایک لاکھ کارڈ بنائے اور کئی برسوں تک

اس لغت کو مرتب کرنے کا کام کیا ہے آج کل وہ مقتدرہ کی طرف سے شائع ہونے والی ایک اہم لغت پر کام کر رہے ہیں۔

حقی صاحب اور اُن کے دوسرے ہم عصر ہمارے موجودہ لکھنے والوں سے بہت مختلف ہیں کہ وہ اپنے تخلیقی کام کے لئے کوئی ایک خاص سمت یا کوئی ایک خاص صنف مقرر نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کو اور زندگی کی معنویت کو زیادہ سے زیادہ اصناف میں اور زیادہ سے زیادہ جہتوں میں دیکھتے رہے ہیں اور ان کے ربط کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ہماری نسل کے لوگ پوری زندگی کو اور پوری زندگی کی خارجی و باطنی صورتوں کو کسی ایک ہی صنف میں لکھ کر اور کسی ایک ہی جہت میں رہ کر سامنے لانا چاہتے ہیں تو کیا حقی صاحب اور ان کے ہم عصر پورے آدمی ہیں؟ اور پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور کیا ہمارے عہد کا ہر نیا لکھنے والا ادھورا آدمی ہے؟ اور زندگی کے کسی ایک رُخ کے اظہار میں لگا ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں پورا آدمی ہونا یا ادھورا آدمی ہونا کسی خاص عہد سے یا کسی خاص شخصیت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ لکھنے والے کی اپنی تخلیقی دیکانگی علمی اور تجرباتی صلاحیتوں سے اس کا تعلق بنتا ہے اس سلسلے میں حقی صاحب کی رائے بھی دیکھ لیجئے۔

"میں تخیل کی کامل آزادی کا قائل ہوں اور کوئی منفرد یا مثالی انداز اپنانے کے بجائے تمثیل کی طرح متنوع انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہوں ایک ہی مخصوص لہجے اور ایک ہی ڈگر اپنانے میں مجھے ایک طرح کی آورد یا عصبیت کا گمان ہوتا ہے زندگی کا تو ذکر ہی کیا خود اپنی ذات کے اندر کتنے ہی عالم ہوتے ہیں اور سب اپنا اظہار چاہتے ہیں چنانچہ میں نے الہیات سے لے کر معاملات و واردات بلکہ خرافات تک سے پرہیز نہیں کیا ہے۔"

حقی صاحب کا لکھا پڑھنا ایک سمتی نہیں ہے۔ اس حوالے سے اُن کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ انہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر پر پہلا تحقیقی مضمون لکھا تھا جس میں اُن شکوک اور شبہات کو بے حقیقت بتایا تھا جن میں کہا جاتا رہا ہے کہ ظفر کی شاعری کا بیشتر حصہ ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اُس کے بعد انیس سو بہتر میں "نکتہ راز" چھپ

کر سامنے آئی تو اس میں وہ لسانی اور تنقیدی مضامین دیکھنے میں آئے جن میں زبان تعلیم اور کلچر کے حوالے سے لکھے ہوئے مضامین کی نوعیت زیادہ تر تحقیقی ہے۔ تنقیدات میں جن شاعروں پر گفتگو کی گئی ہے ان میں غالبؔ، نذرالاسلام، اکبرؔ، انیسؔ اور تلوک چند محروم وغیرہ شامل ہیں۔ حقی صاحب نے تنقیدی تصور کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"تنقید تو ایک طرح کی جراحی، خوردبینی یا تجزیاتی عمل ہے ندرتِ بیان اس کے لئے لازمی نہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ درست معلوم ہوتی ہے کہ ادبی تنقید کو ادبیت سے عاری نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ خود ادب کا حصہ ہوتی ہے۔"

حقی صاحب ہمارے کلاسیکی دائروں کے لکھنے والے ہیں لیکن وہ ادب کی جدید تحریکات اور زندگی کی نئی ضرورتوں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں اُن میں تبدیل کرنے اور تبدیل ہونے کی صلاحیت بھی موجود ہے لیکن تہذیبی اور روایتی وجود انھیں اُن چیزوں کو بھی توڑنے کی اجازت نہیں دیتا جو کبھی ماضی میں بہترین زندگی کا معیار بنی ہوئی تھیں اور موجودہ عہد میں مردہ ہو چکی ہیں کمزوریوں کو نظرانداز کرنا اور خوبیوں کو اظہار میں لانا کشادہ ذہنوں کا اسلوب رہا ہے "نکتۂ راز" کے مضامین پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جدید شعر و ادب سے اور اُن کے اسالیب سے پورے طور پر مایوس نہیں ہو سکے، یہی سبب ہے کہ وہ ہماری نئی علامات کو تازہ امیجری کو ہماری جدید رمزیت کو اور زندہ اساطیری حوالوں کو کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں سمجھتے بلکہ وہ ہمارے عہد سے کسی حد تک مایوس ہیں اُن کی یہ مایوسی براہِ راست تو دکھائی نہیں دیتی لیکن اُن کی تحقیقی و تنقیدی تحریروں میں پڑھنے والوں کو محسوس ضرور ہوتی ہے وہ عصری شعور اور فکری عنصر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"نظیر تو ایک طرف شاید کوئی غزل بھی میں نے ایسی نہیں کہیں جو عصری شعور یا فکری عنصر سے یکسر خالی ہو اس کے باوجود کہ میں فکر پر حصار باندھنے کا قائل نہیں ہوں۔ شاعر کو اپنی ذات سے کائنات تک ہر جہت میں جانے کا حق ہے اگر وہ اپنے جذبات میں سچا ہو اور دانستہ زندگی کے راستے سے ہٹا ہوا نہ ہو۔"

"نکتۂ راز" کے کوئی پندرہ برس بعد اُن کے مضامین کا دوسرا مجموعہ "نقد و نگارش" شائع ہُوا جس میں چند پرانے مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے اور نئے مضامین میں اقبال، جوشؔ، حسن نظامی اور فانی وغیرہ کو خصوصی مطالعہ کے قابل بنایا گیا ہے۔ نقد و نگارش کے مضامین میں بھی علمی و تحقیقی رجحان ملتا ہے۔ ان میں تقابلی مطالعہ کی اور دو یا دو سے زیادہ لکھنے والوں کو سامنے رکھ کر موازنے کی صورت پائی جاتی ہے۔ درحقیقت یہ صورت بھی تجزیاتی نہیں، تحقیقی ہی ہے اس میں شک نہیں کوئی تنقید تحقیق کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی لیکن دو یا دو سے زیادہ تحریروں کو ایک جیسا کہہ دینا یا ان کے اختلاف کو ظاہر کر دینا بھی تنقید نہیں ہے مثال کے طور پر حقی صاحب نے فانی کو غم کا نہیں موت کا شاعر لکھا ہے اور موت کے متعلقات کی ایک طویل فہرست ان کی شاعری سے نکالی ہے۔ معنوی سطح پر انھوں نے مہاتما گوتم کی تعلیمات کو فانی کے بیشتر کلام میں پایا ہے مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بدھ مت فلسفے سے زیادہ ایک دستورِ حیات کا نام ہے جو تزکیۂ نفس کے لئے لایا گیا ہے اس کے پیرو اس کو مانتے ضرور ہیں خواہ اس پر عمل پیرا نہ ہوں حقی صاحب نے شوپن ہار اور فانی میں بھی ایک مناسبت پائی ہے اور لکھا ہے کہ

"فانی اور گوتمی یا شوپن ہاری عقیدے کے درمیان قنوطیت ہی ایک قدرِ مشترک ہے"

اس مضمون میں فانی کو غالب کے سامنے رکھ کر بھی دیکھا گیا ہے اور بہت سے اتفاقی اور اختلافی عکس اتارے گئے ہیں۔ دوسرے مضامین بھی کچھ ایسی ہی نوعیت رکھتے ہیں کہ حقی صاحب کی تحقیقی بصیرت سے بہت سے تاریک منظروں کو روشنی ملی ہے اور یہ مضامین اُن کی سچی علمیت کا اور اُن کی گہری جستجو کا صلہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

حقی صاحب کا بیشتر کام لسانی اور تحقیقی بنیادوں پر ہوا ہے جو اُن کے شعور کو اُن کی علمیت کو ظاہر کرتا ہے لیکن اُن کی شخصیت کا ایک حصہ تخلیقی اور لاشعوری بھی ہے جس کے حوالے سے اُن کے افسانوں کو اور اُن کی شاعری کو دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانوں کی کتاب تو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے مگر اُن کی شاعری کے دو مجموعے ہمارے سامنے ہیں "تارِ پیرہن" انیس سو اٹھاون میں شائع ہوا تھا اور اس میں غزلیں، نظمیں، عنایتے بنگالی اور انگریزی نظموں کے ترجمے

اور انسلوئی فلوپیطرہ کا کچھ منظوم حصہ شامل کیا گیا ہے۔ حقی صاحب نے اپنی ابتدائی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ایک عرصے تک تو میری شاعری میں پیغام کا کیا ذکر مضمون کا بھی پتا نہیں تھا بعض کیفیات میں کچھ کہنے کو جی چاہتا مگر بات تھوڑی سی نغمہ آفرینی سے آگے نہیں بڑھتی پھر میں نے قصداً بھی کچھ مدعا داخل کرنے کی کوشش کی مگر وہ آورد ہو کر رہ گئی ابتدا میں جو بے کار اور لاحاصل باتیں خود بخود اور خواہ مخواہ موزوں ہو گئیں اُن میں کوئی دلچسپ نکتہ، کوئی لطیفہ یا الفاظ کا انوکھا پن ضرور ہوتا تھا رفتہ رفتہ یہ موزوں کلمات اپنی نظر میں کچھ زیادہ پُر معنی ہوتے چلے گئے لیکن اس شعر گوئی کے ساتھ ایک تشنگی کا احساس بھی رہا کہ جو کچھ کہا ہے وہ بہت ادھورا اور ناکافی ہے یہ تشنگی مشقِ شاعری کے ساتھ بڑھتی ہی گئی اور اس مجموعے کو پیش کرتے وقت بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے"

"تارِ پیراہن" کے تعلق سے آپ نے خود شاعر کی رائے کو دیکھ لیا جو ان کے مزاج کی انکساری کا ثبوت بھی ہے تیس سال پہلے تارِ پیراہن کی شاعری اور اس کا ذائقہ یقیناً تازہ اور نیا ہو گا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے حقی صاحب کی غزل کے بارے میں لکھا تھا کہ

"ان کی غزل میں ایک نیا ذائقہ پایا جاتا ہے یہ نیا پن کیا چیز ہے یہ نیا پن ہیئت کا نہیں قلبِ انسانی کے کسی نئی کیفیت کا انکشاف یا کائنات کے متعلق کسی نئی بصیرت کا بھی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اندازِ غزل گوئی سے ہے یہ ایک طرح سے غزل گوئی کے اس ذوق یا روایت کی تجدید ہے جو زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے اور حسرت پر آ کر ختم ہو گئی تھی یہ وہ روایت تھی جس کے ماننے والوں کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ غزل معنوی اعتبار سے کچھ بھی ہو اس میں بیان کی لطافت اور زبان کی حلاوت ضرور ہونی چاہیئے۔ غزل میں لطافتِ بیان کو بحال کر کے اور شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر کے اس کو ایک نئے ذائقے سے جس طرح حقی نے روشناس کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے"

سیّد صاحب کی اس رائے سے زبان و بیان کی اہمیّت تو ظاہر ہوئی ہے لیکن حقّی صاحب کی تخلیقی اور ذاتی تجرباتی اہمیت کا اندازہ کم ہی ہوا ہے نیاز فتح پوری نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہی تھیں کہ

"اُن کی نثر بھی ایک خاص طرز کی ہوتی ہے اور اُن کی شاعری بھی جدت و ندرت سے خالی نہیں لیکن سب سے زیادہ جو چیز مجھے پسند ہے وہ ان کی ادبی احتیاط اور فنی رکھ رکھاؤ ہے وہ بے عیب شعر کہنے والوں میں ہیں"

اس رائے میں بھی حقّی صاحب کی شاعری کے خارجی وجود کی تعریف کی گئی ہے اور انہیں زبان و بیان کا ماہر قرار دیا ہے۔ حنیف رامے کی بھی چند سطریں پڑھ لیجئے۔

حقّی صاحب اپنے کلام میں جتنے پُرگو ہیں زندگی میں اتنے ہی کم گو ہیں شاعری کے ضمن میں ان کا ایک مسلک یہ رہا ہے کہ جہاں سے جو ملے وہ لینا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے کلام میں زبان کی چاشنی تو ہر جگہ موجود ہے لیکن اسلوب جگہ جگہ بدلتا ہے یوں بھی اظہار کے لئے وہ کسی ایک صنف کے نہیں ہو رہے"

یہاں بھی وہی کہا گیا ہے جو پہلے ہمارے دو بزرگ کہہ چکے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شعری مجموعے کی اہمیّت تیس سال پہلے صرف زبان و بیان کے حوالے سے رہی ہو، اُس کی اہمیّت آج کی نظر میں کیا ہے کہ گذشتہ تین دہائیوں میں فکری و اسالیبی اور تخلیقی و تجرباتی سطح پر جو بڑے تغیرات پیدا ہوئے ہیں اُن کے حوالے سے حقّی صاحب کی اس شاعری کو کہاں رکھا جا سکتا ہے۔

"تارِ پیراہن" کا خارجی وجود تو مستند و معروف ہے اگر ہم اس شاعری کے داخلی اور تخلیقی رنگوں پر نظر ڈالیں تو کہہ سکتے ہیں کہ "تارِ پیراہن" کی پوری شاعری تو مسلسل اثر رکھنے والی شاعری نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس شاعری میں آج بھی زندگی، عشق اور سماجیات کے بہت سے زندہ تجربوں کے رنگ ایسے ملتے ہیں جنھیں بے اثر نہیں کہا جا سکتا۔

یہ بھی تھی حسرت نمو کی جلی
بجھ رہی ہے سُلگ سُلگ کے کلی

بڑھتا گیا قدم بہ قدم کاروانِ شوق
بجھتے گئے چراغ مگر روشنی رہی

بڑی تلاش سے ملتی ہے زندگی اے دوست
قضا کی طرح پتا پوچھتی نہیں آتی

حقّی صاحب کے ہاں عشق کے اظہار میں جو دھیما پن جو غنائیت جو سرگوشی اور جو تغزل پایا جاتا ہے وہ ان کے لہجے کی شائستگی سے پیدا ہوا ہے اور غزل کی تعمیم کرتا ہوا نظر آتا ہے

اتنا ہی نہیں ہے کہ ترے بن نہ رہا جائے
وہ جاں پہ بنی ہے کہ جیئے بن نہ رہا جائے

کہیں کیا بن ترے آنکھوں کا عالم
دیئے روشن درو دیوار کالے

بھلا دو رنج کی باتوں میں کیا ہے
اِدھر دیکھو مری آنکھوں میں کیا ہے

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

ہے آج بھی مجھے ترے وعدوں پہ اعتبار
کچھ رہ گئے ہیں خواب کی حد سے گزر کے خواب

جس میں اک بار پڑا تھا مری وحشت کا قدم
اُسی صحرا میں مجھے ڈھونڈ رہا ہے کوئی

یوں کسی سمت اندھیروں میں رواں ہوں جیسے
منتظر ہو کوئی خورشید خیالی میرا

کیوں چونکتا ہے دشت کو خالی سا دیکھ کر
اے خانماں خراب یہ تیرا ہی گھر تو ہے

مرتے ہیں بہت ہم بھی نگارانِ جہاں پر
جیتے ہیں مگر ایک تصوّر کے سہارے

حقّی صاحب نے عشق کی غارت گری میں بھی تخلیق کے پہلو نکال لئے ہیں اور دیمک کے چاٹے ہوئے کاغذ کو نقش کی مثال قرار دے دیا ہے وہ اُفتاد میں سنجیدہ رہنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں مگر جب آنسوؤں کو روکتے ہیں تو ہنسی پھوٹ پڑتی ہے اور ایسی بہت سی تمثیلیں اور بہت سی ترجیحات اُن کے قنبت شعور کو اظہار میں لاتی ہیں

"تارِ پیراہن" کا دوسرا اہم موضوع معاشرتی جبر کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ حقّی صاحب اس جبر کو برداشت بھی کرتے ہیں اور اُسے بیان بھی کرتے ہیں اور اُس جبر کو روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

اک ترا من ہے ایک میرا من
دیکھ پیکارِ آتش و آہن
سولئے یک چراغ رہگذر کیا شرحِ دل کیجئے
کہ گردد باد کے طوفان میں بے باکانہ روشن ہے
مری چشمِ تماشا نے یہ افسانہ بھی دیکھا ہے
کہ گل ہے شمع اور خاکسترِ پروانہ روشن ہے
چمن چمن سے اکھڑ کر رہے گا پائے خزاں
روش روش کو جتا دے شجر شجر سے کہہ
بزمِ ہستی ہے صنم خانۂ ویراں کی طرح
آدمی دہر میں نایاب ہے یزداں کی طرح
نالۂ غم بھی نہیں شورِ طرب کا کیا ذکر
شہر کے شہر ہیں سنسان بیاباں کی طرح
سمجھ میں خاک یہ جادو گری نہیں آتی
چراغ جلتے ہیں اور روشنی نہیں آتی

برہم ہے نظامِ دوجہاں کچھ نہیں معلوم
کل نکلے گا خورشیدِ جہاں تاب کدھر سے

یہ سارے المیے اپنے داخلی اور اپنے ظاہری وجود میں زندگی کے درمیان ہمیں بھی نظر آتے ہیں اور ہم میں زخم کو برداشت کرنے اور جبر کو بدلنے کی روح پیدا کرتے ہیں آدمیت کا غائب ہونا شہروں کا بیابان میں تبدیل ہو جانا چراغ جلنا اور روشنی کا نہ ملنا کسی تازہ انقلاب کا اشارہ بھی ہے جو مثبت زندگی کی علامت بن کر آسکتا ہے اور یہ ایک ایسا استعارہ بھی ہے جس میں بے شعوری لاتعلقی اور خود غرضی ان تبدیلیوں کو ہم پر نازل کر سکتی ہے کہ زندگی کے تازہ موسموں میں ہلاکت خیزیوں کے صحرا بچھا دیئے جائیں۔ حقی صاحب نے گرد و پیش کا ادراک حاصل کرنے کے بعد آگے بڑھ کر بھی سوچا ہے اور ان بہت سی محرومیوں کو بھی محسوس کیا ہے جو زمانے اور زمانے کے لوگوں سے اُن تک نہیں پہنچی ہیں بلکہ کسی ان دیکھی قوت نے اُن پر اتاری ہیں

گراں نہ ہو تو لکھیں خود فسانۂ غم دل
ہمیں بھی اذنِ رقم لے خدائے لوح و قلم
مری نگاہ نے مانگی تھی حیرتوں سے پناہ
تو بڑھ کے زیست سے نکلے عجائباتِ عدم
کرتی جاتی ہے صیقلیں حیرت
کھلتی جاتی ہے جوہروں کی زباں
نہاں عدم میں مری شوخیٔ قلم کے لئے
وہ رنگ ہیں کہ خیالوں میں آ نہیں سکتے
تشہیرِ جنوں کہیے یا عرضِ سخنِ حقی
ارزاں ہیں مرے آنسو رسوا ہیں مری آہیں

تجربات و موضوعات اور اُن کے درمیان روابط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ "تارِ پیراہن" کو لکھنے والا ایک ایسا تخلیقی آدمی ہے جو ان تمام ناہمواریوں کو اور ان تمام تبدیلیوں کو جانتا ہے جو زندگی پر اپنی کالی پرچھائیاں اتار رہی ہیں "تارِ پیراہن" میں جو نظمیں شامل

ہیں ان میں قدرِ مشترک۔ فن۔ آخری دیدار اور فرصت وغیرہ اچھی نظمیں ہیں اور ترجموں میں نذر الاسلام، کیٹس اور شکسپیئر کے ڈرامے "انطونی قلوپطرہ" کا منظوم ترجمہ خصوصی مطالعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ "بیتی برسات" اس کتاب کی ایک ایسی نظم ہے جس میں حقی صاحب نے "ریختہ اور ریختی" کو ملانے کا تجربہ کیا ہے یہ نظم اپنی مکالماتی تیکنیک میں روزمرّہ کی زندگی کو اور تفریحی مقامات پر جانے سے پہلے اور وہاں پہنچ کر عام خواتین اور مردوں کے درمیان دلچسپ بات چیت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہے اس نظم میں دلّی کا روزمرہ اور وہاں کا محاورہ ایک محاکاتی صورت اختیار کر گیا ہے اور نظم کا ہر شعر اس طرح آگے بڑھتا ہے جیسے کوئی کیمرہ گھوم گھوم کر اپنے گرد و پیش کی تصویر اتار رہا ہو اس پوری نظم کی فضا میں بارش کا موسم گھلا ہوا ہے اور ایسے موسموں میں بولنے والوں کی آوازیں تیز تیز سنائی دے رہی ہیں جو ان کے داخلی جذبوں کی پہچان رکھتی ہیں اس نظم کو حقی صاحب کا ایک کامیاب تجربہ کہنا چاہیئے۔

حقی صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ "حرفِ دل رس" "تارِ پیراہن" کے چوبیس پچیس برس بعد آیا ہے ہمارا عمومی تجربہ تو یہی ہے کہ پہلی کتاب اپنے لکھنے والوں کی اہمیت کو اور اس کی شہرت کو بڑھاتی ہے پھر دوسری اور تیسری یا اس کے بعد آنے والی کتابوں میں لکھنے والوں کی تخلیقی قوت کا اظہار کم ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اہم اور اچھے شاعر اپنی گذشتہ اہمیت کو بھی باقی رکھتے ہیں اور اُن میں اضافہ بھی کرتے جاتے ہیں "حرفِ دل رس" مکمل طور پر غزل کا مجموعہ ہے جس میں حقی صاحب کی غزل نے سماجی اور معاشرتی تجربوں میں اور انسانوں کی پہچان میں گہری سچائیاں تلاش کی ہیں اور وہ جیر کی ہلاکتوں کے سامنے سچے طنز کی جلتی ہوئی شاخ زیتون لے کر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی محبتیں اور ان کی ذات کے مسئلے اور تصوف کے کچھ رزمیئے حقی صاحب کی اس غزل کا حصہ بنے ہیں۔ "حرفِ دل رس" میں انہوں نے بیان و زبان کے کچھ ایسے تجربے بھی کئے ہیں جو پہلے نظر نہیں آئے تھے ان تجربوں پر ہم بعد میں نظر ڈالیں گے پہلے ہم حقی صاحب کی ان عملی تمثیلوں کو غزل کی تخلیقی قوت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ جو "تارِ پیراہن" کے مقابلے میں آگے بڑھ کر طنز کا کردار ادا کرنا چاہتی ہیں

ہمارا بھی قلم آمادہ رو ہے
ہمیں بھی کاتبِ تقدیر کر دو
وفا کی بات پھر حرفِ کہن ہے
لہو سے بھی اگر تحریر کر دو
فاصلے تنگ ہوئے اور فصیلیں ٹوٹیں
کون سے شہر کو کہیے کہ مرا شہر ہے یہ
پہلے پانی پر بہت پیڑ سب اپنے تھے
اب تو پون بھی دھوپ بھی ہے سرکاری سی
تماشے اور کیا ہوں اس سے بڑھ کر
دلوں کے دکھ بدن کی پیاس دیکھو
یہ کہتی ہے زر اندوزوں کی حکمت
وہیں پہنچو جدھر افلاس دیکھو
مشیّت کے سوا جبرِ مسلسل
نہیں آتا کسی کو راس دیکھو
زلزلے آپ ہی اٹھیں گے زمیں کی تہ سے
صبر پر جبر کی بنیاد اٹھانے دینا

حقی صاحب مظلومیت کو ہرا سال ہونے نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ دشت کی ٹھوکریں سنگریزے بھی پڑے ہیں اور بیش بہا جواہر بھی لیکن یہ عدل نہیں ہے بے حسی اور جہالت کا جشن ہے حقی صاحب ایک تجربہ کار ایک حقیقت پسند اور ایک بے خوف شخص کی طرح اپنے قبیلے کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

موسمِ گل نہ سہی مشغلِ جنوں اچھا ہے
ہمدمو تیز ہے گردشِ خوں اچھا ہے

یہ سرنوشت ازل ہے تو میٹ دو اس کو
کہاں کی لوح کہاں کا قلم کہو کہ نہیں
بہار باغ میں آئی ہے گھیر لو اس کو
یہاں سے پھر جو اٹھائے قدم کہو کہ نہیں
سامنے آئے آنکھ ملائے دیکھوں کون پشیماں ہے
دکھ دے کر کیا شاد نہ ہوگا انساں آخر انساں ہے
عیبی کُل آدے کا آدا ولئے کمالِ کوزہ گری
چاک سے اترا توڑ دیا جو نقش بنا بے کار بنا
لوٹ گئی سر سے موج طوفاں مگر نہ پائی نگاہِ ساحل
سفینہ گم ہو گیا تو ابھرا افق پہ خطِ سیاہِ ساحل
ملال کیسا کبھی تو آخر چلے گی بادِ مراد حق کی
کسے خبر تھی کہ جانے ہیں بسوئے طوفاں براہِ ساحل
جوڑ ہے ہو تیر یہ کس پہ عکس تمہارا ہی تو نہیں
سالم تھا جو نقش ابھی تک سو ٹکڑے ہو جائے گا
یارو یہ کچھ اور جنم ہے اور ہی جگ ہے اور ہی جگ
بوئے گا سو کھو بیٹھے گا لوٹے گا سو پائے گا

انسانوں کے معاشرے میں جبلّتوں کے دہشتناک رویّے قبیلہ واریت میں لپٹے ہوئے خون آلود چہرے دیکھ کر یہ دُکھ تو ہوتا ہے کہ پھول باغ کی مٹی میں مل گیا ہے لیکن یہ جو لہو خاک پر پڑا ہے اس بات کی علامت ہے کہ رنگ و بو کا کوئی نیا موسم آنے والا ہے ایسی خوش آئند زندگی اور ایسی رجائیت جگنوؤں کی طرح جلنے بجھنے والی ہوا کرتی ہے لیکن جب آندھیاں چل رہی ہوں اور اندھیرے خیمہ گاہوں میں در آئیں تو مٹی کا جلتا ہوا دیا بھی سورج سے کم نہیں ہوتا آنکھوں کو پتھر کیا جا سکتا ہے خوابوں کو اُن سے جُدا نہیں کیا جا سکتا کہ یہی خواب تو زندگی کی تشکیل نو کرتے ہیں یہی تو انسانوں سے اپنے رشتوں کی اور اپنی محبتوں کی پہچان مانگتے ہیں ورنہ عصبیت عداوت

رکھنے والوں کے سینوں سے تو سانسیں لادا بن کر ابلتی ہیں اور زندگی کے خوبصورت موسموں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہیں۔

سونی کالی رات ہے جی پر بھاری سی
آؤ تم سے بات کہیں اک پیاری سی
آؤ ڈھونڈ لیں لذّت ہی کا پہلو کوئی غم میں
سُکھ تیرے جنم میں ہے نہ سکھ میرے جنم میں
کچھ اور بھڑک اٹھے گی لو شمعِ وفا کی
ہرگز نہ بجھے گا یہ دیا اُسکے لبوں سے
اک محبت کے دیئے سے کتنی رونق آگئی
ورنہ کیا رکھا تھا دل میں اک سیہ خانہ ہی تھا
غمِ دہر و رنجِ الفت مرے آشنا ہیں دونوں
کوئی ہمقدم سحر سے کوئی ہمکنارِ شب سے
وہ مزار رکھتے ہیں کچھ تازہ فسانے اپنے
بھولتے جاتے ہیں سب درد پرانے اپنے
نظر میں کچھ نہ سہی اعتبارِ رنگ تو ہے
کدھر ہے کوئے یقیں چل کے دیکھ لیں گے ابھی

یقین کے راستوں میں حادثوں کی حملہ آوری پرانی روایت ہے لیکن ان راستوں میں وہی لوگ بڑھتے ہیں جو زمین اور آسمان کے درمیان اپنی تلاش کے سفر میں ہوتے ہیں یہ سفر لوٹ کر اپنی ذات کی سمت آتا ہے اور زندگی روشن تجربوں سے پیوست ہوتی چلی جاتی ہے۔ تہذیبی وجود جب جسم و جاں کی خواہش بن جاتا ہے تو شعور اور احساس میں زندہ چنگاریاں سلگتی ہیں اور اپنی ہواؤں کے ساتھ بھڑکنے لگتی ہیں صاحبِ اعتبار لوگ گرتی ہوئی دیواروں کے نیچے بیٹھے رہتے ہیں کہ ان کا ہونا پچھلی روایتوں کا استعارہ ہوتا ہے

سوزشِ زخمِ آرزو کا علاج
موت کیوں ہو اگر حیات نہیں

خود ہی پردوں میں چھپایا تھا نظر نے اسکو
اب نظارے پہ ہے اصرار نئی لہر ہے یہ

وہ جلوہ گر ہے لاکھ کرشموں کے درمیاں
لیکن نظر کو ضد ہے کہ تنہا دکھائی دے

اے راحتِ شبانہ دامن نہ کھینچ میرا
دو گام کے سفر میں کیا شام کیا سویرا

کیا رنج کیا کلپنا کیا آپ آپ جپنا
تو بھی نہیں خود اپنا کچھ بھی نہیں ہے تیرا

اس کوئے آشنا سے اُٹھے قدم تو اُٹھے
کس راحتوں نے روکا کن بازوؤں نے گھیرا

حسن آسودہ صحرا میں ہے آج کل
عشق سرگشتہ آئینہ خانوں میں ہے

ہوتی ہے یہاں قدر کسے دیدہ وری کی
آنکھوں کی طرح اپنے ہی آغوش میں رہیے

باہر کی شب آثار روشنیوں سے اندر کے خوش رنگ سایوں کو بچانا کچھ سہل نہیں ہوتا لیکن جو لوگ اپنی ذات کی صداقتوں تک جا پہنچتے ہیں وہ مٹی کی دُنیا سے اوپر اُٹھ سکتے ہیں ان کے لئے حواسوں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور اُن کے اندر ایک ایسا جامِ جمشید تشکیل پا جاتا ہے جس میں زندگی کو اور ماورائے زندگی کو آدمی دیکھ لیتا ہے۔

تخلیقی قوت کو حقی صاحب فرشتۂ غیبی کہتے ہیں اور وہ جدید سائنس کے بہت زیادہ قائل اس لئے نہیں ہیں کہ وہ ان کے فرشتۂ غیبی کو تسخیر کرنا چاہتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"اس تحلیل و تجزیہ کے دور میں تخلیقی عمل پر بھی مشقِ جراحی ہوئی ہے اصول فطرت

کی دریافت کے شوق میں انسانی ذہن اس جستجو میں ہے کہ شاید وہ اس
بنیادی اصول کا پتا لگالے جو تخلیق کے حیرت ناک عمل میں کارفرما ہوتا ہے
ادب اور آرٹ کی بعض تحریکات کی محرک بھی یہی جستجو ہے کہ لاشعور کو
کسی طرح حسبِ منشا کام پر لگایا جائے گویا "فرشتۂ غیبی" کو تسخیر کیا جائے
میں نہ سائنس کے طریقِ کار کا مخالف ہوں نہ عقل کا دشمن ہوں مگر سائنس کو
اعتراف ہے کہ اُس نے ابھی صرف نفسِ انسانی کی سطح کو چھُوا ہے میرے
خیال میں نفسِ انسانی کا تخلیقی عمل ایک ایسی پُراسرار حقیقت ہے جس کا
فارمولا ناقابلِ دریافت چیز ہے۔ جدید سائنس کا مشاہدہ ہے کہ کبھی کبھی
مادّی مظاہر میں بھی ایسے عمل واقع ہوتے ہیں جن کی توجیہہ محال ہے اس جدید
مشاہدے نے اس نئے عقیدے کو راہ دی ہے کہ فطرت کے معلوم قوانین دراصل
اتنے اٹل نہیں ہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں یہی بات بعض لوگوں کے نزدیک ایک
جدید تصوّف کا آغاز کرتی ہے اور عجیب نہیں کہ آگے چل کر سائنس کو اپنی تحقیق
کا پرچم کسی قسم کی روحانیت ہی کے حوالے کرنا پڑے اور ان چند ظاہری حواسوں
سے شاید کل کائنات کا احاطہ ممکن نہ ہو جن کی مقدرت سراسر محدود ہے"

ہمارے کچھ معتبر لکھنے والوں نے جذباتی ہو کر کہا تھا کہ "اردو زبان اپنی تخلیقی قوّت کھو چکی ہے
اور اب اسے متروک قرار دے کر کوئی نئی زبان اپنے اظہار کے لئے پیدا کی جائے۔ اس خام خیالی
کی اہمیت کو تو سب ہی پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آدمی آسمان کے عذاب
کو تو جھیل سکتا ہے لیکن زمین کو اپنے سر پر اٹھا کر نہیں چل سکتا نام نہاد آوازوں کے درمیان
حقّی صاحب نے اپنی وہ آواز بلند کی تھی جو مثبت امکان کا پیش نامہ بھی تھی اور افادیت کا
سبب بھی بن سکتی تھی انھوں نے چاہا تھا کہ ہندی اور انگریزی لفظوں کو اُردو میں اس طرح ملا کر
استعمال کیا جائے جیسے فارسی اور عربی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اضافتوں کو اور رواروی عاطفہ کو
عربی و فارسی کے قیاس پر لکھا جائے تاکہ اُردو زبان میں وسعت اور کشادگی بھی پیدا ہو سکے اور
دوسری زبانوں کے لفظوں سے اُردو کی اجنبیت اور نامانوسیت بھی کم ہو جائے اس حوالے کو

حقی صاحب نے شاعری میں زندہ کرنے کی عملی پیش قدمی بھی کی ہے اور جو چیزیں لکھی ہیں انہیں "جواہر مالا" کا نام دے کر ایک مجموعے میں مرتب کر دیا ہے جس کی اشاعت عنقریب متوقع ہے

حقی صاحب کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ اردو میں عربی و فارسی کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ ہندی کا رس بھی بڑھتا جائے انھوں نے ایسے بہت سے لفظ اپنی شاعری میں لکھے ہیں جنھیں جدید ہندی نے متروک اور مردہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے ایسے لفظوں کی آماج گاہ اردو ہی ہے اس حوالے سے ایک اور اہم بات بھی سامنے آتی ہے کہ حقی صاحب جب اردو ہندی اسالیب و آہنگ کو ملا کر لکھتے ہیں تو ہماری تہذیبی اور ثقافتی جھلکیاں زیادہ گہرائیوں کے ساتھ سامنے آنے لگتی ہیں۔ شائد ایسے ہی کچھ حوالوں کو دیکھ کر جون ایلیا نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ

"حقی صاحب کی ادبی دانش ہی نے ان کے فن کو آبرو بخشی ہے ان کی شاعری اعلیٰ قدروں کی شاعری ہے اعلیٰ قدریں جو اعلیٰ فنی شعور پر مبنی ہوتی ہیں اور اعلیٰ فنی شعور جو اعلیٰ قدروں کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کی پیرایہ پروری ان کے شاعرانہ طریق کار میں پوری طرح پائی جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ میری رائے میں اِن کا فن ان کی مخصوص شخصیت کی ایک فنی اور جمالیاتی تعمیم بھی ہے ان کے مزاج میں چاہنے اور چاہے جانے کی وہ جو ایک نیاز آئین اور نیاز آگیں کیفیت ملتی ہے اُس نے ان کی شاعری کو بہت کچھ دیا ہے۔ حقی اپنے مثالیوں میں قدیم اقدار ہی سے متاثر نظر آتے ہیں اور کہیں بے بنیاد نہیں ہوتے ان کا شمار اس گروہ میں کرنا چاہیئے جس نے اپنے تاریخی فکری اور فرہنگی اثاثے کی قدر و قیمت کا تعین خوش عقیدگی کے بجائے حقیقت پسندی سے کیا ہے مگر ان کی حقیقت پسندی ظاہر ہے کہ منطقی و ریاضیاتی حقیقت پسندی نہیں بلکہ جمالیاتی حقیقت پسندی ہے۔"

حقی صاحب کی تحریروں اور ان کی شاعری کے مطالعہ کے درمیان جن کلیدی منطقوں کو اور جن اہم مرکزوں کو ہم دیکھ چکے ہیں وہی حقی صاحب کے شخصی اور تخلیقی زندگی کی ساخت

ٹھہرتے ہیں اور انہی کے گرد ان کا سارا ہنر اور اُن کے سارے فکری و ادبی تجربے گردش کر رہے ہیں۔ حقی صاحب کو سب سے زیادہ اہمیت زبان و بیان کی خدمات اور لسانی اقدار کے شعوری ادراک سے ملی ہے وہ ہماری کلاسیکی روایت کی ایک زندہ شخصیت ہیں وہ تہذیبی و ثقافتی اقدار کے آدمی ہیں لیکن اُنہیں جدید عہد اور جدید عہد کے تغیرات کا علم بھی ہے اُنھوں نے اپنی زبان کی محبت میں دوسری زبانوں کو پڑھا ہے اور اُن سے استفادے کے حوالے بھی پیدا کئے ہیں وہ اشاعتی نقطۂ نظر کے ادیب ہیں توڑنے سے زیادہ جوڑنے کو اور نئے تجربے سے زیادہ گمشدہ تجربوں کی بازیافت کو کارآمد سمجھتے ہیں ان کے اندر نئے اور پرانے دونوں کی تفہیم اور دونوں کا احترام موجود ہے وہ دوسروں کو رد نہیں کرتے بلکہ اپنے مؤقف کی تائید کرتے چلے جاتے ہیں انہوں نے زندگی کو کئی جہتوں سے دیکھا ہے اور اپنے بہت سے تجربوں سے بہترین نتیجے اخذ کئے ہیں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی حیثیت ان کی شعری اور ان کی افسانوی تخلیقات سے کم نہیں ہے کہ تہذیب کلچر اور لسانی اقدار کو جاننے اور اُسے اپنی ذات میں شامل کرنے کی ایسی شدید ضرورت شاید اس دور سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی حقی صاحب کی تحریریں ہماری زندہ ضرورت بھی ہیں اور اُردو کا معتبر اثاثہ بھی ہیں۔

لاحاصل کا حاصل

برصغیر میں مسلمانوں کے انتہائی زوال کے آخری موڑ پر پہلا جدید انسان مرزا غالب ہے جس نے اجتماعی زندگی میں فردیت کے اُن دریچوں کو کھلتے ہوئے دیکھا تھا جن کے ذریعے اندر آنے والے موسم ہمارے گھروں میں بچھے ہوئے ہیں غالب کا وجود اپنی اہمیتوں میں بہت سی نئی خواہشوں کی علامت ہے جس نے انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیا ہے لیکن یہی غالب تہذیبی اقدار کی شکست ریخت کا المیہ بھی ہے غالب کی شاعری اور اُس کی تحریریں ہماری ذات میں زندہ خون کی طرح گردش کر رہی ہیں کہ ہمارے خون کی اس گردش میں اعلیٰ اقدار کی گمشدگی کا شدید دُکھ بھی ہے اور ہم نئی تہذیبی زندگی اور جدید مابعد الطبعیاتی اقدار کی تلاش میں شکستہ بھی ہیں اس شکستگی نے ایک طرف ہم میں طنز کی کاٹ کو گہرا کر دیا ہے تو دوسری طرف ہمارے لئے زمین و آسمان کے درمیان بہت سی صداقتیں غبار بن گئی ہیں۔ غالب نے جس نئی زندگی اور جس جدید عہد کی آفرینش کو دیکھا تھا ہم اُسی کے مسافر ہیں اور اپنے تاریخی تغیر کے حیر میں ہونے اور نہ ہونے کے درمیان سفر کر رہے ہیں غالب سے پہلے خواجہ میر درد نے اپنے تہذیبی وجود کو داخلی پناہ گاہوں میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی وہ چاہتے تھے کہ انسان اپنے مادّی منطقوں سے اور خارجی تجربوں سے آگے بڑھے اور زندگی کے اُس افق تک اڑان کر سکے جو زمین کی ناآسودہ کشش سے باہر ہے وہ فنا کے میلے سے نکل کر ہمیشگی

کے آئینہ خانوں تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے اُن کا بدنی وجود اور اُن کی روحانی بصیرتیں ہماری قدیم مابعد الطبیعیاتی اور ہماری کلاسیکی تہذیبی اقدار کی علامت ہیں جمیل الدین عالی ان ہی دونوں آئینوں کے درمیان کا ایک عکس ہیں کہ عالی کے خاندانی سلسلے غالب اور درد سے قریب کے سلسلے ہیں تو کیا وہ غالب کی طرح اپنی اہمیت کا شدید احساس رکھتے ہیں اور درد کی طرح دنیا کو بصارتوں اور بصیرتوں کے ساتھ دیکھنا ان کی کوئی داخلی مجبوری بھی ہے عالی کی پوری شخصیت میں اور اُن کی تمام تحریروں میں زندگی کی خواہشوں کو اور خوبصورتیوں کو سمیٹنے کا وسیع تجربہ موجود ہے مگر لاحاصلی بے ثباتی اور احساسِ مرگ اُن کا موجودہ موڑ بھی ہے اس موڑ تک آتے آتے عالی کے سفر میں تجربے اور اظہار کی جو صورتیں سامنے آئی ہیں اُن کا مطالعہ ہماری گفتگو کی بنیاد ہے۔ عالی کی عملی زندگی میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل نیشنل بنک کی انجمنِ ترقیٔ اردو اور اردو کالج کی خدمات اور اس کے علاوہ کئی دوسرے علمی ادبی اور سماجی اداروں سے اُن کا تعلق رہا ہے لیکن ہم اُن کے عملی کاموں کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن کے علمی و ادبی منظرناموں کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ منصوبہ بن کر دنیا میں ہونے والی کئی علمی ادبی اور ثقافتی کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں نظمیں، غزلیں، دوہے، گیت، سفرنامے اور اظہاریے شریک ہیں۔ ان تحریروں میں جو موضوعات سامنے لائے گئے ہیں اُن میں عشق، جمالیات، سماجیات، کلاسیکی تہذیب، جدید تہذیب، ثقافت، تاریخ، سیاحت، علمی و ادبی تجزیے، قدیم اور جدید زمانوں میں ایک ربط کی تلاش، سچائی، امنِ انسانیت، مستقبلیت اور دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں اور دوسری زبانوں کے حوالے سے موجودہ زندگی کی نوعیت، اپنے اور دوسرے سماجوں کا معاشی فرق اور غیر مساوی اور طبقاتی جبر پر ردِعمل پر تنقید، اپنی مٹی سے محبت اور اپنے وطن کی اہمیت وغیرہ شامل ہیں۔ کالموں کی ایک کتاب نقارخانے میں دو سفرنامے "سفرنامۂ چین" اور "سفرنامۂ آئس لینڈ" اور ایک طویل منظوم ڈراما "انسان" ان کی زیرِ ترتیب کتابیں ہیں۔ عالی کی مطبوعات میں غزلیں، دوہے، گیت۔ لاحاصل۔ جیوے جیوے پاکستان۔ تماشا میرے آگے۔ دنیا میرے آگے، صدا کر چلے۔ اور دعا کر چلے ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

"صدا کر چلے" اور "دعا کر چلے" عالی کے اُن کالموں کی کتابیں ہیں جو گزشتہ بیس بائیس برسوں

کے درمیان اخبار میں لکھے گئے ہیں ان اظہاریوں کے موضوعات میں بہت تنوع ہے اور ان کی اساس اپنے معاشرے اور اپنی قوم کے بیچ پیدا ہونے والے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مسئلے پر رکھی گئی ہے سیاسی و سماجی، علمی و ادبی تہذیبی و اخلاقی موضوعات سے لے کر ایک عام آدمی کی زندگی اور اس کی کامیابی و ناکامی تک ان کالموں میں اپنا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہے عالی کے یہ اظہاریے نگاہیہ نہیں ہیں وہ سنجیدہ موضوعات کو سنجیدہ اسلوب میں لکھتے ہیں انھوں نے زندگی کا انصاف حاصل کرنے کے لئے اور اعلیٰ خصوصی تجربوں کی بصیرت کو عمومی سطح تک لے جانے کے لئے کالم لکھے ہیں۔ اُس کا اسلوب عوامی ہے اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی فقرہ یا تحریر کا کوئی حصہ اپنی سطح سے نیچے بھی گر جاتا ہے ان کالموں پر کچھ لوگ ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ ان میں کبھی کبھی علمی و ادبی بقراطیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اصل میں ہر لکھنے والے کا اپنا ایک رنگ اور اپنا ایک مزاج ہوتا ہے جس طرح لوگ مختلف طبقوں میں اور مختلف پسند و ناپسند میں بٹے ہوئے ہیں اسی طرح لکھنے والے بھی اپنی پسند اور اپنی ضرورتوں کو اپنے خاص اسلوب میں لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں اور انھیں متاثر کرنا چاہتے ہیں عالی نے بھی اپنے اظہاریوں کو اپنے ہی انداز میں لکھا ہے۔ اور ہر سطح کے پڑھنے والوں کو متاثر کرنے کی کوشش بھی کی ہے جس کی گواہی اُن کے دونوں کتابوں "صدا کر چلے" اور "دعا کر چلے" میں موجود ہے۔ عالی بنیادی طور پر صحافی نہیں ہیں بلکہ شاعر و ادیب ہیں وہ صحافت بھی کرتے ہیں تو ان کا اظہار ادبی و شاعرانہ ہی رہتا ہے

عالی کی دوسری نثری جہت اُن کے سفرنامے ہیں جو نہ صرف اُن کے کالموں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں بلکہ سفرنامے کی پوری تاریخ میں انہیں خصوصی نوعیت حاصل ہے۔ "دنیا میرے آگے" اور "تماشا میرے آگے" عالی کے مختلف سفرناموں سے مرتب کی ہوئی کتابیں ہیں ان سفرناموں میں ایران عراق۔ لبنان۔ مصر۔ روس۔ فرانس۔ برطانیہ۔ جرمنی۔ اٹلی۔ ہالینڈ۔ سوئٹزرلینڈ اور امریکہ شامل ہیں۔ دنیا کر ملک عالی کے لئے انسانی تہذیب اور انسانی ارتقاء کی علامت ہیں معلوم تاریخ میں انسان نے جو مادی اور روحانی زمینوں اور آسمانوں کو تسخیر کیا ہے اور فکر و عمل کے جو ماہ و خورشید تخلیق کئے ہیں عالی نے ایک فطری سیاح کی حیثیت سے اُنھیں دیکھنے اور اُنھیں جاننے کی کوشش

کی ہے۔ عالی کے ان سفرناموں کی اساس اعداد و شمار پر یا شہروں کی عمارتوں یا سڑکوں کی تفصیل پر یا خواتین کی ملاقاتوں پر نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے سفرناموں میں مختلف انسانی نسلوں کے فرق کو اور اُن کے حادثات و افکار کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ عالی کے سفرنامے زندگی اور تاریخ کا ایک تسلسل رکھتے ہیں وہ موجودہ عہد سے قدیم زمانوں تک سفر کرتے ہیں اور ہزاروں سال پہلے کے واقعات کو موجودہ عہد سے جوڑنا چاہتے ہیں انہوں نے اپنے سفرناموں میں مختلف شہروں کے ماضی کی جو زندہ تصویریں [illegible] کے گہرے مشاہدے کی اُن کے تاریخی شعور کی اُن کے بے باک لہجے کی اور اُن کے درد مند احساس کی پہچان ہیں انہوں نے ہر جگہ سامراج دشمنی انسان دوستی اور پاکستان سے محبت کی سفارش کی ہے۔ اُن کی سیاحی میں مہم جوئی کی اہمیت ہے۔ عالی نے اپنی سیاحتوں میں خود کو گم نہیں کیا ہے بلکہ مختلف لوگوں کو مختلف اشیاء کو اور مختلف تصورات کو اپنے باطن میں پناہ دی ہے کہ اُن کے علمی رویّوں میں ایک مشرقی روح اور ایک تہذیبی مزاج کی گردش کا احساس ہوتا ہے عالی کے طنز میں ہمدردیوں کے لمس کو اور ان کی اجنبیت میں انسانی تصوّر کو زینہ زینہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ یورپ کے سامنے مشرقی تہذیب کی عظمت کو رکھنا چاہتے ہیں سیاسیات کی عصبیت کو نظریاتی پرستی کا محدود حوالہ کم ہی بناتے ہیں انھوں نے جس شہر اور جس ملک میں ناہمواریوں کو دیکھا ہے اسے بے خوف ہو کر لکھ دیا ہے۔ وہ مصلحت پسندی کے دشمن ہیں اسی لئے ایک آدھ ملک نے عالی کے خلاف پروٹسٹ بھی کیا ہے کہ آزاد خیالی، نفسیات شناسی، نکتہ آفرینی اور حب الوطنی اُن کی بنیادی صفات میں شامل ہیں۔

عالی کے سفرنامے صرف اُن کا ذاتی مشاہدہ ہی نہیں ہیں انہوں نے اپنے اس مشاہدے میں پورے عہد کو شریک کیا ہے کہ موجودہ زمانے کے کئی بہت اہم شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئی ہیں جن کے حوالے سے اُن کے سفرناموں نے ایک نمائندہ خصوصیت حاصل کر لی ہے انھوں نے اپنے ان سفرناموں میں ایک عام آدمی سے لے کر بعض سربراہِ مملکت تک کی اہمیتوں کو جاننے کی کوشش کی ہے انسان اور اُس کے آسودہ اور غیر آسودہ وجود کی تلاش میں انھوں نے بہت سے خطرات بھی برداشت کئے ہیں۔ وہ ایک بے خوف سیاح کی طرح ملکوں ملکوں شہروں شہروں پھرے ہیں اور اپنے تجربوں میں اضافے کرتے چلے گئے ہیں۔ عمرانیات، معاشیات، آثارِ قدیمہ، آثارِ جدیدہ قوم کی اصلاح

مساوات کے نظاموں اور فلسفوں کے بارے میں ان کی دلچسپی گہری رہی ہے۔ انھوں نے دنیا کی بڑی قوموں کو دیکھ کر اپنی گمشدہ مشرقی عظمت کو تلاش کرنا چاہا ہے وہ پاکستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں اور بری سے بڑی ترقی یافتہ زمین پر اپنی مٹی کی خوشبو اور اپنی زمین کا نام پھیلانا چاہتے ہیں عالی کے مزاج میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو جدید عہد کے ایک سفر نگار کے لئے ضروری ہو سکتی ہیں۔ ان سفر ناموں میں کچھ تاریخی اور کچھ واقعیاتی ناہمواریوں کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اتنے طویل سفر میں کہیں تھکن کا احساس ہو جانا اور کہیں نیند کا غالب آجانا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے ان سفر ناموں کے اسلوب میں اور ان کے اظہار میں جو سادگی اور جو بے ساختہ پن موجود ہے وہ پڑھنے والے کو ہر سطح پر متاثر کرتا ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ عالی نے کالموں کی طرح ان سفر ناموں میں بھی کہیں کہیں خود احتسابی کرتے ہوئے یا طنز کرتے ہوئے سنجیدہ طرزِ اظہار کو توڑ دیا ہے کہ عالی کے مزاج میں ہر شے اور ہر شخص سے مکالمہ کرنے کا رجحان ان کی بنیادی صفت سہی لیکن اس بات نے ان کی کئی نثری تحریروں کو داغ بھی لگایا ہے مجموعی طور پر اُن کے سفر نامے بیسویں صدی میں لکھے ہوئے ایسے سفر نامے ہیں جو انسانی تاریخ و تہذیب کو اور انسانی علمی و فکری ارتقاد کو اپنے طور پر ہم سے متعارف کراتے ہیں اور ہم دنیا کی مختلف زمینوں اور آسمانوں کے درمیان ان اجالوں اُن اندھیروں اور اُن پرچھائیوں کو دیکھتے اور پہچانتے چلے جاتے ہیں جو نہ صرف ہمارے خارجی علم کو بڑھاتی ہیں بلکہ ہمیں ہماری اپنی معنویت سے بھی قریب تر کر دیتی ہیں۔

عالی کی نثری تحریروں میں وہ طویل اور مختصر تحریریں بھی شامل ہیں جو انھوں نے انجمن ترقی اُردو کی مطبوعات پر "حرفِ چند" کے عنوان سے لکھی ہیں ان تحریروں میں عالی کا اپنا ایک علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک آدھ ڈرامے میں ترجمے کا کچھ کام کیا ہے اور لغت کے حوالے سے کچھ تالیفات بھی کی ہیں اسکے علاوہ عالی نے بڑے پیمانے پر علمی و ادبی اور ذاتی خطوط بھی لکھے ہیں جن کا مرتب ہونا ابھی باقی ہے۔

عالی کی پہلی تخلیقی جہت شاعری ہے اور شاعری ہی اُن کی مرکزی شناخت بھی ہے وہ کوئی چالیس پینتالیس برسوں سے شعر لکھ رہے ہیں۔ "غزلیں دوہے گیت" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو تیس سال پہلے انیس سو اٹھاون میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب میں محمد حسن عسکری کا

دیباچہ بھی ہے جو عالی کی تیس سال پہلے تک کی شعری و تخلیقی صلاحیتوں کا تجزیہ کرتا ہے عسکری صاحب نے لکھا ہے کہ

> عالی خود کو مشاعرے باز کہتے ہیں چلو عالی مشاعرے باز سہی مگر اُن میں اچھے مشاعرہ بازوں کی یہ دونوں صحتمند خصوصیتیں موجود ہیں یعنی اُن میں کھلے دل سے اپنی بات دوسروں کے سامنے کہنے کی ہمّت بھی ہے اور دوسروں کی ذہنی اور جذباتی صلاحیت پر اعتماد بھی ہے اور ساتھ ہی سامعین سے مغلوب ہونے کی طاقت بھی۔ مشاعرے باز شاعر ہوں یا غیر مشاعرے باز شاعر آج کل کے زمانے میں یہ تین باتیں کسی ایک شاعر میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ عالی کے یہاں ترنم اور شعر یک جان ہوتے ہیں اُن کی خوش گلوئی اُن کی غزل میں گونجتی ہے اپنی آواز اور اپنی شخصیّت کے آہنگ کو شعر میں سمو دینا کوئی معمولی بات نہیں عالی کے یہاں اسی اہلیت کی نشوونما اگر مشاعرے میں نہیں ہوئی تو کہاں ہوئی ہے؟ عالی کے شعر بیک وقت دل اور دماغ دونوں سے تخاطب کرتے ہیں اگر جذبے کا خلوص اور تازگی دل پر اثر انداز ہوتی ہے تو رویّے کا تیکھا پن اور انداز بیان کی شوخی ذہن کو چھیڑتی ہے دماغ اور دل کی یہ سنگت اگر مشاعرے میں پڑھنے کی مجبوری سے حاصل نہیں ہوئی ہے تو پھر کہاں سے ہوئی ہے؟

عالی کی ابتدائی غزل اپنے آہنگ اور اپنے اسلوب کے اعتبار سے بہت حد تک فارسی کی ترکیبوں اور فارسی کی لفظیات سے کسی حد تک گریزاں ہے وہ غالب سے اپنی نسبتوں پر فخر کرتے ہیں اور ان کی بہت سی غزلوں پر غزلیں بھی کہتے ہیں لیکن غالب کی غزل اور غالب کا مزاج فکری تجربانی اور فلسفیانہ ہے عالی کی غزل رومانی اور خیالی ہے جس میں غنائیت کی لَے بڑی حد تک تیز ہے یہی سبب ہے کہ ان کی غزل اور اُن کا ترنم دونوں مِل کر ایک ایسی لہر پیدا کرتے ہیں جو بقول عسکری صاحب دل اور دماغ کو ایک ہی وقت میں متاثر کر جاتی ہے انیس سو ساٹھ اکاون تک کی غزل میں عالی کے یہاں موضوعات کا کوئی تنوّع نظر نہیں آتا ہے وہی ایک محبوب ہے اُس کا عشق ہے اس کا انتظار ہے پھر احساسِ شکست ہے اور بعد میں اُسے بھول جانے یا اپنی ذات کو دوسروں میں گم کر

دینے کا تجربہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے ہماری بیشتر غزل ان ہی منطقوں کے درمیان اپنا اظہار کرتی رہی ہے اتنا ضرور ہوا ہے کہ غزل کے ہر اہم شاعر نے کہیں کہیں اپنے ذاتی تجربوں کے اضافے کئے ہیں اور اپنی غزل کے رنگ و آہنگ کو حرف تازہ سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ عالی کی غزل میں زندگی کے عشقیہ تجربوں اور ان کے اظہار کو ہم شعروں کے حوالے سے دیکھتے ہیں ۔

کہیں تو ہوگی ملاقات اے چمن آرا
کہ میں بھی ہوں تیری خوشبو کی طرح آوارہ

یہ ایک گداز عجب رنگ کا بیاں ہوتا
کوئی رقیب جو اپنے بھی درمیاں ہوتا

کوئی تو رنگِ سخن دے کہ لوگ کہتے ہیں
لگی تھی آگ تو کچھ آگ کا نشاں ہوتا

چھٹا ہے ذہن سے کتنی کثافتوں کا غبار
ترے چمن کی ترے رنگ و بو کی یاد آئی

گذر رہی ہے عجب طرح زندگی عالی
نہ بجھ رہا ہے چراغ اور نہ جل رہا ہے چراغ

ایک جستجو تو ہے ایک گفتگو تو ہے
اس صدی میں پھر یارو عاشقی غنیمت ہے

ہنسی میں تلخیٔ ایام کو چھپائے ہوئے
چلے چلو یونہی بارِ حیات اٹھائے ہوئے

بھٹکنے والو اندھیرے نہ مٹ سکیں گے ابھی
جو ہو سکے تو وہی اک چراغ عشق جلاؤ

عالی اپنی شدت تباہی پر کسی کا ترس کھانا پسند نہیں کرتے کہ وہ عمر بھر اپنے روز و شب میں زندہ رہے ہیں۔ "چراغِ عشق جلاؤ" کوئی نظریاتی نعرہ یا پارٹی کا جھنڈا نہیں ہے بلکہ خود کلامی کا لہجہ ہے جس میں شاعر عالی جبیل الدین سے کہتے ہیں کہ ہجروں اور تنہائیوں کے اندھیرے

موسموں میں بھی عشق کی آگ کو اپنے اندر جلائے رکھنا ہے کہ یہ ہماری تہذیبی روایت بھی ہے اور زندگی کی ضرورت بھی ہے۔ عالی کے انتظار کو اہمیت تو حاصل ہے لیکن ان کا لہجہ بہت حد تک جذباتی اور رومانی ہو گیا ہے وہ حالات کی ان رکاوٹوں کا تجزیہ نہیں کرتے جو عشق اور حسن کے درمیان کھڑی کر دی جاتی ہیں بلکہ وہ خوبصورت خوابوں کو دیکھنے کے لئے آنکھوں کو بند کر لیتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ

ویران ہے جمیلؔ تمہارا کب آؤ گے
روح و نظر کے انجمن آرا کب آؤ گے
کوئی ایسا نہیں عالی بھی تو گھر رکھتا ہے
کیا بگڑ جائے گا اک بار وہاں جانے سے
بہت دنوں سے ترا انتظار ہے آ جا
اور اب تو خاص وہی موسم بہار ہے آجا
کہاں یہ ہوش کہ اسلوب تازہ میں تجھے لکھوں
کہ روح تیرے لئے سخت بے قرار ہے آجا
جانِ خلوص و روحِ تمنّا کہیں جسے
ہم اس کو ڈھونڈتے ہیں کہ اپنا کہیں جسے
ابھی ہے آس کہ آخر کبھی تو آئے گا
وہ ایک لمحہ کہ جب تیرا انتظار نہ ہو

عالی کی تباہی کا باعث کچھ اور نہیں وہ خود ہی ہے
اک کونپل ہے جو اپنی ہی آواز سے جلتی جاتی ہے

انتظار ایک شعلۂ آواز ہی تو ہے جو چاہنے والوں کو مٹی کر دیتا ہے لیکن عالی اس ہجر سے نکل کر ایک زیادہ خطرناک اندھیرے میں اترتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ رات کی ہر چھایوں کے درمیان چراغ کی خواہش بھی کٹ گئی ہے پوری عمر کے اس کھیل میں انھوں نے اپنے وجود کے داخلی شعلے کو بجھتے ہوئے دیکھا تو وہ کچھ گمشدہ تجربوں کی بازیافت کرنے لگے شعور سے

لاشعور کے سفر تک جو خواب انھوں نے دیکھے اور جو منظر انہیں یاد آئے اور جو سوال انہیں ستائی دیئے عالی نے انہیں لکھنا چاہا ہے اس حوالے سے انھوں نے علم سے زیادہ عمل کو اور کتاب سے زیادہ تجربے کو اہمیت دی ہے انھوں نے اپنے منظوم ڈرامے انسان میں ایک جگہ بڑی خوبصورتی سے اس بات کو کہنے کی کوشش کی ہے۔

کتابیں کیا ہیں
لفظوں کی ہزاروں کنواریاں
اک دوسرے کو چومنے والی
تھرکتی ناچتی کمسن پتلیاں
سب اپنے اپنے مرکزوں پر گھومنے والی
یہ جب تک تجربوں کی سخت باہوں سے نہ گزریں
بانجھ رہتی ہیں

عالی جانتے ہیں کہ بے عملی کا بنجر پن عمل کے دکھ سے زیادہ سستا ہے کوئی بانجھ عورت کتنی ہی خوبصورت ہو لیکن اس کا وجود تخلیقی عمل سے گزرے بغیر گلاب کی طرح نہیں مہک سکتا تجرباتی جذبات اور فکری تھکن بھی ایک طرح کا بنجر پن ہے ایک طرح کی بے عملی ہے جسے کوئی زندہ آدمی اپنے جسم و جاں کا حصہ بنانا پسند نہیں کرتا عالی نے اس حالت کو لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن جس طرح علم اپنے عمل کے بغیر زندہ نہیں ہوتا اسی طرح عمل بھی اپنے علم کے بغیر ادھورا رہتا ہے کتاب یا لکھی ہوئی تحریریں صرف علم ہی کو پیش نہیں کرتیں بلکہ عمل کی تحریک بھی پیدا کرتی ہیں کہ بے عملی ہی بے عملی کی پہچان ہے اور شاید عالی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ

ذہن پر چھا گئی موت کی بے حسی نیند آنے لگی
ڈھونڈتا ہوں اندھیروں میں آسودگی نیند آنے لگی
حیرت انگیز رنگوں میں لپٹی ہوئی مضطرب نغمگی
آج تک اپنی لے میں نہیں ڈھل سکی نیند آنے لگی

کیوں بجھ گئے ہو آتشِ پنہاں کو کیا ہوا
عالی تمہارے سوزِ دل و جاں کو کیا ہوا

کیوں آ گیا ہے ضبط و سلیقہ خطاب میں
اس شدتِ خلوصِ فراواں کو کیا ہوا

ہے رہگذر ہی تری باعثِ سکوں لیکن
وہ کیا کریں جو تری رہگذر بھی دیکھ چکے

اب انتظار کی کچھ اور منزلیں اے دوست
کہ تیرے چاہنے والے سحر بھی دیکھ چکے

نہیں معلوم کیوں، طبیعت میں
آج رونے سے کچھ سکوں نہ ہوا

شاید اب کے برس ہے خشم جنوں
فصلِ گل میں مجھے جنوں نہ ہوا

جنونِ دشت پسندی بتائے دیتا ہے
گزارنی تھی جو گھر میں وہ ہم گزار آئے

عالی کی غزل میں ایک ایسی چبھن کا احساس بھی ہوتا ہے جو انسانی شکست سے اور اندرونی تضادات اور کشمکش سے وجود میں آتی ہے معلوم نہیں عالی نے اپنی شکست کو رد کر دیا ہے یا اپنے اضطراب پر اختیار کو بڑھانے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا ضرور لگتا ہے کہ جذبوں کا بے تحاشا دوڑنا اور خواہشوں کا اڑتے چلے جانا کم ہو گیا ہے چراغ جلتے جلتے بجھنے لگا ہے اور عالی عشق کے سفر میں کہیں رک کر کوئی نیا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس فیصلے میں گذشتہ خوابوں کی شکستہ آوازیں بھی ہیں اور موجودہ لمحے کی حقیقت پسندی بھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

کوئی خطا نہ ہوئی جس کی یہ ملی پاداش
مگر یہی کہ زمینوں کو آسماں نہ کہا

کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دم ساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز

دل و جگر ہیں کہ گرمی سے پگھلے جاتے ہیں
کوئی چراغِ تمنا جلا کے بھول گیا
جانے کیوں اک در و دیوار کا پابند ہوا
میں کہ منسوب کئے جاتے تھے صحرا مجھ سے
عمر بھر تہمتِ وحشت سے نبھائی ہم نے
گو ہمیں رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا
ہزار تپتی ہوئی صورتیں نظر آئیں
مگر ہر ایک تبسم کی لَو تھی اشک آمیز
بہل ہی جائے گا دل جیسے آج تک بہلا
گذر چکی ہے بہت رات اب دیئے نہ جلاؤ
وقت نے مٹا ڈالے وہ گلاب سے رخسار
اب تو زرد چہروں کی دلکشی غنیمت ہے

عسکری صاحب نے عالی کی داخلی کیفیات کے بارے میں لکھا تھا کہ

"عالی کے یہاں اس بات کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ وہ کسی جذبے سے کترا رہے ہوں یا اُس کے اظہار میں حجاب سے کام لے رہے ہیں کھلے دِل سے بات کرنے اور گھبرائے بغیر جذبات کا بے لاگ طریقے سے اظہار کرنے کی بدولت اُن کے کلام میں ایک ایسی سادگی اور معصومیت آ گئی ہے جس کی آرزو ہر شاعر کو کرنا چاہیئے۔ الم ہو یا انشاط کامیابی ہو یا محرومی کسی چیز کے بیان میں اُن کی آواز ڈر سے کپکپاتی نہیں وہ ہمیشہ جم کر بولتے ہیں جذبات کا خوف عالی میں نام کو نہیں ہے میرے خیال میں یہ اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس قوت کے بل پر وہ اگر چاہیں تو اس سے بہتر شاعری تخلیق کر سکتے ہیں۔ عشقیہ زندگی میں سب سے بڑی قوت تو یہی ہوتی ہے کہ آدمی ڈھے جانے کے بعد پھر اُٹھ کھڑا ہو اور اس طرح کے زمین پہ قدم

پہلے سے زیادہ مضبوطی سے جمے ہوں لیکن ایسا تو اُردو شاعری میں بس دو بار ہی ہوا ہے ایک تو میر کے یہاں دوسرے فراق کے یہاں اگر یہ نہیں تو آدمی میں اتنی طاقت تو ہو کہ ڈھے جانے کے بعد لیٹا کے لیٹا ہی نہ رہ جائے عالی کو سنبھلنا آتا ہے اس لئے گداز کے باوجود اُن کے عشق میں سڑاند پیدا نہیں ہوئی کسی قسم کے پینترے بازی کے بغیر عالی اپنے آپ کو غم کی گراوٹ سے بچا لیتے ہیں۔ عالی کی شاعری بے حاصلی کا رونا نہیں ہے عالی کا لہجہ طربیہ نہیں بلکہ ان کا الم بھی ایک لہک رکھتا ہے۔"

عسکری صاحب کے اس گفتگو کے حوالے سے کچھ اور کہنا تو مشکل ہے صرف اتنا دیکھا جا سکتا ہے کہ عالی نے اپنے عشقیہ تجربوں میں کچھ بھی کہا ہو لیکن ان کے اظہار اور اُن کے اسلوب میں اس بات کا احساس شدت سے ہوتا ہے کہ عالی اپنی انیس سو ساٹھ دن تک کی غزل میں کوئی منفرد آواز تو تلاش نہیں کر سکے ہیں لیکن انھوں نے ایک ایسی غزل ضرور لکھی ہے جو اپنے تجربوں کی سچائی سے اور اپنی داخلی و خارجی عنایت سے پڑھنے اور سننے والے کو متاثر کر لیتی ہے۔

"غزل دوہے گیت" پر اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اُس میں اُن کے دوہے ان کا بنیادی تخلیقی حوالہ بھی بنتے ہیں اور یہی اُن کی انفرادیت کی پہچان بھی ٹھہرے ہیں معلوم نہیں کہ عالی نے خود اس بات کو کسی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے کہ دوہے کا شاعر ہونا ان کی تخلیقی انفرادیت کا اعتراف ہے یا ان کی فنی صلاحیت کی ناطاقتی کا اظہار ہے عالی اپنی نثر میں اور اپنی شاعری میں اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ

"دیکھو شاعری کی تاریخ میں یا تنقید لکھنے والوں میں میرا نام ایک دوہے لکھنے والے کے طور پر لیا جاتا ہے۔

عالی جی کا فن سخن میں اک انداز نرالا تھا
نقدِ سخن میں ذکر یہ آیا دوہے پڑھنے والا تھا

سوال یہ ہے کہ جب پیشہ ور اور غیر پیشہ ور سب ہی لکھنے والوں نے عالی کو دوہوں کا بہت اچھا شاعر مان لیا ہے اور نہ صرف ہندو پاک میں بلکہ عالمی سطح پر اُن کے دوہے مقبولیت اور شہرت پا چکے ہیں تو عالی خود اپنے دوہوں کو پوری اہمیت کیوں نہیں دیتے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ دوہے کے کلچر سے اور اس کے رنگ و آہنگ سے ڈر گئے ہوں کہ دوہے کا داخلی اور خارجی وجود ہندی روایات اور ہندی مزاج سے بنتا ہے ہندی کی لفظیات اس کی دیومالائی کہانیاں اور اس کے کردار سب مل کر دوہے کے وجود کی تشکیل کرتی ہیں۔ اگر میں عالی کے اس خوف کو امکان کے دائرہ پر بھی سمجھ رہا ہوں تو کیا یہ بھی درست ہے کہ انہوں نے اپنے مزاج اور اپنی داخلی خواہشوں کی ہم آہنگیوں کی بنیاد پر دوہے لکھنا تو شروع کر دیئے لیکن دوہوں کی اصلیت تو ان کے خارجی اور ظاہری وجود دونوں کو انقلابی حد تک بدل دیا۔ دوہے کے حوالے سے جو بہت اہم نام ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں خانِ خاناں، بہاری لال، تلسی داس، امیر خسرو، بھگت کبیر، سورداس گرو نانک اور بابا فرید کے نام ہیں جن کے دوہے ہندوستان کی قدیم شعری روایت کو اور اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت کو اظہار میں لاتے ہیں جہاں "برہا اگنی" کو عورت کی طرف سے بیان کیا جاتا تھا اور ہندی دوہا اپنے اظہار میں کسی بدیسی شبدھ کو یا کسی غیر کہانی کو قبول نہیں کرتا تھا عالی نے جو دوہے لکھے ہیں ان میں نہ تو "برہا اگنی" ہے اور نہ ہی ان کے بولنے میں کسی عورت کی کوئی آواز سنائی دیتی ہے عالی کے دوہوں میں جو مضامین یا جو تجربے بیان کئے گئے ہیں وہ موجودہ عہد کے حوالے سے جمالیاتی بھی ہیں سماجی و سیاسی بھی ہیں ذاتی بھی ہیں اور سیاحی بھی ہیں پھر ان دوہوں کی بحریں بھی روایتی دوہوں کی بحریں نہیں ہیں بلکہ غزل کی بحریں ہیں اتنا فرق ہے کہ عالی کے دوہوں کی شعریات کچھ ہندی لفظوں سے اور چند ہندی دیومالائی کرداروں سے مل کر بنی ہے معنوی اعتبار سے ان دوہوں میں جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے وہ بیشتر ہمارے معاشرتی سماجی سیاسی اور ہماری جمالیاتی صورتحال سے قریب تر ہے عالی کے دوہے موجودہ ہندوستان کی جنم بھومی سے یا ان کی سماجیات سے کوئی ذاتی پیوند نہیں رکھتے ہیں بلکہ عالی کے بیشتر دوہوں کا تجربہ اور ان کا پس منظر سابقہ مشرقی پاکستان ہے جہاں غربت و افلاس اور ناانصافی و ظلم کی ان گنت تمثیلیں موجود تھیں اور جس

کی بنیاد پر مظلومیت نے سرمایہ دار ظالموں کو ٹکڑوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔ عالی کے یہاں اپنے دوہوں کو پوری اہمیت نہ دینے کے معنی اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ عالی کو خود یہ احساس ہو گیا ہے یا کسی نے انہیں اس نام نہاد خوف میں ڈال دیا ہے کہ یہ دوہے ان کی وطن پرستی کے یا ان کے قومی تشخص کے خلاف ہیں شاید اسی لئے انھوں نے دوہے لکھنا ترک کر دیا ہے یا پھر بہت دونوں سے وہ اپنے تازہ دوہے سنا نہیں رہے ہیں اس حوالے سے ایک گواہی تو خود ان کے دوہوں کے درمیان ہی موجود ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ

گاؤں کے لوگ نہیں پہچانے چپ رہے ساہوکار
اے ترے دوہوں کی گٹھری رہ گئی ہے اس پار
جاننے والے دکھ سے چپ تھے پر بچے چلّائے
عالی جی تم کویتا جی کو کس رن میں چھوڑ آئے
ٹوٹ گئے ترے کھیل کھلونے چھن گئے تیرے پھول
عالی مت اب آنا واپس لوگ تجھے گئے بھول

دوہوں کی جمالیات اور دوہوں کا بنیادی دکھ عالی کی داخلی خواہشوں اور ان کے مزاج کی ضرورت بن کر تخلیقی شکل میں سامنے آیا ہے یہ سچ ہے عالی کی جو ہم آہنگی دوہوں سے ہے وہ کسی دوسری تخلیقی صنف سے نہیں ہے آیئے پہلے چند جمالیاتی دوہے دیکھتے ہیں کہ کالی بدلیوں کی برکھا برستی ہے تو ہر بوند عالی کے بدن پر ایک کٹار بن کر گرتی ہے اور وہ محسوس کرنے اور خواب دیکھنے میں گم ہو جاتے ہیں۔

بن کنگن بن چوڑی باہیں کندن جیسا رنگ
من میں کیا کیا آتی ہے جب ہم ہوں تیرے سنگ

ٹھنڈی چاندنی اجلا بستر بھیگی بھیگی رین
سب کچھ ہے پر وہ نہیں جن کو ترس گئے مرے نین
ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے
گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا رُوپ
تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں کہ دُھوپ
عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیّا کہہ کئی نار
دکھاؤ آخر چولی سے کیا چیز یہ اُبھری آئے
گوری ہم تو چنگی بالو ہم سے کیوں شرمائے
جن کے پاؤں کی مٹی سونا جن کی نظر تلوار
عالی جیسے بھوکے بانکے چاہیں ان سے پیار
ڈھونڈیو میری نار کی اس کی ہے اِک پہچان
چُٹکی لو تو پگھل بہے اور پوجو تو بھگوان

عالی میں ایک بنجارہ دوہا نگار بھی موجود ہے جو شہروں شہروں پھرتا اور ہر شہر کے "روپ انوپ" کو اپنے دوہوں میں قید کرتا چلا جاتا ہے انھوں نے دوہوں میں جو سفرنامے لکھے ہیں ان میں دو ایک مثالیں دیکھیے۔

حیدر آباد کا ملک جو دیکھا تھا انگریز کا ٹوٹ
جب تک ساکھ رہے چاندی ہے پرکھ لیا تو کھوٹ
ہم کو حیدر آباد نہ بھایا تھا جو رُوپ انوپ
اندر کتنی کالک تھی اور باہر کتنی دُھوپ
دو اندھیاروں میں کل عالی بن گئی اپنی بات
ایک طرف تھی دکنی ابلا ایک طرف تھی رات

بمبئی شہر جو پہنچے عالی آنکھیں تھیں حیران
کتنی چوڑی سڑکیں کتنے اونچے مکان
شہر کے اندر ریل چلے اور سر پل اک تیار
بھائی کو بھائی نہیں پہچانے گھڑی تکے ہر بار

یہ بجائے خود ہے موجودہ زندگی کی جدید صورتوں سے اور جدید انسان کی نئی نفسیات سے پوری شناسائی رکھتے ہیں بڑے شہروں میں آدمی کی مصروفیت اور رشتوں کی بے اہمیتی کو اور شہر کی خوبصورتیوں کو ان دونوں کا پس منظر بنایا گیا ہے۔ اس انداز کا ایک تجرباتی سفر پاکستان میں "نیا گل کے پائن ہوٹل" کا بھی ہے جہاں عالی نے رنگ برنگی پھولوں کا مشاہدہ کیا ہے اور انھیں اپنے درد کا موضوع بنایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

ایک بدیسی نار کی موہنی صورت ہم کو بھائی
اور وہ پہلی نار تھی بھیّا جو نکلی ہرجائی
ہم بھی تازہ پھول سے چھیلا وہ بھی روپ بہار
لیکن پریم سے بڑھ کر پیارے پیسے کی ہے مار
بیر بہوٹی رنگت عالی ایک ناری انگریز
بات میں کتنی سیدھی سنبھلی گھات میں کتنی تیز
ایک فرانسیسی ابلا تھی الگ تھلگ چپ چاپ
ایسے پیارے لوگ دکھی ہوں ہائے یہ کیسا پاپ
برقعہ پوش پھٹانی جس کی لاج میں سو سو روپ
کھل کے نہ دیکھی پھر بھی دیکھی ہم نے چھاؤں میں دھوپ
اک لاہور کی تیکھی بانکی پڑھی لکھی مغرور
شاعر کو آوارہ کہوے افسر کو مزدور
واہ کی کنواری جس کے اک اک انگ میں کیا کیا لوچ
جس پر آنکھ کا پل بھر پڑنا جیون بھر کی سوچ

عالی تیرا بھید ہے کیا ہر دو ہے پر بل کھائے
میں جانوں ترے پاپی من کو گھر والی یاد آئے
وہ ترے بچے پالنے والی وہ ترے گھر کی لاج
کیا اُسے بھول کے مست ہُوا ہے تُف تجھ پر کوئی راج

ہیئت اور ساخت کے اعتبار سے یہ دوہے نظیر دوہے ہیں کہ ان کے معنوی تسلسل میں ابتدا کو درمیان کو اور اختتام کو جس طرح لکھا گیا ہے وہ نظم ہی کی تیکنیک ہے۔

عالی کے دوہوں کا ایک اور اہم تجربہ معاشرے کی طبقاتی کشمکش سے پیدا ہوا ہے انہوں نے نثر میں بھی اور شاعری میں بھی سماجی ناانصافیوں کو اور غیر مساوی رویّوں کو بے خوف نظر کے ساتھ ہمارے سامنے رکھا ہے عالی نے دوسرے ملکوں کی غیر انسانی ناہمواریوں کو جس تجربے کے ساتھ لکھا ہے اُس طرح اپنے معاشرے پر بھی تنقید کی ہے۔ دوہوں سے ترتیب دی ہوئی سماجی ناانصافیوں کی ایک اور نظمیہ تصویر دیکھیے۔

گاؤں کی سب سے سندر ابلا مار گئے سرکار
گاؤں کی نمبر اوّل گیّا لے گئے تھانیدار
بھوکی آنکھ سے بیٹا دیکھے خالی پیٹ ہو باپ
ساوتری ماں بیٹی لاج سے روز کرائے پاپ
کھیتی سونا چاندی اُگلے گھر میں پہنچے روگ
پیاسی آگ لگائے چبائے بنیئے اڑائیں بھوگ
اے بھیّن اس دھرتی ماں کی کوکھ میں سب کا ناج
اے بھیّن اس دھرتی ماں پر ایک کرے کیوں راج
چھوٹے ایک دوجے کو جلائیں بنتے جائیں راکھ
نیتا تاپیں ہاتھ مزے سے اور بڑھائیں ساکھ
ہم سب اُس کے پریم پجاری ہم سب اُس کے داس
پر یہ کیا انیائے کہ بھگوان ہے بنیئے کے پاس

ایک دوجے کا ہاتھ پکڑ لو اور آواز لگاؤ
اے اندھیاروں سورن آیا سُورج آیا جاؤ

دونوں کے رنگ و آہنگ میں یہ نظم "بنیئے اور کسان" کے درمیان جابر اور مجبور کے درمیان سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان اُس کشمکش کو سامنے لاتی ہے جس نے سماجی زندگی کو مجہول و مفلوج کر رکھا ہے۔ طبقوں کی اونچ نیچ میں اور اُن کے اُتار چڑھاؤ میں انسانی سلاحیتیں اور اُس کی قوتیں جس طرح رائیگاں ہوتی ہیں وہ انسانی تاریخ کا ایک المیہ بھی ہے اور ایک رزمیہ بھی ہے۔ عالی نے ہمیشہ اس المیاتی رزمیے کو بڑی اہمیت دی ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کے فرد ہیں جہاں جھوٹ کی شہرت سچائی سے زیادہ ہے جہاں روشنیاں اندھیروں سے شکست کھاتی ہیں اور جہاں کسی کی کوئی پہچان باقی نہیں ہے کہ پورے خدوخال رکھنے والے چہرے کاٹ دیئے جاتے ہیں اور سفید جسموں کو کالے غبار کا لباس پہنا دیا جاتا ہے عالی نے اِس جبر کو اور اس خود غرضی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اسے اپنی ذات کے حوالے سے لکھنے کی کوشش کی ہے

عالی جی ایک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام
جیون بھر فرودش رہیں اور جیون بھر بدنام
کوئی کہے یہ لئے پھرے ہے روزنی اک نار
کوئی کہے یہ بڑا سکھی ہے اس کے ہزاروں یار
کوئی کہے یہ پھلواری ہے کوئی کہے ویران
کوئی کہے یہ بگلا بھگت ہے کوئی کہے گنوان
کوئی کہے یہ راج کوی ہے سورج اسکی راس
کوئی کہے یہ سوکھا پھول ہے اس میں رنگ نا باس
کوئی کہے اسے جیون ساتھی کوئی کہے جنجال
کوئی کہے اسے اتھلا پانی کوئی کہے پاتال
کس کو خبر یہ ہنس مکھ عالی کیا کیا چھپ کر روئے
جیسا ساتھی من ڈھونڈے تھا ویسا ملے نہ کوئے

ان دو ہوں میں جن عمرانی تضادات کو اور ان کے حل کو پیش کیا گیا ہے اُس سے ہم اپنے معاشرے کی صورت حال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ عالی کے ان دوہوں میں نراجیت اور نا آسودگی کے ساتھ ساتھ رجائیت اور تازہ خواہشوں کی آواز بھی ملتی ہے جو یاسیوں اور جبر کی دیواروں کو شکستہ کر دینے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہتی ہے عالی نے دوہے سے ایک ایسے تیشے کا کام بھی لیا ہے جس نے کہنہ کالی چٹانوں کو کاٹ کر اجلے پانیوں کی تازہ تر نہریں نکالی ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے عالی کے دوہوں کے بارے میں لکھا ہے کہ "وسط ایشیائی مسلم تہذیب اور برصغیر کی ہند آریائی تہذیب کے درمیان اختلاط کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بدلے میں تخلیقی سطح پر دوہا پیدا ہوا ہے عالی کے دوہے ہند آریائی تہذیب سے ارتباط قائم کرنے کی ایک تخلیقی کاوش کا اظہار ہیں"۔ ہمارے خیال میں ڈاکٹر فوق نے اپنی اس رائے میں دو مختلف تہذیبوں کے ملے ہوئے کناروں کو الگ کر کے دوبارہ ملانے کی کوشش کی ہے اور فوق صاحب اس مخلوط تہذیب کو نظر انداز کر گئے ہیں جو ان دو تہذیبوں سے مل کر ایک نئے وجود میں ظاہر ہوئی ہے عالی کے دوہے اسی مخلوط ہندی تہذیب کے خدوخال سے اپنا چہرہ بناتے ہیں جس نے وسط ایشیائی مسلم تہذیب اور ہند آریائی تہذیب کے طویل ملاپ کے بعد موجودہ عہد میں اپنا اظہار کیا ہے اور اس حوالے سے عالی کے دوہے انسان دوستی کا پرچم لے کر آگے بڑھتے ہیں۔

عالی کا دوسرا شعری مجموعہ "لاحاصل" ہے جو "غزلیں دوہے گیت" کے سولہ سترا برس بعد شائع ہوا ہے "لاحاصل" میں بھی غزلیں دوہے نظمیں اور گیت شامل ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ جب یہ مجموعہ آیا تھا تو ہمارے لکھنے والوں میں اس کے نام کا بڑا مذاق اڑایا گیا تھا اور "لاحاصل" کو حقیقت میں لاحاصل ہی سمجھا تھا لیکن بعد میں اس مجموعے پر تبصرے اور مضامین لکھے گئے اور اختلاف و اتفاق کے ساتھ "لاحاصل" کو عالی کا ایک اہم شعری مجموعہ مان لیا گیا یہ ذہنیت اور رویہ بھی خطرے کی حد تک حیرت ناک ہے کہ جب کوئی نئی کتاب آتی ہے تو لوگ بغیر پڑھے ہوئے زبانی طور پر کتاب کو رد کرتے رہتے ہیں لیکن جب کوئی اہم شخصیت اس کتاب کے بارے میں لکھ دیتی ہے تو وہ رد کی ہوئی کتاب ہمارے درمیان ممتاز و مقبول ہو جاتی ہے۔ عالی اپنی شاعری

پر لکھے ہوئے مضامین سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں کہ وہ اپنے سننے والوں پر اور اپنے پڑھنے والوں پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں اور ان کی پسند و ناپسند سے متاثر بھی ہوتے ہیں شاید شاعروں کی مقبولیت اور اخبار کے لاکھوں قارئین کی بنا پر وہ ایسا سمجھتے ہیں۔

شعری مجموعہ "لاحاصل" اور اس کا نام عالی کی موجودہ نفسیاتی اور ذہنی حالتوں کا آئینہ دار ہے عالی نے "لاحاصل" کو زندگی کے گہرے تجربے کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے اس حوالے سے آگے چل کر گفتگو ہوگی پہلے ہمیں اس مجموعے کی شاعری پر ایک نظر کرنی چاہیئے۔ محمد علی صدیقی نے "لاحاصل" کی بیشتر نظموں کو پروزیک سمجھا ہے اور اس کتاب کو نقش ثانی کہتے ہوئے اس کے دائرے کو چھوٹا بتایا ہے ڈاکٹر وحید قریشی نے "غزلیں دوہے گیت" اور "لاحاصل" کے درمیان سفر کو سست رو کہا ہے اور ان کے شعری سرمائے کو قلیل اور اس کے دائرہ اثر کو محدود بتایا ہے۔ "لاحاصل" کی شاعری "غزلیں دوہے گیت" سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے لیکن اپنے داخلی وجود میں اور اپنے تجربوں کے اظہار میں پہلے سے زیادہ پراعتماد اور بااثر ضرور ہے عشق ایک دہکتا ہوا سورج بن گیا ہے اور کسی زیبائی کے چاند کی طلب نے اسے زنجیر نہیں کر رکھا ہے عالی نے اس کتاب میں کسی نئے تجربے کو نہیں لکھا ہے اس لئے پہلے کچھ ایسے عشقیہ شعروں کی نوعیت دیکھتے ہیں جس میں عالی کا اعتماد گہرا ہوگیا ہے۔ محبتوں کی تاریخ کو بچے بھی پڑھنے لگے ہیں کہ اس گلی سے گزرنے والا ہر عمر کا شخص ٹھوکر کھا سکتا ہے اور اس بگاڑ میں کئی بناؤ حاصل ہوتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

ہاں بھلا تیرے خدوخال کو ہم کیا سمجھیں
دل میں یونہی تری تصویر اُتر آتی ہے

ایک ہنگامہ ہے لندن مگر اس میں بھی ہمیں
تیرے ہی دل کے دھڑکنے کی صدا یاد آئی

درِ رقیب سے اک موجۂ ہوا آیا
اور اس میں خاص ترے جسم کا مزا آیا

اگلی ہی گلی میں رہتا ہے اور ملنے بھی نہیں آتا ہے
کہتا ہے تکلف کیا کرنا ہم تم میں تو پیار کا ناتا ہے

میں اک چراغ جلا دوں کسی صداقت کا
زمانہ آپ ہی صدیوں تلک ہوا دے گا
یہ احتیاط یہ ڈر یہ انا کے سو پیچاک
اگر ہے عشق تو یہ عشق سب مٹا دے گا
ہم ایک ہیں متوازی خطوط ہو کر بھی
جدا کیا ہے ازل نے ابد ملا دے گا
ماضی و حال جدا بھی نہیں تھے مستقبل کوئی چیز نہ تھا
تیرے وصال و فراق سے پہلے وقت کی گردش تھی ہی نہیں
ہم نہ ملے اور جب بھی ملے تو دونوں نے اقرار کیا
ہائے وہ وعدہ ایسا تھا جو پورا ہونے والا تھا

"لاحاصل" میں عالی کی غزل نے عشق کو زندگی کی بنیادی قدر سمجھ کر قبول کر لیا ہے اور سچائی کا چراغ جلا کے عالی کو یہ یقین ہے کہ زندگی کے سارے خوف مٹ جاتے ہیں ابتدا میں بچھڑ جانے والوں کو انتہا پر ملنا ہے عالی کے یہاں تجربوں کا ایسا یقین ان کی پہلی غزلوں میں نہیں ہے۔ اسی حوالے سے ایک ایسا عکس بھی اس غزل میں روشن ہوا ہے جس میں عشق کی سچائی نے خود اپنے وجود میں حسن کو پا لیا ہے اور حسن کی روح بھی عشق کی روح کی طرح جل اٹھی ہے

جدا ہوئے بھی تو دونوں کی راکھ چمکے گی
سلگ چکی ہے تری روح میری جاں کی طرح
مسکرانے لگی وہی تصویر = جس سے اک عمر خوف سا آیا
ہاں تو پھر اس کے بعد کیا گزری
جس کے بعد اک نیا خلا آیا

یہ زمیں یوں بھی آگ تھی عالی
اور میں چل کر برہنہ پا آیا
اس بار جو آیا ہوں تو لے کوچۂ جاناں
تیرے در و دیوار صدا کیوں نہیں دیتے
کھلتی کلیوں کی ہے صدا جیسے
جو نہ آیا تھا آ گیا جیسے
نہ رہی انتظار کی بھی تھکن
چھوڑ کر ہی گیا نہ تھا جیسے
اک برس کا شدید زخمِ فراق
ایک لمحے میں بھر گیا جیسے

دُنیا کو جاننے کے لئے آدمی اپنی عمر کو جلاتا رہتا ہے اور پھر خود خاکستر شرر انگیز میں تبدیل ہو جاتا ہے خارجی صداقتوں کا تغیر اور اُن کی اضافی صورتیں ہمیں کسی اٹل فیصلے تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ زندگی کے سارے تجربے اور باہر سے ملی ہوئی متواتر اور مسلسل اذیت بیٹھ کر بھی خواہشوں کو ناآسودہ ہی دیکھنا پڑتا ہے اسی سفر میں خوش گمانیوں کے راستے ختم ہو جاتے ہیں اور ایک ایسا لمحہ آجاتا ہے جب آدمی اپنے اندر ایک روشنی دیکھنے لگتا ہے اور اس روشنی میں دھوئے چہروں اور شکستہ خواہشوں کے آئینے چمکنے لگتے ہیں یہ لمحہ اپنی ذات کی شناخت اور اپنے وجود کی اُس پہچان کا لمحہ ہوتا ہے جس میں آدمی اپنے اندر اور اپنے باہر جو کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے جو کچھ سوچ رہا ہوتا ہے اور جو کچھ محسوس کر رہا ہوتا ہے وہ سچ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اپنی ذات کی آگہی آدمی پر اُن بند دروازوں کو کھول دیتی ہے جن سے وہ عمر بھر ٹکراتا رہا ہے اور ایسی صورت میں بولنے والا سوچنے والا یا لکھنے والا لاحاصلی کو بھی حاصل بنا لیتا ہے اور سائیگاں ہو کر بھی ایک اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

آج بھی میرے خیال بے حصول و بے مآل
آج بھی میرے سوال نا قبول و بے جواب

ہر صدی کے موڑ سے راستے وہی کھُلے
لوگ دیکھتے رہے چھُپی حقیقتوں کے خواب
کب سے ہم انصاف کے پیاسے جلتے ہیں اور کہتے ہیں
کوئی نہ کوئی صدی آئے گی اپنی آگ بجھانے بھی
کب تم بھٹکے کیوں تم بھٹکے کس کس کو سمجھاؤ گے
اتنی دُور تو آ پہنچے ہو اور کہاں تک جاؤ گے
جو بھی تم نے شہرت پائی جو بھی تم بدنام ہوئے
کیا یہی ورثہ اپنے پیارے بچّوں کو دے جاؤ گے

اپنی ذات کے حوالے سے باہر کے لوگوں کی حقیقت یوں بھی نظر آنے لگتی ہے کہ

یہ جو میرے لَے ہے اور لفظوں کے تانے بانے ہیں
سننے والو غور نہ کرنا یہ سب راگ پرانے ہیں
سُننے والو غور نہ کرنا ورنہ ہمیں ٹھکرا دو گے
ہم اندر سے سخت کمینے باہر سے دیوانے ہیں

زندگی کی عمومی منافقت اور جھوٹ کو عالی نے اکثر اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے اس کے اظہار میں وہ کبھی دوسرے لوگوں کو اور کبھی خود کو ذریعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح انھوں نے اچھّے بُرے مختلف لوگوں کی تصویریں پیش کر کے منفی اور سائبانی کالی اور اُجلی شکلوں کو تجسیم کرنا چاہا ہے عالی نے اپنے فن اور اپنی شخصیّت کے بارے میں بہت سی باتیں کی ہیں کچھ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ چند شعر یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں

عالی جی کا فنِ سخن میں اک انداز نرالا تھا
نقدِ سخن میں ذکر یہ آیا دو ہے پڑھنے والا تھا
چند نئے شعروں کے شعلے کیسی لے میں بھڑکتے تھے
تم آ کر سنتے تو سہی کل ساری رات اُجالا تھا

اِک تختِ روان شعر آیا کچھ شاہِ سخن نے فرمایا
پھر تاجِ ترنم پہنایا اور غزلوں میں تلوائے گئے

عالی کا یہ ترنم اور اُن کی یہ غزل اور ان دونوں کی ہم آہنگی وہی دلچسپ ہم آہنگی ہے جس کی طرف عسکری صاحب اشارہ کر چکے ہیں۔

"لاحاصل" کی غزلوں کے بعد ہم اس مجموعے کے دوہوں کو دیکھیں تو موسوعات کے اعتبار سے وہی شہروں شہروں کی سیاحی وہی طبقاتی کشمکش اور وہی ذات کے حوالے سے لکھے گئے کچھ دوہے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان دوہوں میں ایک اہم بات تو یہ نظر آتی ہے کہ معاشرے پر طنز اور تنقید کا لہجہ گہرا اور شدید ہو گیا ہے اور دوسری خصوصی بات یہ ہے کہ ان دوہوں میں جمالیاتی دوہوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ عالی نے جنگلہ۔۔ نار کی آنکھوں کے کٹورے اور ان کٹوروں میں دکھوں کے ڈوبے ضرور دیکھے ہیں۔ پنڈی دیس میں کویتا پڑھنے گئے ہیں تو اُن کے دوہوں کو خوشبوؤں سے لپٹے ہوئے آنچلوں پر خواتین نے کاڑھا ہے اور کہیں انھیں ایک ایسی چھتیسی عورت سے واسطہ بھی پڑا ہے جس نے سرِ انجمن اُن پر محبت کا واریوں کیا ہے جیسے طوفان چاروں طرف سے اٹھیں اور مِل کر پھٹ جائیں پھر علم و فن کی ناقدریاں افسر اور ماتحت کے درمیان اونچ نیچ کی دیواریں ہنرمندوں اور بے ہنروں میں کشمکش کی صورتیں ہماری سماجی زندگی کے وہ گہرے زخم ہیں جس کی سمت عالی اپنے پڑھنے والوں کی توجہ چاہتے ہیں ایسی ایک مثال اور دیکھتے چلیے۔

اس کلجگ نے دل والوں سے جو جو بوجھ اُٹھوائے
ایک بھی جس پرت پر رکھ دیں وہ پرتیت پھٹ جائے
اونچے اونچے جن کے سنگھاسن بڑے بڑے کوڈام
اپنی دکھی کلانگری میں ان کا تھا کیا کام

نایہ جیون بھید کے روگی نا انھیں ہردم سوچ
نایہ دل کی سختی جانیں نایہ رات کا لوچ
آج بھی کتنی کومل کلیاں کانٹوں کی خوراک
آج بھی کوئی نہیں پہچانے کیا کندن کیا خاک
آج بھی روئے کوئل بانی کوّے ماریں تان
آج بھی دیر کھلے سینے اور بھانڈ چلائیں بان
عالی تو جو چلے کہے ظاہر ہے ترا انجام
سو راون ترے بیری اور تو نا لچھمن نا رام

عالی کے ان نظمیہ دوہوں میں بیشتر لفظیات تلمیحاتی اور استعاراتی ہیں انھوں نے بعض دیومالائی کرداروں کے پس منظر میں اپنے عہد کو اور اپنے عہد کی منفی و اثباتی قوتوں کو لکھا ہے۔ عالی کی شاعری میں ایک ایسا باغی عکس ہے جو یہ جانتا ہے کہ زندگی کو تجارتی مال بنا کر خرید لینے کی منفی اور جبری طاقتوں کے دوران اُسے گھیر رکھا ہے اور وہ باغی عکس یہ بھی جانتا ہے کہ اُس کے پاس رام اور لچھمن کی اثباتی اور روشن قوتیں بھی نہیں ہیں پھر بھی وہ اپنے گرد و پیش کی ہلاکتوں کا رزمیہ قبول کیے ہوئے ہے۔ ہم عالی کے اُس باغی عکس کو اُن کے دوہوں کی ایک بنیادی پہچان سمجھتے ہیں عالی کی رزم گاہ صرف باہر کی دُنیا ہی نہیں ہے بلکہ ایک لڑائی تو وہ خود اپنی ذات کی پناہ گاہ میں لڑتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے وجود کو پتھر کی آنکھ سے دیکھا ہے جہاں وہ اپنی خوبصورتیوں اور اپنی اہمیتوں کو اظہار میں لاتے ہیں وہیں وہ اپنی مجبوریوں اور اپنی کمزوریوں کو بھی ظاہر کرتے ہیں اس حوالے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ روشنیوں اور پرچھائیوں کے درمیان یوں کہا ہے کہ وہ آدمی کے لئے انصاف اور آسودگی چاہتے ہیں عالی کی خود احتسابی اور اپنی شخصیت اپنی شاعری اور اپنی تحریروں پر سچا تنقیدی اظہار اُن کی اہمیت میں اضافے کا سبب بنا ہے ہم نے اُن کے دوہوں کا ایک بڑا حصہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے لیکن کچھ اور اہم دوہوں کا خصوصی

مطالعہ ابھی باقی ہے عالی لکھتے ہیں کہ

جسے یہ چھو لیں ہے وہ سونا آپ ہیں خالی ہاتھ
عالی جی کا نام پڑا ہے مرزا پارس ناتھ
عالی کا کیا ذکر ہو کوی تو وہ کہلائے
جو ناخن سے پربت کاٹے اور پربت کٹ جائے
عالی تو نے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی
یہ تو بتا تری کویتا رانی دیس کے کس کام آئی
کس کس گھر کی نیو رکھو اور کیا کیا کنج بناؤ
عالی جی تم آپ گھروندے خود ہی ٹوٹ نہ جاؤ
تھر تھر کانپے کاغذ اور سیاہی اڑتی جائے
سچ کا بوجھ تمازو جھوٹی کتنی دیر اٹھائے
بھٹک رہا ہوں پر رکھوں گا اسی کا دھیان لگائے
شاید اک دن سچائی خود کھینچ مجھے لے جائے
اچھائی اور سچائی اور سندرتا ہے ایک
جو سچا ہے وہ سندر ہے جو سندر وہ نیک
جب کبھی جلنا ایسے جلنا باقی بچے نہ راکھ
راکھ بچے تو گر جائے گی من اگنی کی ساکھ

کل کا پریت آج شکستہ دیوار بن کر گرنے والا ہے اس کے سبب تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن عالی کی شاعری میں "نار" ہی وہ قوت ہے اور وہ کمزوری ہے جو آسمانوں کے ساتھ بلندیوں اور پستیوں کا شکار کر سکتی ہے عالی کے ان دوہوں تک پہنچتے پہنچتے ہم نے ان کے جمالیاتی تصور کو ان کے عشق کی سچائی کو اور ان کی اپنی سماجی فکری و تجزیاتی اہمیتوں کو اور غیر اہمیتوں کو ان ہی کے اظہار کے حوالے سے دیکھ لیا ہے حسن عشق سچائی اور عدل و انصاف مجرد تصورات ہیں جو کسی مضطرب آواز میں سمٹ کر اور کسی زندہ عمل سے مل کر ہی مثالی بنتے ہیں۔

محبت رکھنے والے گھروں کے سائے میں بھی روشنیاں بجھی ہوئی ہیں شرط یہی ہے کہ ان کی سمت مادّی خواہشوں کی آنکھیں بند کئے ہوئے جانا ہے۔

اپنی مٹّی کے تعلق سے چند بڑی شخصیتوں کا ذکر بھی عالی نے کیا ہے اور اُن سے محبّت کے لفظوں میں باتیں کی ہیں۔ شاہ لطیف بھٹائی اور علامہ اقبال ہماری قومی و ملّی زندگی کے آفتاب و مہتاب ہیں۔ دریائے سندھ کی مٹھاس اور مہران مٹّی کی خوشبو ہماری کا بہاؤ اور اس کی قوّت کی اُڑان ہمارے اجتماعی اور انفرادی شعور کا ورثہ بھی ہے اور ہمارا سرمایہ بھی ہے عالی لکھتے ہیں کہ

شاہ لطیف تمہارے در پر کیا کیا سُر لہرائیں
عالی جیسے من میلے بھی کُندن ہو کر جائیں
شاہ لطیف تمہارے سُر کی دُنیا میں وہ دُھوم
سندھ کی مٹّی جہاں بھی پہنچے لوگ اُسے لیں چُوم
عالی کی باتیں مت سننا گھاتیں اُس کی لاکھ
بات کرے اقبال کی لیکن اپنی بڑھائے ساکھ
جب بھی گیت خوشی کے گائے پیچھے ساتھ ضمیر
اپنے لئے آزادی چاہے سب کے لئے زنجیر

ملکوں ملکوں جھوٹ کے ڈھونگ سجانے والے جب شہرِ اقبال میں اترتے ہیں تو یہاں کی مٹّی اُنھیں جلا دیتی ہے اور سچّے لوگوں سے لپٹ کر خوشبو بن جاتی ہے کہ سچ بولنے کی خواہش سے اور خطاؤں کے اعتراف سے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں قومی تشخص اور قومی کردار کی تشکیلِ نو کا آغاز ہو سکتا ہے اسی سچّائی کے حوالے سے ہم عالی کی نظم اما بعد کو دیکھتے ہیں۔

نرم لمحوں کی رنگینیوں
لذّتوں شدّتوں
کامیابیاں
اب بھی ممکن نہیں
سخت لمحوں کی جاں کاہیوں

دردانگیزیوں، اضطرابوں، عذابوں
کی وہ داستاں
اب بھی ممکن نہیں
اے خدا
تو نے اتنا دیا
اب مجھے تابِ اظہار دے
سچ کا آزار دے

جھوٹ کے آسودہ سماج میں سچ کا آزار مانگنے والے غالبؔ نے اور بھی کئی بے خوف اور بے باک نظمیں لکھی ہیں "خانہ جنگی" "انقلاب آئے گا" اور "بحرانیات" کے سلسلے کی تین نظمیں خصوصیت کے ساتھ بڑی اہم ہیں پہلے دو نظموں کے مختصر اقتباسات دیکھئے۔

اگر یہاں خانہ جنگی آئی تو کیا کرو گے
یہی کہ دو چار ہم خیالوں کے ساتھ وہسکی پیا کرو گے
کلامِ اقبال نثرِ لینن بیانِ غالب پڑھا کرو گے
یہی جو کوئی تمھیں پکارے تو معذرت کر لیا کرو گے
نہیں تو پھر اور کیا کرو گے (خانہ جنگی)

انقلاب آئے گا
زنگ خوردہ اک کردار
انتشار کی دیوار
آخری رکاوٹ ہے
یہ بھی ٹوٹ جائے گی
انقلاب آئے گا
انقلاب آئے گا (انقلاب آئے گا)

اس کے ساتھ ایک خوبصورت گیت کا ایک استیزا بھی دیکھتے چلیے۔

اب رات وہ گیت نہیں گاتی
وہ جن سے خوشبو آتی تھی
اور رنگوں میں گھُل جاتی تھی
پھر رنگ بدن بن جاتے تھے
اور ایسی آگ لگاتے تھے
جس آگ کی پیاس نہیں جاتی
اب رات وہ گیت نہیں گاتی

اقتباسات کو مختصر اس لئے کیا جا رہا ہے کہ طویل حوالے پیش کئے جا چکے ہیں جہاں تک بحرانیات کے سلسلے کی تین نظموں کا تعلق ہے تو ان کے بارے کچھ باتیں بہت ضروری ہیں پہلی نظم میں خدائے قدوس سے کلام کرتے ہوئے اپنے وطن کو ایک عظیم امانت کہا گیا ہے جو گناہگاروں کے لئے ایک آزمائش بھی ہے اس زمین پر آباد لوگوں کے دلوں سے نفرتوں کا غبار دور کرنے کی دُعا عالی نے اپنے ہاتھوں پر لکھی ہے اور کدورتوں کو محبت میں اور عداوتوں کو ہمدردیوں میں تبدیل کرنے کی خواہش کی ہے دوسری نظم میں عالی نے پوری قوم کے اضطراب کو بیان کرتے ہوئے خود کو مجبوریوں کے زنداں میں قید پایا ہے۔ چلنے والے گرتے بھی ہیں اور چالوں کی تسخیر بھی کر لیتے ہیں۔ عالی کہتے ہیں کہ میں چل کر ٹھہر گیا ہوں مگر سچائیوں کی سمت جانا ضرور چاہتا ہوں آگ میں ہاتھ ڈالنے والے بقراط اور سرد کمروں میں دودھ اور شہد پینے والے سقراط محفلوں میں بیٹھ کر تبصروں کا زہر اگلتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے لہو کی ایک بوند بھی خدائے قدوس اور اس کی مخلوق کے کسی کام نہیں آئی ایسے بے عمل کسی پر تنقید کیا کریں گے وہ سچائی کی تائید نہیں کر سکتے جو اپنی پناہ گاہوں میں حق کا انصاف کرنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ عالی کہتے ہیں کہ "میں ایسے شب و روز میں میں جل رہا ہوں پگھل رہا ہوں"۔ بحرانیات کی تیسری اور آخری نظم وہ ہے جس میں اپنی زمین کو ماں کا استعارہ بنایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اپنی ماں کے پاؤں کو چھونا اور اس کی اطاعت میں ہر جبر سے ٹکرا جانا ضروری ہوا کرتا ہے ماں کا وہ احترام جھوٹا ہے جو خود ماں کے

پاؤں کو زخمی کر ڈالے ماں کے پاؤں کو روندا نہیں جاتا اُسے چوما جاتا ہے کہ ماں کوئی ایسی عورت نہیں ہے جس کے لئے رقابتوں کی جنگ لڑی جائے اور نفرت و عداوت کے اور انا کے بدرنگ پرچم اڑائے جائیں۔ انسانیت کے راستوں کا ہر لمحہ ماں کی محبت کی امانت ہے ہمیں اپنی مٹی اپنی زمین اپنی ماں کی طرف دیکھنا ہے اور اس سے محبت کرتے رہنا ہے۔

"بحرانیات" کی ان تینوں نظموں کی بنیادی اساس ملّی و قومی یکجہتیوں پر ہے ہم نے عالی کے بہت سے دوہوں میں سماجی اور سیاسی زندگی پر ناہمواریوں کے تیز نشتر دیکھے ہیں یہ تینوں نظمیں عالی کے اُس داخلی دُکھ کو اپنے اظہار میں لاتی ہیں جو ہر سچّے پاکستانی کا دکھ ہے اپنے خدا اپنی قوم اور اپنی زمین کے درمیان یہ نظمیں محبت کا ایک ایسا رشتہ پیدا کرتی ہیں جس کو زندہ اور سچے لوگوں کی پہچان کہا جاسکتا ہے۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے ہمیں عالی کا منظوم ڈراما "انسان" یاد آرہا ہے جو خدا کے انسان کی طرح ابھی تک عدم تشکیل میں ہے اور جس کے چند حصّے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں یہ نظمیں مجھے اسی ڈرامے کا حصّہ معلوم ہوتی ہیں "انسان" کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عالی کی تخلیقی توانائی دوہوں کے بعد نظم میں اپنا بہترین اظہار کر سکی تھی لیکن انھوں نے نظم پر توجہ نہیں کی ہے "انسان" کے مطبوعہ حصّوں کو دیکھ کر اس کے موضوع کے بارے میں ایک مکمل و نامکمل اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عالی کا یہ طویل مکالمہ آفاقی اور کائناتی انسان ـــــ کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے جہاں خیر و شر کی ابدی و ازلی رزم گاہیں کھلی ہوئی ہیں جہاں سچ جھوٹ سے صبر جبر سے رحم قہر سے دہریت بندگی سے جدل صلح سے روشنی اندھیرے سے محبت نفرت سے علم جہالت سے حُسن بدصورتی سے اور انسان اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان جنگ کرتے ہوئے لہولہان ہے عالی لکھتے ہیں کہ

صدق ۔ ناواقفی فطرتِ عالم کی دلیل
کِذب ۔ ہر باب تمنا کی کلیدِ زرّیں
جبر ۔ تسخیرِ مطالب کا پرانا ہتھیار
صبر ۔ کم ہمتیٔ شوق کا رفقائے حسیں
رحم ۔ خود اپنے ہی آلام کی دریوزہ گری

قہر ۔ مجبور شکاروں کے لئے دام دکھیں
دہریّہ ۔ تند دماغی کے لئے بادۂ تیز
بندگی ۔ تشنگیٔ قلب کو آبِ شیریں
جدل ۔ اک کاوشِ بیدار بہ تحریکِ بقا
صلح ۔ اک وقفۂ دو لمحہ برائے تسکیں
شکوہ ۔ اک دعویٔ بے زور کہ ہو لاحاصل
فیصلہ ۔ مظہرِ قوّت ہے وہ ہاں ہو کہ نہیں
زندگی ۔ چند بہت سادہ حقائق کا شعور
زندگی ۔ چند فریبوں کے سوا کچھ بھی نہیں

عالی کے اس منظوم ڈرامے میں انسان کی ناآسودگیوں اور اس پر ہونیوالی ناانصافیوں کو ایک ایسے اضطراب ایک ایسے کرب اور ایک ایسی قوت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اگر یہ ڈراما تکمیل پا جائے تو گزشتہ پچاس برسوں میں تحریر کردہ طویل نظموں میں بڑی اہمیّت کا حامل ہوگا اگرچہ اس کا اسلوب زیادہ تر فارسی زدہ ہے اور جوش اور سردار جعفری کے اثرات سمیٹے ہوئے ہے لیکن اس کا فکری و تجرباتی شعور اور تخلیقی احساس اتنا سچّا اور گہرا ہے کہ ہر طرح کی گراں باری بے جھجک کر سبک اور مؤثر بن گئی ہے۔ "انسان" کی اساس ایک ایسے فلسفیانہ طرزِ احساس پر رکھی گئی ہے جو اعلیٰ اقدار کے مسخ ہونے کا المیہ ہے عالی سچائیوں کی تلاش میں بند کمروں میں بیٹھ کر آنکھوں کو پڑھنے سے زیادہ عملی تجربوں کو اہمیّت دیتے ہیں کہ اپنا حق مانگنے والوں کے لئے تاریخ بدل دی جاتی ہے اور بار بار کمزوروں پر فلسفے کے کتّے چھوڑے جاتے ہیں۔ عالی کے اس ڈرامے کے حوالے سے ان کے دو دوست اختر الایمان اور سلیم احمد بھی یاد آتے ہیں۔ اختر الایمان کا "تاریک سیارہ" وہ نظم ہے جس نے زمین پر انسانی وحدت کے درمیان ایک ایسی حد قائم کی ہے جس نے ظالم اور مظلوم کو سرمایہ دار اور مزدور کو انصاف اور ناانصافیوں کو الگ الگ کر دکھایا ہے اس حوالے سے اس بات کا امکان موجود ہے کہ "تاریک سیّارہ" سے عالی متاثر بھی ہوئے ہوں اور "تاریک سیارہ" نے عالی میں ایک اور نظم کی تحریک پیدا کی ہو اس طرح سلیم احمد کی طویل نظم "مشرق"

کو دیکھا جائے تو "مشرق" کا بنیادی کردار اپنی تہذیب کی صداقت اور اسلامی اقدار کی علامت ہے اور یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ سلیم احمد نے "مشرق" کے لئے عالی کے "انسان" کا اثر قبول کیا ہو۔ "تاریک سیارہ" شائع ہو چکی ہے اور "مشرق" اشاعت کے آخری مرحلے میں ہے اب عالی کو چاہیئے کہ وہ اپنی تخلیقی قوت کی نظمیہ جہت کو آگے بڑھائیں اور "انسان" کو تکمیل وجود تک پہنچا دیں جو ہر اعتبار سے اُن کی شاعرانہ اہمیتوں میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس ڈرامے کے عقب میں جوش کی طویل نظم "حرفِ آخر" بھی اپنی جھلک دکھاتی ہے جس میں آدم کی آفرینش سے موجودہ عہد کے آدمی تک کی کہانی پیش کی گئی ہے اور خدا و شیطان کا مکالمہ لکھا گیا ہے اس کی تکنیک بھی ڈرامائی ہے اور آدمی کے حوالے سے خدا کی شکست اور شیطان کی فتح کو اپنے اظہار میں لاتی ہے جوش کی یہ نظم کوئی پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے لیکن عالی کا ڈراما "انسان" اپنی ایک انفرادیت اور اپنا ایک الگ تاثر رکھتا ہے جسے مکمل ہونا چاہیئے۔

"جیوے جیوے پاکستان" عالی کے قومی و ملّی نغموں کا مجموعہ ہے جس کی مقبولیت سے ہم سب آگاہ ہیں ریڈیو ٹیلی ویژن اخبارات اور مشاعرے وہ ذریعے ہیں جہاں سے عالی کے نغموں کو عالمی شہرت ملی ہے۔ کسی بھی تخلیقی اظہار کے لئے لکھنے والے کی سچائی کو بنیادی مرکز سمجھا جاتا ہے ہم نے عالی کی وطن پرستی برادران کے قومی تشخص پر بہت سی باتیں کر لی ہیں اور ہم نے ان کی نثری و شعری تحریروں میں انہیں اپنی زمین سے اپنی تہذیب سے اور اپنی انسانی اقدار سے محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے یہی محبت عالی کے ان مشہور و مقبول نغموں کی اساس بھی ہے۔ عالی کے نغموں میں جذبے کی صداقت ایسی ہے کہ ہمارے یہاں ہر طبقے کے ہر سطح کے لوگوں نے انہیں پسند کیا ہے عالی کی نثری و شعری تحریریں اور اُن کی شخصیت کے مختلف عکس اور اُن کی خواہشوں کی کئی جہتیں دیکھی گئی ہیں ہم نے ابتدا میں غالب اور درد سے عالی کے خاندانی تعلق کا تذکرہ کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ہم عالی کی تخلیقات میں درد اور غالب کے ورثے کو اور ان کے اثرات کو دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ عالی کے اس سفر کو سمیٹنے سے پہلے بہتر ہے کہ بعض تنقید نگاروں کی بنیادی باتوں کو اور دیکھ لیا جائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ

> "عالی جو حسین و جمیل ہے دوسروں کو لبھانے اور چاہے جانے کی شدید خواہش رکھتا ہے اپنے آپ کو مرزا پارس ناتھ خیال کرتا ہے اور اُس کا ایک ملس انسانوں کو سونا۔

بنا دینے کے لئے کافی ہے وہ سمجھتا ہے دنیا میں سب سے حسین چیز اُس کی اپنی ذات ہے جیسے یہ گمان ہے کہ ساری دنیا کے پری رو اُس پر مرتے ہیں جمیل الدین نوابزادہ ہے اُسے جہان بھر کی آسائشیں میسر ہیں غالب کی عیش پسندی اُس کا آئیڈیل ہے۔ عالی عاشق مزاج ہے جس پر مرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ عالی کی ذات کا خارجی روپ اُس نوابزادے کا روپ ہے جو اپنے درباریوں میں گھرا ہوا ہے جو کانوں کا کچا ہے جس کی انا اُسے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی جسے ہر رات نئے چہرے سے واسطہ ہے جو اپنے شبستان کو سجانے کے لئے نئے نئے شکار کرتا ہے جس کے دن سیاسی جوڑ توڑ اور محفل آرائی کے لاکھ جتنوں پر مشتمل ہیں کسی پر بھروسہ نہ کرنے اور فریبی دوستوں کی خاطر توڑ پھوڑ میں مصروف رہنے کی بے تابانہ لگن اُسے شاعری پر توجہ کرنے سے روکتی ہے۔"

محمد علی صدیقی لکھتے ہیں کہ

"عالی کی شاعری پڑھتے وقت یوں لگتا ہے کہ ہم کسی دل برداشتہ شاعر کا کلام پڑھ رہے ہیں ایک ایسا شاعر جس کے خواب ادھورے ہیں ادھورے خواب شکستہ خواب اور ڈراونے خواب یہی عالی کا مآل ہیں۔"

سلیم اختر کا خیال ہے کہ

"عالی کی تخلیقی شخصیت اپنے لئے وہ مضبوط زمین تلاش نہیں کر سکی جس کے نتیجے میں شاعر کے پاؤں دو ستونوں میں تبدیل ہو کر اُسے وہ استحکام دیتے ہیں کہ پانی کے پودے کی مانند اس کی شاخیں لہر لہر کے ساتھ لہرا نہیں جاتیں۔"

سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ

"وہ ایک ایسی تتلی ہے جو ہر پھول پر بیٹھنا چاہتی ہے مگر پھول کی پتی سے ہونٹ لگا کر اڑ جاتی ہے اُس کی پیاس ہے جو بجھتی ہی نہیں۔"

عالی پر لکھی ہوئی بیشتر تنقیدوں کا مرکز یہی ہے کہ اُن کے یہاں ارتکاز نہیں ہے عالی کے یہاں ارتکاز کے نہ ہونے والی بات تو سب سے پہلے عسکری صاحب نے ہی لکھی ہے اگر ارتکاز کے معنی یک کمی یا کوئی خصوصی فکر یا غزل کے کسی منفرد اسلوب کے ہیں تو عالی کے یہاں واقعی ایسا کوئی ارتکاز نہیں ہے اور اگر

ارتکاز کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی پوری زندگی کے عمل میں اور اپنی پوری فکر کے اظہار میں ایک نامیاتی تسلسل اور ایک جدلیاتی شعور کا حرکی اظہار کرتا ہے اور زندگی کے تضادات سے گزر کر بنیادی اور اساسی صداقتوں کے قریب پہنچنے کا امکان پیدا کرے تو یہ ارتکاز عالی کے یہاں موجود ہے۔ عالی اپنے ابتدائی اظہار میں غالب کی عیش پسندی کو اپنی خوبصورتی اور خواتین میں اپنے چاہے جانے کو اہمیت دیتے رہے کہ وہ اپنے عہدِ شباب میں خوابوں کے گہرے رنگوں والے گنبد میں بند تھے پھر وہ سیاح بن کر کھلی ہوئی لق و دق اور اُفق تا اُفق دنیا میں اُتر گئے۔ جو اُن کے سفر کی دوسری جہت ہے جہاں اُن میں انسانی تاریخ نے بولنا شروع کیا اور اُن خارجی آوازوں میں انھیں اپنی مٹی اور اپنے قومی تشخص کا شدید احساس ہونے لگا پھر جب وہ اپنی سمت لوٹے ہیں تو یہ اُن کے سفر کی تیسری جہت بنی ہے جہاں جسم کے تمام تجربے آنکھوں کے تمام خواب اور فکر و وجدان کی تمام خواہشیں ان کے اندر سمٹ گئی ہیں کہ سب کچھ "لاحاصل" ہے بے ثبات ہے اور احساسِ مرگ خود اُن کی تلاش میں ہے اس طرح ایک خوبصورت شہزادہ، غالب کے جسمانی ناآسودہ سفر سے آگے بڑھ کر درد کی داخلی سچائیوں کے آس پاس پہنچ رہا ہے۔

ہم نے عالی کو ان کی تخلیقات کے ذریعے پہچانا ہے کہ ان کا اضطراب اور اُن کا جذباتی کرب اپنے اثباتی وحدت کے امکان تک آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دوہوں کے حوالے سے بیسویں صدی میں عالی کو جو مقبولیت اور جو انفرادیت ملی ہے وہ سب سے بڑی نمائندہ مثال ہے۔ عالی اپنی دوسری تحریروں میں بین الاقوامیت کو وطنیت میں بدلنے کی خواہش رکھتے ہیں اور غزل کے حوالے سے ان کے یہاں عشق کا تصور ذاتی بھی ہے اور اجتماعی بھی ہے کہ جس عشق نے اپنی اہمیتوں کے احساس سے اور خوبصورت چہروں کی پسند سے سفر کا آغاز کیا تھا وہ اپنے مرکزی وجود تک آ پہنچا ہے جو لاحاصل زندگی کا سب سے بڑا حاصل ہے۔

جَل گئیں انگلیاں میری

بنگال میں گزشتہ نصف صدی سے جن لوگوں نے اُردو میں اچھا خاصا لکھا ہے اُن میں افسر ماہ پوری کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کی شخصیت اور اُن کی تحریریں ہمارے تمدّن و تہذیب کی عکاس ہیں اُن کی خوش گوئی اور نرم کلامی نے اور اُن کے لہجے کے دھیمے پن نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ افسر ماہ پوری کی زندگی کو اور اُن کے فن کو جس حد تک میں جان سکا ہوں اُس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے سامنے ایک پورے انسان کی طرح موجود ہیں انھیں پورا انسان اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ انسانی رموز اور اسرار کے کوئی بہت جاننے والے ہیں یا کائناتی علوم و فنون کے بڑے ماہر ہیں بلکہ وہ اس لیے پورے انسان ہیں کہ ان کے عمل میں اُن کی فکر میں اور اُن کے اظہار میں کوئی تضاد کوئی دو رنگی یا کوئی یک رُخا پن نہیں ہے۔ وہ انسانوں کی شناخت بھی رکھتے ہیں اور انھیں سیاسی و سماجی موسموں کی پہچان بھی رہی ہے۔ میں افسر ماہ پوری کو اُن اہم لوگوں میں شمار کرتا ہوں جنھوں نے پوری عمر محنتوں، سچائیوں اور محبتوں میں بسر کی ہے۔

افسر ماہ پوری نے ۱۹۳۶ء سے رومانی افسانے لکھنے کی ابتدا کی ہے پھر بچّوں کی ایک نظم لکھ کر باقاعدہ نظمیں لکھنے کا آغاز کیا اور ۱۹۴۸ء میں یومِ اقبال کے موقع پر

پہلی غزل لکھی انھیں شعر و ادب کے بدلتے ہوئے اسالیب کا بھی علم رہا ہے اور انھوں نے ہمیشہ نئے اور پرانے رجحانات سے بھی آگاہی رکھی ہے۔ افسر صاحب نے شعر و ادب کی کئی سمتوں میں اپنا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ رومانی افسانے لکھے۔ اردو، انگریزی میں تنقیدی مضامین تحریر کیے۔ نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بنگلا زبان کے شہ پاروں کے بہت سے ترجمے بھی کیے اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں سے باخبر رہے ہیں ڈاکٹر حنیف فوق نے لکھا ہے کہ۔

"افسر ماہ پوری سابق مشرقی پاکستان میں اہم ادبی مقام رکھتے تھے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہاں کی ادبی فضا کی تعمیر میں اُن کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں اُردو کے اُن باشعور ادیبوں میں سے تھے جو ادب کو پیغامِ محبت سمجھتے تھے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ بنگلا ادب سے واقفیت اور دونوں زبانوں کی آگہی نے انھیں خیر سگالی کا جوہر شناس اور خوش مشربی کا جواہر تراش بنا دیا تھا۔ افسر ماہ پوری نے نذرالاسلام کی مسلم تہذیب سے مناسبت رکھنے والی نظموں کا منظوم ترجمہ "جام کوثر" کے نام سے کیا تھا جو بنگالی اکیڈمی کی جانب سے شایع ہوا۔ اس کے علاوہ اُن کے متعدد بنگالی نظموں اور بنگالی افسانے کے تراجم اُردو کے موقر رسائل میں شائع ہوئے۔ اپنی ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے افسر صاحب کو مشرقی پاکستانی کی ادبی فضا میں فعال حیثیت حاصل تھی اور ان کی اپنی وسعتِ نظر کے سبب وہ اُردو بنگالی دونوں ادبی حلقوں میں مقبول و معروف رہے ہیں۔ افسر ماہ پوری کی ادبی صلاحیتوں نے مشرقی پاکستان میں مقامِ اعتبار حاصل کیا اور وہاں اُن کو اُردو ادب کی باکمال شخصیتوں سے صحبت کا شرف حاصل رہا اُن میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، وحشت کلکتوی اور تمنا عمادی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔"

اِس اقتباس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ افسر ماہ پوری نے جو کام کیا ہے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن افسر ماہ پوری کو وہ شہرت نہیں مل سکی جو بہت سے کمتر لوگوں کو مل گئی ہے کہ افسر ماہ پوری کی درویشی نے اُنھیں نام و نمود کی سمت بڑھنے سے روکے رکھا۔ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا بھی تامّل نہیں ہے کہ میں ہمیشہ سے ایک عام آدمی رہا ہوں۔ منصب و زندگی میں بھی اور ادب و شاعری میں بھی شاید اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں اگر کوئی شخص زندگی میں اہم نہیں ہے تو وہ کسی اور شعبۂ حیات میں بھی اہمیت نہیں رکھ سکتا۔"

اسی حوالے سے انجم اعظمی لکھتے ہیں کہ

"ہمارے دور میں اقدار کی نفی بڑے پیمانے پر ہوئی ہے جس کا اثر شعر و ادب پر بھی پڑا ہے۔ اچھے لکھنے والوں میں کئی ایسے ہیں جو گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں یا دوسروں سے بہت کم مشہور ہیں اور کیریئر بنانے والوں کا ایک بڑا گروہ شعر و ادب کی دُنیا پر قابض ہو گیا ہے بے ہنروں کی کوشش ہے کہ اہلِ ہنر کو اس میدان سے نکال پھینکیں۔ افسر ماہ پوری بھی تقریباً گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اب تک نہ اُن کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے اور نہ انگریزی و اُردو تنقیدی مضامین کا یہ شعری مجموعہ اُن کی پہلی کتاب ہے۔"

افسر ماہ پوری نے انگریزی اور اُردو میں جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں اُن کی تعداد اچھی خاصی ہے جو مضامین اشاعت کے بعد ہماری نظر سے گزر چکے ہیں اُن کے حوالے سے چند بنیادی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ افسر صاحب نے ایک سخت عملی زندگی گزاری ہے جس کے ذریعے اُنھوں نے بہت سی چھوٹی بڑی ایسی صداقتوں کو پہچانا ہے جو صرف کتابوں کے مطالعے سے سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادب کو اور اب کے زندہ اصولوں کو بھی جانا ہے یہ ہی سبب

ہے کہ اُن کے یہاں مذہب اور سیاست کی اہمیت ادب کی اہمیت سے مختلف ہے۔ اُن کے خیال میں ادب کو مذہب اور سیاست میں ملوّث نہیں کرنا چاہیے ویسے ادب ان دونوں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور دونوں پر اپنے اثرات بھی مرتّب کرتا ہے۔ افسر صاحب ادبی فن پاروں کا تجزیہ کرتے وقت فنّی اور جمالیاتی اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ موجودہ تجرباتی نثری و شعری تخلیقات کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ شعر و ادب میں تجربے ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر وہی تجربے کامیاب ہوں گے جو قدرتی حالت و محرکات کے ساتھ سامنے آئیں گے۔ افسر ماہ پوری کا خیال ہے کہ علامتی اور تجریدی ادب خشک، پیچیدہ بلکہ چیستاں کی صورت رکھتا ہے۔ وہ شعر و ادب میں حُسنِ اظہار کے ساتھ ساتھ واضح ابلاغ کو بڑی اہمیّت دیتے ہیں۔ وہ ایسے ادب پارے کو پسندیدہ سمجھتے ہیں جو افادیت و دلکشی بھی رکھتا ہو اور انسان کے جمالیاتی احساس کو آسودگی بھی دے سکے۔ افسر صاحب اپنی تنقید کے حوالے سے افادیت پسند اور صداقت پسند مزاج رکھتے ہیں لیکن وہ کسی نظریے میں خود کو بند نہیں کرتے جو محدود اور یک رُخا ہو اُن کی تنقیدی خواہش یہ ہی ہے کہ ہمارے یہاں۔ جو کچھ لکھا جائے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے میں اور زندگی کی تشکیلِ نو میں ہماری مدد کر سکے۔ افسر صاحب کی پوری تنقید ہمارے سامنے نہیں ہے اس لیے کوئی تفصیلی بات تو نہیں ہو سکتی تاہم اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تنقید کے حوالے سے زندگی اور ادب کی مثبت اقدار کے ماننے والے ہیں اور شعر و ادب کے ذریعے انسانی مسائل کو اور انسانی دُکھوں کو کم کرنے کی گہری خواہش رکھتے ہیں اس نقطۂ نظر سے افسر ماہ پوری کی شعری کتاب کو دیکھتے ہیں۔

"غبارِ ماہ" کی غزل کو پڑھ کر جو بنیادی تاثر سامنے آتا ہے وہ تو یہ ہی ہے کہ افسر ماہ پوری کی غزل کلاسیکی لفظیات کے حوالے سے ہماری تہذیب و ثقافت ہماری شعری اقدار اور اعلیٰ اقدارِ حیات کا اظہار ہے اور غزل کے مزاج میں اور خود اُن کے مزاج میں ایک ایسی ہم آہنگی موجود ہے جسے تہذیبی ہم آہنگی کہا جا سکتا ہے

اُن کے یہاں جمالیات کی نوعیت اور عشق کا تصور بہت حد تک کلاسیکی ہے اور اس طرح غبارِ ماہ کی غزلوں کا ایک بڑا حصّہ اپنی تہذیبی پس منظروں اور پیش منظروں سے پیدا ہے لیکن "غبارِ ماہ" کی غزل صرف بیانیہ نہیں ہے بلکہ افسر ماہ پوری ایک باشعور لکھنے والے کی طرح فنّی و تخلیقی دائرہ حصار کو توڑ کر باہر آگئے ہیں۔ وہ روایت کی گرفت میں مدّتوں چلے ہیں لیکن ایک سچے تخلیق کار ہونے کی بنا پر انھوں نے اپنی انفرادیت کو تلاش بھی کیا ہے۔ وہ روایتی شاعری کے غبار میں گم نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے عصری زندگی کو اپنے عہد کے تازہ محاورے میں لکھنے کی کوشش کی ہے وہ ذاتی تجربوں تک پہنچے ہیں اور انھوں نے اپنے خوابوں کی تخلیق بھی کرنی چاہی ہے۔ افسر صاحب نے لسّانی حوالے سے روایتی لفظوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نئے تاثر اور نئی معنویت میں لکھا ہے۔ پہلے چند شعر دیکھیے۔

دھجیاں اوروں کے دامن کی لیے پھرتے ہیں
اس زمانے کے ہیں عشاق سیانے کتنے

چہرہ چھپایا اُس نے تو پردہ دمک اٹھا
قرآں ہوا جو بند تو تفسیر کھل گئی

خاک پروانہ کو آنچل سے اُڑایا نہ کرو
خاک پروانہ میں ہوتے ہیں شرارے بیٹھے

اُن کی یادوں سے سکوں ملتا ہے دل کو کتنا
پیڑ اوجھل ہے مگر چھاؤں گھنی ہے کتنی

ہوس لپٹی ہوئی ہے آج تک شاخِ محبت سے
جو اِس ناگن کو سر کرلے تو گنجینہ اُسی کا ہے

لوگ خود فیصلہ کردیں کہ سحر ہونے تک
کتنا پروانہ جلا شمع جلی ہے کتنی

کور چشموں کے لیے تو سارے عکس اور سارے آئینے غبار ہی رہتے ہیں لیکن دانش و بینش تو اڑتے ہوئے بگولوں میں بھی روشنیاں دیکھ لیتی ہے۔ افسر صاحب کی

غزل میں ایک روّیہ اور بھی ملتا ہے جو کلاسیکی شعریات کے ساتھ اپنے عہد کے محاورے کو ملانا چاہتا ہے وہ لفظ جو بہت حد تک مٹّی بن چکے ہیں۔ افسر صاحب نے اُن لفظوں کو ذاتی تجربے کی حرارت سے پیوند کر کے بڑی خوبصورت باتیں کی ہیں مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں۔

ہم اپنی زندگی کی داستاں تحریر کرتے ہیں
ہوا سے ریت پر اپنا مکاں تحریر کرتے ہیں
چند لفظوں میں ہماری داستان ہے اس قدر
اُڑ گئی نیلم پری اور شاہزادہ رہ گیا
اُن کے دل میں بھی سما کر کھو نہ جائیں ہم کہیں
ہر مکاں میں آج کل ہوتے ہیں تہہ خانے بہت
تمھارے زخمِ نظر کو سجایا سینے میں
دیا جلا کے اندھیرے مکان میں رکھّا
یوں مرا سینہ ہیں ہم اُن کے نمک خواروں کے بیچ
کوئی بچّہ گھر گیا ہو جیسے خرکاروں کے بیچ
یوں پیڑ ہزاروں تھے رہ شوق میں لیکن
سایہ نہ ملا ہم کو جہاں دھوپ کڑی تھی
یوں تڑپتا ہے فضائے آرزو میں آدمی
کوئی طائر پھنس گیا ہو جیسے طیّاروں کے بیچ

تھکن سے شکستہ ہو کر کسی زلف کے خیال میں رختِ سفر کو سائبان میں رکھ دینا اور ابتدا سے انتہا تک چلتے رہنا اور پرانے اور نئے کا درمیانی فاصلہ کم کر کے روایت کو جدید مرحلے تک لے آنا کچھ سہل کام نہیں ہوتا یہ وہ دریا دلی ہے جو لوگ پار کرتے ہیں جو تجربوں کی سچائی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر اور لسانی شعور پر معتبر گرفت رکھتے ہوں۔ افسر ماہ پوری نے یہ مشکل دریا پار کیا ہے اور سلامت روی کے ساتھ ساحلوں پر اترتے ہیں "غبارِ ماہ"

کی غزل کی جمالیاتی نوعیت اشتہاری نہیں ہے اور عشق کا تصور ہمیں بازاری پن سے دور رکھتا ہے۔ جمالیات کو ادراکی اور شعوری حوالے سے دیکھا گیا ہے اور عشق کو صرف جنونی جذبے کی بنیاد پر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ وہ فکری حوالے سے بھی اپنی پہچان کراتا ہے جذبے کی ہر سطح پر فکر اور تجربہ اپنے رنگ اور اپنی معنویت کے ساتھ چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ افسر ماہ پوری کی غزل ہمارے درمیان ایک ایسی چھاؤں ہے جو دھوپ کی شدتوں میں بھی ہلکی نہیں ہوتی۔ خوبصورتی اور اُس کی خواہش کے درمیان سچائی کی ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے جو ایک کو دوسرے سے الگ نہیں ہونے دیتی جس گھر میں دُکھوں کے جلے تنے ہوئے ہیں اور اُداسیوں کی ابابیلیں رہا کرتی ہیں اس گھر کو حُسن کی تازہ دھوپ کا انتظار بھی ہے جس نے وجود کو آگ سے لپیٹ دیا ہے۔ اس کی یادیں تر و تازہ بھی رکھتی ہیں۔ چاہتوں کا آغاز بھی وہیں سے ہوتا ہے جہاں انحراف کے منظر کھلنے لگتے ہیں۔ محبتیں لوگوں کو بزدل بنا دیتی ہیں کہ اکیلے چلنے والے تو بہت نڈر بہت جنوں پسند ہوا کرتے ہیں۔ افسر صاحب کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ سفر کرتے رہے ہیں جو اپنی انتہاؤں تک کبھی نہیں پہنچے۔ پاؤں کا بے تھکن ہونا اور راستوں کا غیر اختتامی ہونا کسی پُراسرار خواہش کا انکشاف ہے جس کی سطحیں عمومی نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

وہ کہیں ملتا تو امکان ظفر ہو جاتا
کُو بہ کُو میرا بھٹکنا بھی سفر ہو جاتا

دل سے وہ یوں گئے کہ پھر واپس کبھی نہ آ سکے
ویراں پڑا ہے یہ مکاں دھوپ نہیں ہوا نہیں

ہمیں کبھی تو نظر آئے گا ترا چہرہ
اسی خیال سے پتھر کو صاف کرتے ہیں

وہ ایک روز مرے ریگ جاں سے گزرا تھا
غزل میں ڈھل گیا پھر اُس کے نقش پا کا سکوت

وہ پلکیں دل میں اس طرح پیوست ہو گئیں
ہم تتلیوں کے پیچھے صدا بھاگتے رہے
حُسن کی دُھوپ نہ خیرہ کر دے
آنکھ پر ہاتھ کا سایہ کر لو
کون یار آتا ہے آج کل خُدا جانے
چاند میرے آنگن میں رات بھر چمکتا
شب کو پازیب کی جھنکار سی آجاتی ہے
بیچ میں پھر کوئی دیوار سی آجاتی ہے

افسر ماہ پوری نے دوہری ہجرت کے عذاب اٹھائے ہیں۔ گھر چھوڑا ہے گھر بنایا ہے اور پھر گھر کی تلاش میں بے ساٹباں جلتے رہے ہیں۔ کوئی اہم لکھنے والا ایسا نہیں جس نے اس زخم کو اور اُس کے دُکھ کو شدّت سے محسوس نہ کیا ہو۔ یہ تجربہ اجتماعی بھی ہے اور انفرادی بھی ہے یہی سبب ہے کہ اِس تجربے کی آواز اور اُس کی چوٹ دور تک اثر انداز ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان کا المیہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے انسانی تاریخ کے اوراق رنگ دیے ہیں لفظوں کی جگہ لہو کی بوندیں اور صفات کی جگہ انسانوں کے کٹے ہوئے جسموں کی دھجیاں نظر آتی ہیں۔ افسر ماہ پوری زخمی جسم و جاں کے ساتھ اِس آگ سے گزرے ہیں جلے ہوئے مکانوں کی اُڑتی ہوئی جو مٹّی اُن کے سفر کا تجرباتی حصّہ بنی ہے۔ اِسے اُنھوں نے لہجے کے دھیمے پن کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ افسر صاحب کی خوش گوئی اور نرم کلامی عمومی اور خصوصی دونوں سطحوں پر متاثر کرتی ہے۔ افسر صاحب تعمیر شدہ مکانوں کے دیوار و در کو اور بام و در زن کو پہچانتے ہیں مگر اجنبیت کی گرد اُڑتی رہتی ہے۔ اُنھیں تو راستے میں بھی سائے نہیں ملے اور گھر بھی جلتی ہوئی دھوپ کے حصار میں رہا۔ وہ سوچتے ہیں کہ ریت سے بھرے ہوئے آنگن میں اگر بیج بو دیا جاتا تو کوئی تناور شجر کا گہرا سایہ خانماں برباد لوگوں کو عافیت نصیب بتا سکتا تھا لیکن شاید ایسا کچھ نہیں ہو سکا۔

میری آنکھوں میں بسے دیوار و در ایسے بھی ہیں
ڈگمگاتے ڈوبتے دریا میں گھر ایسے بھی ہیں
ہم پھرتے ہیں کاندھوں پہ لیے اپنے گھروں کو
اے دیکھنے والے یہ تماشا بھی ذرا دیکھ
اپنی آواز بھی گم ہو گئی ہنگاموں میں
اور ہونا ہے ہمیں بے سر و ساماں کتنا
ہمیں دیوار و در سے کیا تعلق
ملا دو دشت کو میرے مکاں سے
تھک کے گر جائیں نہ ہم دھوپ میں چلتے چلتے
اس بیاباں سے ہے اب دُور گلستاں کتنا
ہم اس طرح رواں ہیں کسی شہر کی طرف
جس طرح کوئی آدمی چلتا ہو خواب میں
ہم تو کشکول لیے پھرتے ہیں قریہ قریہ
وہ ہمارا یہی مقصود سمجھتے ہوں گے
غالباً آ گئی پھر اہلِ جنوں کی منزل
اک چراغاں سا نظر آتا ہے ویرانے میں

افسر ماہ پوری نے ریت سے لبریز ویرانے میں ایک نئے گھر کی تعمیر تو کر لی مگر طنز کی صداقتوں کے باوجود اپنے گرتے ہوئے آنسوؤں کو وہ بھی نہیں روک سکے کہ اُن کا یہ گھر ایسے معاشرے میں اور ایک زمانے میں واقع ہے جہاں زمین سے آسمان تک قدر ناشناسی کا غبار اُڑتا ہے۔ انفرادی و اجتماعی سطح پر انصاف کے ہاتھ کٹ چکے ہیں منافقت اور جھوٹ کے روز و شب گردش میں ہیں۔ گھروں اور گلی کوچوں سے لے کر شہر و صحرا تک ذاتی مفادات کی وحشتوں نے اقدارِ حیات کو بے چہرہ کر رکھا ہے جسم و جاں مشینوں کی طرح آپ اپنی چیخوں میں گم ہیں۔

افسر صاحب یہ جلتے ہیں کہ دُنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوا لیکن پہلے کوئی کسی کے راستے میں آگ بھی نہیں بجھاتا تھا۔ افسر ماہ پوری ایک سچے تخلیق کار کی طرح اس آگ میں جلتے ہیں مگر شکستہ نہیں ہوتے۔ وہ اپنے خوابوں کو پگھلتا ہوا دیکھتے ہیں مگر خارجی اور واقعی سچائیوں کے درمیان اپنے آپ کو حوصلہ دیتے رہتے ہیں اور ظلم و بدصورتی کے خلاف اشارہ کرنا نہیں بھولتے۔ وہ کوزے میں سنگریزوں کو اتارتے رہے ہیں لیکن پانی ان کی پیاس تک نہیں پہنچا۔ صحراؤں کی شب آشنا ہواؤں نے چہروں کی پہچان چھین لی ہے اور اندھیروں میں وہ پرچھائیاں ستاروں کی کھیتیاں کاٹ رہی ہیں جو چراغوں کی قاتل ہیں اور سورج پر شب خون مارنے کی تیاریاں کرتی رہتی ہیں۔

ہماری آنکھ میں تارے ہنوز پلتے ہیں
اندھیری رات ہے لیکن چراغ جلتے ہیں
ظاہر ہے ہم تو راہِ وفا کا غبار ہیں
اب اُس کو سوچنا ہے جو پتھر ہے راہ کا
دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبت کے دیئے
کتنے انساں نے بجھائے ہیں ہوا نے کتنے
اس تیرگی سے آنکھیں تو پتھرا کے رہ گئیں
کب تک ہم انتظار کریں آفتاب کا
ہم تو چلتے ہیں ابھی دن کے اجالے میں مگر
اس بیاباں میں کہیں رات بھی ہو جائے گی
ایک دن دیکھنا ایسا ہو گا
آئینہ ہو گا نہ چہرہ ہو گا
پہچان آدمی کی نہیں سہل آج بھی
اک آدمی چھپا ہوا ہر آدمی میں ہے

افسر ماہ پوری کی غزل میں اس طرح کے تازہ اسلوب میں لکھے ہوئے شعروں کی تعداد اچھی خاصی موجود ہے انھوں نے اپنی شاعری میں زندہ تجربوں سے براہ راست بھی استفادہ کیا ہے اور اپنی انفرادیت کو ڈھونڈنا چاہا ہے۔ عمومی طور پر میں کسی لکھنے والے کی ساری تحریروں کو پسند کرتا ہوں لیکن وہ تحریریں مجھے بہت عزیز ہوتی ہیں جو کہنہ و فرسودہ حصاروں کو اور تقلیدی قطاروں کو توڑ کر اپنا اظہار کرنا چاہتی ہیں کہ یہی رویہ کسی لکھنے والے کو اہمیت سے ہمکنار کرتا ہے۔ افسر صاحب نے اپنی غزل کی بحروں میں اور عام لفظیات میں تو کچھ زیادہ تنوّع نہیں رکھا لیکن وہ اپنے موضوعات کے پھیلاؤ کو ضرور بڑھاتے رہے ہیں اور اپنے اظہار میں جدید ہونے تک پہنچ گئے ہیں۔ مجھے "غبارِ ماہ" کی غزل میں ایسے اشعار کی بڑی تعداد نظر آتی ہے جو زندہ شاعری کا حصّہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ افسر صاحب نے جہاں اجتماعی زندگی کو انفرادی حوالے سے لکھا ہے وہاں انھوں نے "ہم" کو "میں" بنا دیا ہے جس کے سبب اُن کے ایسے تمام اشعار پڑھنے والوں کو شدّت سے متاثر کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کو ہر تجربہ ذاتی تجربہ محسوس ہونے لگتا ہے پھر ایسے شعروں میں لمحۂ موجود خود آگے بڑھ کر خواب کی شکل اختیار کر لینا چاہتا ہے اس طرح افسر ماہ پوری کی غزل کا سفر ماضی سے حال تک اور حال سے مستقبل کا سفر بن جاتا ہے۔ اونچے درختوں کے سامنے سر خمیدہ ہونے والے اور چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرنے والے چہرے ہمارے گرد و پیش میں اترنے لگتے ہیں اور زندگی کی تلخ سچائیاں اپنے زخمی وجود کے ساتھ کرایہیں بن جاتی ہیں کہ گھروں میں چمکنے والے آئینے باہر کے موسموں میں زنگار آگلنے لگتے ہیں۔

اُدھر سفینہ روانہ ہوا کنارے سے
اُدھر ہوا نے قدم بادبان میں رکھّا

نجانے کیسے چمکتا ہے آج کل سورج
کہ اپنا سایہ بھی طوق و صلیب لگتا ہے

یہ دُنیا ہے یہاں بے حوصلہ کچھ بھی نہیں ملتا
جسے مہتاب لینا ہو وہ دریا میں اُتر جائے

جل گئیں ساری انگلیاں بجھ گئی ساری تیلیاں
پھر بھی ہوا کے سامنے دل کا دیا جلا نہیں

یہ زندگی تو نکلی چڑھائی پہاڑ کی
سایہ کہیں ملا بھی تو ہم ہانپتے رہے

کہاں ملتے ہیں آنسو آج کل دُنیا کی آنکھوں میں
سمندر اس طرح سوکھے کہ ساحل ہوتے جاتے ہیں

بٹ چکی چہروں میں اپنی چہرگی
اپنا چہرہ اب کوئی چہرہ نہیں

زندگی تو دُھوپ ہی کا نام ہے
اس بیاباں میں کہیں سایہ نہیں

بخشتی ہے خاک سے وابستگی جوشِ نمو
دیر تک رکھنے سے گلدانوں میں مرجاتے ہیں پھول

درختوں سے پرندوں کی صدا آتی نہیں افسر
سحر تو ہو گئی لیکن سحر ایسی نہیں ہوتی

ہر شام آرزو سے چٹکتے رہے شرر
شاید کسی گناہ کا سایہ شجر پہ تھا

افسر صاحب کی غزل کا مطالعہ ختم ہوا لیکن اُنھوں نے بنگلا نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں اور طبع زاد نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں قومی و ملّی، رومانی موضوعاتی اور استعاراتی نظمیں شامل ہیں۔ ان کو وہ کتاب کی شکل میں مرتب کر چکے ہیں جو طباعت اور اشاعت کے بعد ہمارے سامنے آجائیں گے۔ بیان میں اُن کی صرف دو ایک ایسی نظموں

کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری موجودہ زندگی کے مسائل کو بہت حد تک استعاراتی اسلوب میں پیش کرتی ہیں۔ بیسویں صدی کا وہ انقلاب جو انسان کے وجودی حوالے سے ہمارے سامنے آیا ہے۔ اُس میں بہت سی چھوٹی بڑی تبدیلیاں لکھی ہوئی ہیں۔ ان ہی تبدیلیوں میں ایک بڑی اور اہم تبدیلی یہ ہے کہ ہم اجتماعی انسانیت اجتماعی عمل یا اجتماعی شعور کے مقابلے میں فرد کی ذات کو اور فردیت کو زیادہ اہمیت کے ساتھ دیکھنے لگے ہیں یہ درست ہے کہ اُس اُفق سے انسان کی لامحدود صلاحیتیں اظہار میں آئی ہیں اور انسان بھیڑ بکریوں کے گلے سے نکل کر اپنی منفرد حیثیتوں کے ساتھ زمین پر ایستادہ ہے لیکن اپنی ذات کا یہ احساس جب نچلی سطح سے اوپر اٹھنے کی سکت کھو دیتا ہے تو انسان ایک طرف لامحدود زمین سے کٹ جاتا ہے اور دوسری طرف خود اپنی ذات کے مجوب دائرے کا قیدی بن جاتا ہے اور اُس کی مثال اس "مکڑی" سے قریب ہو جاتی ہے جو اپنے بُنے ہوئے کمزور جالوں میں بند ہو کر رہ جاتے۔ ذاتی مفادات کی خواہش جُرم نہیں ہے لیکن ذات کے اس احساس میں احساس غیر کا شریک ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسا زندگی کی صحت کے لیے تازہ ہواؤں میں سانس لینا ضروری ہے اسی حوالے سے افسر ماہ پوری کی ایک مختصر نظم "مکڑی" کو دیکھتے ہیں۔

مکڑی

ایک مکڑی
ایک مکڑی ہمارے کمرے میں
ایک گوشے میں جال بُنتی ہے
اس کے جالوں میں ہم نہ جانے کیوں
رفتہ رفتہ جکڑتے جاتے ہیں
لمحہ لمحہ سکڑتے جاتے ہیں

اس مختصر نظم کا اظہار ہمیں ذات کے حوالے سے کئی سمتوں کی جانب سوچنے پر

مجبور کرتا ہے۔ ہمارے اندر کا محدود پن جو ہماری انفرادی خواہش سے پیدا ہوتا ہے وہ ہماری اہمیت کو محسوس طور پر لمحہ لمحہ کم کرتا چلا جاتا ہے اور ہم ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کسی پرچھائیں یا کسی غبار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

افسر ماہ پوری نے جدوجہد، عمل، حرکت، تلاش اور جستجو کو زندگی کا رختِ سفر جانا ہے۔ یہی وہ سبب ہے کہ ایک سمت تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کو دیکھ کر انھیں دُکھ ہوتا ہے تو دوسری سمت انھیں دریاؤں کا اضطراب بھی بے چین کرتا ہے وہ اُڑتے ہوئے ایسے طائروں کو دیکھتے ہیں جو اپنی منقار میں وقت کو لیے ہوئے اپنے بازوؤں کو پھیلا کر منزلوں کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ افسر ماہ پوری دشتِ جنوں میں تھکن سے نڈھال ہونے والے ایسے پرندوں کو جانتے ہیں جن کے راستے اندھیروں میں گم ہیں اور جن کے بسیروں میں آگ چھپی بیٹھی ہے۔ ہجرت اور خانماں بربادی ہمارے عہد کے گہرے زخم ہیں جن کی آگ ابھی تک جل رہی ہے۔ افسر صاحب کو اس آگ سے دو بار گزرنا پڑا ہے۔ اُن کا صبر اور اُن کے برداشت کی بڑی اہمیتیں ہیں لیکن وہ لفظ اور وہ کرا ہیں جو دورانِ سفر انھوں نے لکھی ہیں اور محسوس کی ہیں وہ سب ہماری تاریخ کے زندہ سوالوں کی طرح ہیں۔ افسر صاحب کی نظم 'زرد پتے' ایک خوبصورت نظم ہے۔

زرد پتے

یہ زرد پتے
بچھڑ کے شاخوں کی انجمن سے
بھٹکتے پھرتے ہیں صحرا صحرا
تڑپتے پھرتے ہیں قریہ قریہ
خزاں کی سفاکیوں سے لرزاں
خموش گریاں
سموم و صرصر کی ٹھوکروں سے
جہاں میں ہر سو بکھر گئے ہیں

شفق کی قندیل بجھ چکی ہے
تھکے پرندوں کے قافلے بھی
رواں دواں سوئے گلستاں ہیں
مگر یہ بے خانماں مسافر
یہ زرد پتے
شجر شجر سے سوال کرتے ہیں
ہم کہاں ہیں

شجر سے ٹوٹنے کے بعد زرد پتے بن کر ہواؤں میں اڑتے رہنا اپنی زمین سے کٹ کر بے گھری کی علامت ہے پھر جب یہ "زرد پتے" دوسرے پرندوں کو اپنے گھروں کی طرف اڑان کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اُن کی تنہائی اور اُن کا دُکھ ایک سوال بن کر آواز دیتا ہے کہ ہم کس آسمان اور کس زمین کے درمیان ہیں کہ سموم و صرصر کی ٹھوکروں اور خزاں کی سفاکیوں میں لرزتے رہنا ہی ہمارا مقدر بن گیا ہے۔ افسر ماہ پوری کی نظم "زرد پتے" میں خود رحمی کے کسی تفوظی یا کسی انفعالی تجربے کو پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ نظم زندگی کے ایک بھرپور عملی پس منظر کو اور بہتر زندگی کی مضبوط خواہشوں کو ہمارے سامنے لاتی ہے اور اس کے آخری تاثر میں مایوسی کے بدلے ایک رجائی احساس ہمیں روشن رکھتا ہے۔

افسر صاحب کی ان دونوں نظموں کو پڑھ کر اور کئی دوسرے نظموں کو پڑھ کر مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ کوئی شکست خوردہ شاعر نہیں ہیں لیکن اُن کی شاعری کا بیشتر پس منظر انسان کے ازلی اور ابدی دُکھوں کا اختتامیہ لگتا ہے کہ انسان کی ساری محنتیں زندگی کے سارے تجربے اور عہد بہ عہد کا سارا ادراک و شعور ہمیں اُس آسودگی تک نہیں لے جاتا جس کی تلاش میں ہم مٹی بن جاتے ہیں۔

انسان "مکڑی" بن کر اپنے گرد جالا بُنے "آوارہ طائروں" کی طرح نئی منزلوں کی تلاش کرے یا "زرد پتے" کی مثال بن کر اُڑتا پھرے سب کی انتہائیں ایک جیسی

ہیں. شاید انسان کی پیشانی پر لکھی ہوئی یہی وہ لافانی بے حرف تحریر ہے جسے افسر ماہ پوری نے اپنے سچے اور گہرے تجربوں کی آنکھ سے پڑھ لیا ہے اور وہ انسان کو اپنی عظمتوں اور اپنی مجبوریوں کے درمیان پہچان سکتے ہیں.

عصر جدید کا تجربہ انسان کو یہاں تک لے آیا ہے کہ آنکھیں سورج کی سیاہی کو اور رات کے اجالوں کو ایک ساتھ دیکھ سکتی ہیں زندگی کا نیا ابلاغ تازہ فکر، جدید تجربوں اور نئے خوابوں کے ذریعے ہی ممکن ہے.

ہمارے عہد میں صداقتیں بھی بدلی ہیں اور پوشیدہ سچائیاں بھی اپنے اظہار میں آئی ہیں. ہم ایک ایسی عبوری اور ایک ایسی درمیانی پگڈنڈی سے گزر رہے ہیں جس پر چلتے ہوئے ہر قدم ہمیں اندھیرے میں گرنے کا خوف بھی ہے اور ہر سانس اپنی تلاش کا حوصلہ بھی ہے. رات کو صرف رات اور صبح کو صرف صبح سمجھنے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اب ہمیں رات اور دن کی پوری وحدت کو ڈھونڈنا ہے اور اس فرق کو اپنی فکری سچائی اور اپنی تخلیقی قوت کے حوالے سے اظہار میں لانا ہے جو ہمارے عقب کے خزانوں کا بھی پتا دے ہمارے سروں پر چمکتے ہوئے سورج کا آئینہ در آئینہ اعلان بھی بنے اور کسی تازہ تر ستارے کی خبر بھی سنا سکے اس حوالے سے افسر ماہ پوری کی شعری و نثری تحریروں کی اپنی ایک اہمیت ہے اور وہ زندگی کے سفر میں آگے بڑھنے کا حوالہ رکھتی ہیں۔

راستے کہاں کے ہیں

بیسویں صدی کی ابتدائی پانچ دہائیوں میں شعر و ادب کے حوالے سے ہندوستان کے شاہجہاں پور میں جو نام ہمارے سامنے آتے ہیں اُن میں دل شاہجہاں پوری اور اسعد شاہجہاں پوری کی بڑی اہمیت ہے۔ دونوں کی علمی و ادبی خدمات اور تہذیبی اقدار کی پاسداری سے پڑھنے لکھنے والے لوگ باخبر ہیں۔ اسعد شاہجہاں پوری، ناظم علی خاں ہجر شاہجہان پوری کے شاگرد تھے اور ہجر، داغ کے اہم شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اسعد صاحب کا مجموعۂ کلام "وجدانِ سلیم" اہلِ نظر کے مطالعے سے گزرا ہوگا۔ حنیف اسعدی، اسعد شاہجہان پوری کے بیٹے ہیں جن کا شعری سلسلۂ نسب داغ دہلوی سے ملتا ہے اور وہ شاگرد اپنے والد ہی کے ہیں۔ حنیف اسعدی کو شاعری وراثت میں ملی ہے۔ جب وہ نویں جماعت میں تھے تو انھوں نے پہلی غزل لکھی جس کا ایک شعر ہے ؎

زندگی بھر میں مسرت کا کوئی سانس نہیں
ملتے کس چیز کو نذرِ غمِ جاناں کرتے

یہ شعر حنیف اسعدی کا پہلا شعر ہے اور اس کی خارجی اور معنوی صورتیں اسعد شاہجہان پوری

کی کلاسیکی روایت کو اور تہذیبی زندگی کے رویوں کو اپنے اظہار میں لاتا ہے۔ حنیف اسعدی کی تربیت اور شخصیت میں بنیادی عناصر زندگی ۔ مثبت سلوک کے عناصر ہیں لیکن اُنیس سو اڑتیس میں جب وہ تعلیم کے لیے علی گڑھ پہنچے تو اُن کے اندر ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا جو اُنیس سو ستّر میں اپنی انتہاؤں تک پہنچ کر اُن کی موجودہ زندگی کا پیش خیمہ بنا ہے۔

حنیف اسعدی علی گڑھ گئے تو اُن میں مذہب کی پاسداری اور اسلامی روایات و عبادات کا عملی رجحان موجود تھا وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مسجد میں اذان دیا کرتے پنج گانہ نمازوں کے ساتھ تہجد ادا کرتے، روزے رکھتے اور اپنی ظاہری اور باطنی صورتوں میں ایک مذہبی خاندان کے فرد نظر آتے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب پورے ہندوستان میں تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ ادبی سطح پر ترقی پسند تحریک کے نظریات اور اُس کے اثرات پورے برصغیر میں شدت سے بڑھ رہے تھے۔ حنیف اسعدی کو علی گڑھ میں کچھ ایسے دوست مل گئے جنھوں نے خدا کی وحدانیت سے ہٹا کر طبقوں کی ماری کشمکش اور زمینداری اور سرمایہ داری کے غیر منصفانہ اور جابرانہ رویوں سے حنیف اسعدی کو لپیٹ دیا اور اُن کے اندر ایک اتنی بڑی تبدیلی آگئی جس میں تیس تیئیس برس وہ وحدانیت کی تلاش میں آوارہ گرد بنے رہے۔ حنیف اسعدی کا یہ سفر اُن کے مزاج اور اُن کے غور و فکر کا ثبوت بھی ہے۔ انھوں نے ذاتی تجربوں کے حوالے سے زندگی کو اور ماورا کو سمجھنے کی کوشش کی اور اُن کے اندر وہ سوالات پیدا ہوئے جو ہر سوچنے سمجھنے والے ذہن پر اترتے ہیں۔ انسان کا خدا سے کائنات سے اور دوسرے انسانوں سے اور خود اپنی ذات سے کیا تعلق ہے؟ ان سارے تعلقات میں سب سے اہم تعلق انسان اور خدا کا تعلق ہے جس کے بارے میں ہر عہد اپنے اپنے زاویے سے سوچتا آیا ہے۔ خدا اور انسان کا تعلق تخلیقی سطح پر بھی اظہار میں آیا ہے اور اس اظہار میں کہیں خدا کو بڑا ثابت کیا گیا ہے اور کہیں شیطان کو ہمارے یہاں خصوصی طور پر اقبال نے اور جوش نے اس تعلق کو اپنے اپنے زاویوں سے دیکھا

ہے اس حوالے سے سلیم احمد لکھتے ہیں کہ۔

"اقبال اپنے روحانی سفر کی ابتدا ہی میں یہ مان کر چلتے ہیں کہ خدا ہے اس کے بعد اگر ان کے دل میں کچھ سوالات اٹھتے بھی ہیں تو وہ انہیں خدا کے وجود کے بارے میں کسی تفتیش کا ذریعہ نہیں بناتے۔ اقبال کے برعکس جوش کے یہاں خدا کا مسئلہ اس طرح طے شدہ نہیں ہے۔ اقبال نے جن سوالات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا یا اپنے یقین کی مدد سے برطرف کر دیا یا چپ چپاتے اپنے باطن میں طے کر لیا۔ جوش نے ان سے کھلم کھلا آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی ہے۔ خدا ہے یا نہیں اگر ہے تو کیسا ہے۔ تمہارا رحیم اگر رحیم ہے تو اس کی بنائی ہوئی دنیا میں اتنا ظلم، اتنا دکھ، اتنے مصائب کیوں ہیں۔ کیا وہ قادرِ مطلق ہے اگر ہے تو شر پر قابو کیوں نہیں پاتا اس کے ہوتے ہوئے خیر کو پامال کیسے کیا جاتا ہے۔ پیغمبروں کی اتنی کثرت کے باوجود انسانی فطرت سے شر کا میلان کیوں نہ دور کیا جا سکا عملی زندگی میں شیطان اور طاغوتی قوتیں کامیاب کیوں ہیں۔ کیا عقل سے خدا کا ادراک کیا جا سکتا ہے اگر نہیں تو پھر اس کے اقرار کے لیے انسان کو مجبور کیوں کیا جاتا ہے کیا وہ انسانی تعاون کا محتاج ہے اگر نہیں تو پھر اپنے ماننے والوں سے خوش اور نہ ماننے والوں سے ناراض کیوں ہوتا ہے اُسے انسانی عبادت کی کیا ضرورت ہے وہ جہنم کا خوف اور جنت کا لالچ کیوں دیتا ہے۔"

یہ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے خیالات ہمیشہ انسانی ذہن کی آماجگاہ رہے ہیں۔ حنیف اسعدی کے یہاں ان خیالات کے درمیان اپنے آپ کو توڑنے اور جوڑنے کا عمل حیاتیاتی سطح پر ہوا ہے کہ انھوں نے نہ تو اقبال کی طرح تسلیم شدہ خدا کو مانا ہے اور نہ ہی جوش کی طرح خدا کو "شبیر حسن خاں سے چھوٹا سمجھا ہے" بلکہ وہ خدا کی وحدانیت تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبری میں پہنچے ہیں

کہ آقائے نامدار کی عظمتوں کا اعتراف ہمیشہ اُن کے جسم و جان کا مقصد رہا ہے۔ زندگی کے تلخ اور سخت تجربوں کے درمیان انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا دامن تھام لیا ہے اور اسی موڑ پر انسان کو پہچاننے اور انسان سے ملنے کی خواہش بھی حنیف اسعدی کے اندر زندہ ہوئی ہے۔

انیس سو اکہتر میں انھوں نے حج بھی کیا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت بھی کی جس کے بعد اُن میں نہ صرف اللہ کے یقین، رسول کی محبّت اور انسان کے دُکھوں کا احساس اور بڑھ گیا بلکہ اُن پر ایک ایسا بابِ رحمت بھی کُھل گیا جس نے انھیں نعت گوئی کا حوالہ بنا لیا۔ موجودہ حنیف اسعدی دین اور دُنیا کے توازن میں اور عملی و تخلیقی زندگی میں نفاست پسند با اعتبار اور ایک مہربان شخصیت کے طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ وہ ہمیشہ فرہاد کے ہم پیشہ رہے ہیں۔ نیوی کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد اب مسیحائی کرتے ہیں اور شعر لکھتے ہیں۔

"ذکرِ خیر الانام" اُن کا نعتیہ مجموعۂ کلام شایع ہو چکا ہے ایک غزل کا اور دو مجموعے "سہ مصرعیوں" کے طباعت و اشاعت کے لیے مرتب کر چکے ہیں ہم اُن کی پوری شاعری کو دو حصّوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُن کی شاعری کا پہلا حصّہ اُنیس سو اڑتیس سے اُنیس سو ستّر تک کا ہے اور اُن کی شاعری کا دوسرا حصّہ اُنیس سو ستّر سے اُنیس سو ستاسی تک آتا ہے۔ پہلے حصّے میں اُن کی غزل اور اُن کی بعض نظمیں ہمارے سامنے آتی ہیں اور پھر اُن کی نعت گوئی کے ساتھ ساتھ اُن کی غزل اور اُن کی سہ مصرعیاں ہمارا خصوصی مطالعہ بنتی ہیں۔ ہمیں پہلے اُن کے نعتیہ شاعری کو دیکھنا چاہیے۔

حنیف اسعدی اللہ کی سچّی وحدانیت تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبّت میں پہنچے ہیں جس کا اظہار اُن کی نعتیہ شاعری میں اکثر مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے وہ خدائی صفات تک پہنچنے میں اور اپنی دُعاؤں کو زندہ تاثیر تک پہچانے میں بابِ رحمت ہی کو حوالہ بناتے ہیں۔ وہ بڑی سچّائی کے ساتھ اس تجربے کو ظاہر کرتے ہیں کہ خدا تک

پہنچنے کا ذریعہ رسولِ اکرم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ درِ نبیؐ پر کھڑے ہو کر خدا سے اپنے لفظوں کی تاثیر اور اپنی خواہشوں کی تکمیل طلب کرتے ہیں لیکن درمیان کے مہین اور نازک فرق کو وہ جانتے بھی ہیں اور اُسے قائم بھی رکھتے ہیں۔ وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے درمیانی حفظِ مراتب کو کسی لمحے بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کا والہانہ پن اور اللہ کی عظمت کا شعور دونوں اُن کے وجود کی آواز بن کر ابھرتے ہیں۔ اُن کی نعت روایتی نعت گوئی سے اس لیے بھی مختلف لگتی ہے کہ اُنھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت میں اللہ کے جلال کو اور اُس کی بزرگی کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس حوالے سے اُن کے چند شعر دیکھتے ہیں:

لبِ گویا کو وہ معراج عطا ہو یارب
اُنؐ کی تعریف کروں تیری ثنا ہو یارب

بے خودی میں وہ نہ کہہ دوں جو نہیں کہنا ہے
شوق کو حفظِ مراتب کا پتا ہو یارب

اسی طرح تو ہے ترتیب پہلے کلمے کی
خدا کے ساتھ خدا کے نبیؐ کا ذکر کرو

دُعا کو بابِ اثر سے گزار کر دیکھو
درِ نبیؐ پہ خدا کو پکار کر دیکھو

پتا خدا کا خدا کے نبیؐ سے ملتا ہے
یہ راستہ بھی اُنھیں کی گلی سے ملتا ہے

وہ جسم آئینہ پیکر وہ نور ذات و صفات
کہیں خدا سے کہیں آدمی سے ملتا ہے

اذنِ طواف لے کر شہرِ دیں پناہ سے
کعبے کو جا رہا ہوں مدینے کی راہ سے

کیسا اثر ہے آپؐ کے حسنِ بیان میں
اُس کا یقیں دیا جو نہ آئے گمان میں

اللہ کی یاد نبی کی محبتوں سے وابستہ ہے کہ ثنائے محمدؐ ہی ثنائے خدا ہے۔ ذاتِ حق تو مبتدا کی طرح ہے جس کی خبر رسول اکرمؐ ہیں گمان سے یقین تک کے سارے امکانات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہی کھلتے ہیں اور رسولؐ کی صفات کا ادراک اور اُس کا اظہار نہ اسی طرح امکان میں نہیں ہے جس طرح اللہ کی عظمتوں کو محدود عقلیت کے ساتھ سمجھنا اور اُس کا بیان کرنا امکان میں نہیں۔ اکثر نعت لکھنے والوں نے عقیدے کے اظہار اور حصولِ ثواب کے لیے نعتیں لکھی ہیں لیکن حنیف اسعدی کی نعت گوئی میں جذبے کی جو شدت اور اظہار کا جو والہانہ پن ہے وہ اُن کی سچی محبتوں کی پہچان بھی ہے اور پڑھنے والوں پر اثر انداز ہونے والا طرز احساس بھی ہے۔ مرزا محمد منور نے لکھا ہے کہ

"حنیف اسدی کی نعتیں محبت عقیدت اور وارفتگی کے کیف سے معمور ہونے کے باوصف دوراز کار مبالغہ آمیزی سے مُبرّا ہیں ذرا غور کریں تو بظاہر عالمِ جذب میں لکھے ہوئے اشعار بھی درحقیقت اس صداقت پر مبنی ہیں جسے شعری صداقت نہیں بلکہ شعوری صداقت ہی قرار دینا پڑتا ہے کہ شعری صداقت حقیقت سے بہرحال دور جا پڑتی ہے اور اس طرح غلو کا لائیسنس بن جاتی ہے مگر اسعدی صاحب کی بیان کردہ صداقتیں قرینِ فہم ہیں اور عموماً قرآن و حدیث کے مفاہیم و معنی پر استوار ہیں۔ نبی کریمؐ کی ذات گرامی حیات و کائنات کا سبب بھی ہے اور زندگی کے سفر میں مسافر کوئی ہو کہیں کا ہو اس کی رہبری کرنے والی آواز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی آواز ہے جس کی مثال نہ پہلے کبھی وجود میں آئی اور نہ ان کے بعد آئے گی۔ اس حوالے سے چند شعر دیکھیے۔

اُس ذات پر صفات کی حجت ہوئی تمام
سیرت تمام نور بدن روشنی تمام
سب کو بقدرِ ظرف ملا ہے شعورِ ذات
اُمّیؐ لقب پہ ختم ہوئی آگہی تمام
نہ یہ جمال کسی کے جلال میں دیکھا
نہ ایسا عجز کسی بھی جہاں پناہ میں ہے
کیا مرتبہ ہے اُس تنِ عنبر سرشت کا
جس نے کبھی گلہ نہ کیا سنگ و خشت کا
اُن سرکشوں کو آپؐ نے خیراً شنا کیا
احساس تک نہ تھا جنھیں اپنی سرشت کا
ایسے آقا ہیں کہ ہے ساری خدائی اُن کی
ایسے بندے ہیں کہ ہے جن کا ثنا خواں آقا

انسانی تاریخ پر جو اثرات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ثبت ہوئے ہیں اُن اثرات میں اپنے مثبت ماضی کو بھی زندہ کیا ہے اور موجود و آئندگان پر ایسے لازوال نقش اُتارے ہیں جو سورج کے برف بننے تک پائندہ رہیں گے۔ ہر عہد اور ہر نسل کا انسان اُن اقدار کو اور اُن اصولوں کو اپنے جسم اور جان کی خواہش بنا کر آسودہ رہ سکتا ہے جو حیاتِ طیبہ میں عکس ریز ہیں۔ لاکھوں برس کا انسانی ارتقاء ہمارے جدید عہد کی تیکنالوجی اور سائنسی ذہن اپنی جن فتوحات تک پہنچا ہے اُن کے درمیان رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر اور اُن کا عمل کسی طرح بھی باطل قرار نہیں پاتا بلکہ گزرے ہوئے موجودہ اور آنے والے زمانوں کی تصدیق اور تائید رسولِ اکرمؐ کے فکر و عمل سے ہوتی ہے۔ انسانی بقا اور اُس کی آسودگی کی تقویم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشور کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ حنیف اسعدی کے لاشعور میں یا اُن کے

جذبوں کے کسی گوشے میں یہ ادراک موجود ہے اسی لیے انھوں نے لکھا ہے کہ

روح بن کر وسعت کونین میں زندہ ہیں آپؐ
صرف ماضی ہی نہیں ہیں حال و آئندہ ہیں آپؐ
ہر زمانہ آپ سے کرتا رہے گا کسبِ نور
ردِّ ظلمت کے لیے وہ نقشِ تابندہ ہیں آپؐ
سب نبی اپنے عہد کے تھے نبی
لیکن اب عہد آفریں آئے
آپؐ ان کے لیے بھی رحمت ہیں
جو زمانے ابھی نہیں آئے

رسولِ اکرمؐ کا عملی و فکری سفر انسانیت کا ایک ایسا ابدی سفر ہے جس کو ہر عہد اور ہر نسل نے اہمیت دی ہے اور سچا مانا ہے۔ حیاتِ محمدیؐ کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے بشری معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے انفرادی و اجتماعی معاملات تک ایک ایسی روشنی بچھی ہوئی ہے جو قریب اور دور اپنے اثرات مرتب کرتی چلی جا رہی ہے۔ دنیا کے عظیم ترین انسانوں سے عام لوگوں تک حیاتِ طیبہؐ ایک منفرد اور لازوال مثال کی طرح ہے۔ یہ کسی جذباتیت یا کسی عقیدت کا کوئی مسئلہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسی زندہ حقیقت ہے اور ایک ایسا تاریخی شعور ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں

حنیف اسعدی کی نعت گوئی میں جو خواہش ثواب نظر آتی ہے وہ ایسی ہمہ رنگ یا ایسی شدید نہیں جسے اُن کی ذاتی اور قلبی محبتوں کے مقابلے میں رکھا جا سکے حنیف اسعدی کی نعت رسول اکرمؐ کی سراپا نگاری یا ان کے خدوخال یا اُن کے چشم و لب و عارض کے جمالیات کا اظہار نہیں ہے بلکہ اُن کی نعت تخلیقی اور معنوی دونوں اعتبار سے اپنے عہد تک کی نعت میں اس لیے بھی مختلف اور منفرد ہے کہ انھوں نے خارجی حوالوں سے زیادہ اپنے باطنی تعلق کو اہم سمجھا ہے اس حوالے سے چند شعر دیکھتے ہیں:

گماں تھے ایسے کہ آثار تک یقیں کے نہ تھے
حضورؐ آپ نہ ہوتے تو ہم کہیں کے نہ تھے

میں نے دیکھا تو نہیں آپ کو سوچا ہے بہت
خیرہ آنکھوں میں خدوخال اُبھاروں کیسے

آپؐ نے تو ہر طرح سکھلائے آدابِ حیات
ہم پہ یہ ادبار اپنی خودسری سے آئے ہیں

اک نظر ایسی بھی مجھ پر مرے آقا ہو جائے
قطرہ دریا تو نہیں ہوتا ہے دریا ہو جائے

جو فراق ہو تو اویسؓ سا جو وصال ہو تو بلالؓ سا
یہ کرم ہو میرے بھی حال پر غمِ نزدود مجھے بھی دیں

ہم کو یہ سوچنا ہے کہ نزدیک ہیں کہ دور
ان کے لیے تو ایک سے ہیں اُمتی تمام

سارے وجود سارے بدن سے پڑھوں درود
وارفتگی میں خود سے گزر کر پڑھوں سلام

مجھے شعور نہیں آپ کے مناقب کا
حضورؐ میری یہ مدحت مرے شمار سے ہے

حنیف اسعدی پابرہنہ جاں شکستہ دل گرفتہ اور غم زدہ ہو کر جانِ رحمتؐ کے دیار میں حاضر ہوئے تو جیسے رحمتِ عالم ان کے سامنے موجود تھے جہاں حنیف اسعدی نے اعتراف کیا کہ میرے جسم کے ساتھ میری روح بھی آلودہ رہی ہے۔ میں کیسے آپؐ کے جلووں کو اپنے روحانی وجود میں سمیٹوں۔ رسول اکرمؐ سے حنیف اسعدی کا ذاتی و قلبی تعلق اس حد تک شدید محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک واردات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ رسول اکرمؐ کے تعلق سے جب یہ واردات اپنے اظہار میں آتی ہے تو زندہ جسم و جان رکھنے والے ان اشعار میں صرف حنیف اسعدی کے وجود کو تحلیل ہوتے ہوئے نہیں

دیکھتے بلکہ اسے اپنی حسرتوں کی آواز محسوس کرنے لگتے ہیں۔

قبول کر کے درود میرے پیام سُن کر سلام لے کر
حضورؐ نے کچھ کہا تو ہوگا اگر کہا تھا تو کیا کہا تھا
ہماری گمراہیوں کے قصّے ہماری بدبختیوں کا عالم
حضورؐ آقا بیاں کیا تھا تو کس طرح سے بیاں کیا تھا
مری طرف سے بچشمِ گریاں یہ بات تم نے کہی تو ہوگی
اُسے بھی تھی حاضری کی حسرت اسے بھی رحمت کا آسرا تھا
وہ آہ اک بار پھر تو کھینچو جو دل سے اٹھی تھی وقتِ گریہ
وہ سیلِ گریہ مجھے دکھاؤ جو وقتِ رخصت رواں ہوا تھا

حنیف اسعدی کی اس واردات کا اظہار بہت حد تک کلاسیکی ہے لیکن اہلِ بصیرت محسوس کر سکتے ہیں کہ ان عام سے لفظوں میں تازہ سچائی کی اور نئی خواہش کی کیسی چمکدار آگ روشن ہے۔ رسولِ اکرمؐ کے حوالے سے شہرِ مدینہ بھی نعت گوئی کا ایک اہم موضوع رہا ہے اس شہر کی عقیدت اور اس سے محبت کی تمام بنیادیں رسولِ اکرمؐ کے تعلق پر ہی رکھی جاتی ہیں۔ یہ بھی دوست ہے کہ مدینے کی خاک جس بدن پر پڑ جائے روحانی سطح پر وہ صندل بن جاتا ہے اور اس شہر کی مٹّی جن آنکھوں سے چھُو جائے وہ آنکھیں جسم و جان کے پار بھی دیکھ سکتی ہیں لیکن بعض لوگوں نے اس عقیدت کو اتنا طول دیا ہے کہ وہ مدینے کے بدلے جنّت سے بھی دستبردار ہو گئے ہیں یہی رویّہ حفظِ مراتب سے انحراف کا رویّہ ہے جس کا ادراک حنیف اسعدی کو ہمیشہ رہا ہے۔ وہ مدینے کو عالمی انسانی محبّت کا استعارہ بنا کر ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ انھوں نے مدینے کو صرف ایک شہر نہیں سمجھا ہے بلکہ وہ اسے ایک ایسی عالمگیر تحریک سمجھتے ہیں جو انسانوں کی بقا اور آسودگی کی ضمانت دینے والی ہے اور مدینے کی ہم سفری انسانی محبتوں کی ہم سفری ہے

جانے کس سمت لیے جاتی ہے دُنیا ہم کو
راہ میں کعبہ ملا ہے نہ مدینہ آیا

حقیقت سایہ افگن ہے زمیں پر
زمیں کا عرش ہے شہرِ مدینہ
اب اس منزل پر عمرِ مختصر ہے
سفر میں ہوں مدینہ ہم سفر ہے

حنیف اسعدی نے تخلیقی سطح پر حیاتِ طیبہ کو اور اُن کے فکری و عملی نقوش کو جس طرح جذب کیا ہے وہ اُن کی پختہ انفرادیت کی مثال ہے۔ نعت گوئی کے حوالے سے حنیف اسعدی نے جو عزت اور جو اہمیت حاصل کی ہے وہ پڑھنے لکھنے والوں پر ظاہر ہے اور کئی مقامات پر انھوں نے اپنے تخلیقی اظہار کی خواہشوں کو اور اُس کی مجبوریوں کو بھی بیان کیا ہے کہ نبی کریمؐ کی صفات و توصیف بے حد و حساب ہیں اس سمندر کا کوئی ساحل نہیں ہے اس آفاق کے کنارے گم ہیں اور اس زمین کے طویل ترین سلسلے کہیں اختتام تک نہیں پہنچتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اپنی مجبوری اور اپنی بصیرتوں کے مکمل اظہار کے بعد بھی کچھ بھی نہ کہا گیا ہو یہی اس عظیم ترین شخصیت کی پہچان بھی ہے اور ہماری کم مائیگیوں کی دلیل بھی ہے۔

یارب یہ تمنا ہے کہ نازل ہو وہ ہم پر
جو نعت ابھی قرض ہے قرطاس و قلم پر
اتنا آسان تو نہیں آپؐ کی سیرت کا شعور
روح کی راہ سے گزرے تو بیاں میں آئے
لکھنی ہے ذرّے ذرّے پہ مدحِ حبیبِ پاک
شایانِ شان لوح و قلم چاہتا ہوں میں
عین مدحت ہے محمدؐ کہنا
نام ایسا کہ ثنا ہو جیسے
خدا کا ذکر کریں مدحت نبیؐ لکھیں
سوائے اس کے کمالِ سخنوری کیا ہے

حنیف اسعدی کی نعت گوئی کے فنی حوالے کو بھی اہمیت حاصل ہے سحر انصاری نے لکھا ہے کہ

"حنیف اسعدی کا کمال یہ ہے کہ وہ زبان، لہجہ، تلازمات اور آہنگ غزل کا استعمال کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض نعتیں ایسی زمینوں میں کہی ہیں جن پر غزل کہنا بھی دشوار ہو لیکن اپنے اس روحانی تجربے کی بنیاد پر جو انھیں نعت رسولؐ اور زیارتِ در رسولؐ سے حاصل ہوا ہے وہ اپنی نعت کو ایسا کلام بنا دیتے ہیں جس میں نعت کے تمام آداب کے ساتھ ساتھ شگفتگی، لطافت، معنی انگیزی اور ندرتِ الفاظ بھی ملتی ہے۔ حنیف اسعدی احترام رسول پاکؐ اس قدر عزیز و مقدم ہے کہ انھوں نے آپؐ کے سوا تخاطب کا کوئی اور پیرایہ حضورؐ کے لیے اختیار ہی نہیں کیا۔"

یہ بات درست ہے کہ حنیف اسعدی نے اپنے نعتیہ اظہار کو اتنا ہی محترم رکھا ہے جتنا محترم وہ رسول پاکؐ کی محبت کو رکھتے ہیں۔ اُن کی پوری نعتیہ شاعری آپؐ سے تخاطب سے ہٹ کر تم یا تو کو اظہار میں کہیں نہیں لاتی لیکن سلیم احمد نے جن دو نعتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی مثال پوری اُردو شاعری میں موجود نہیں ہے اُن میں سے ایک نعت میں "تم" کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ سلیم احمد لکھتے ہیں کہ

"انھوں نے دو نعتیں ایسی کہہ دی ہیں جو ہر زمانے میں نعت گوئی کا حوالہ بن سکتی ہیں۔ یہاں حنیف اسعدی اجتماعی تشخص کو اُن کڑیوں کی اگلی کڑی بن گئے ہیں جہاں نعت ایک نئی تخلیقی جہت کو پیدا کرتی ہے جہاں فن، موضوع جذبے کی صداقت اور تاثیر ایک ایسی اکائی میں ڈھل جاتی ہے جس سے زندہ رہنے والی نعتیں ظہور میں آتی ہیں اُن میں سے ایک تو وہ نعت ہے جو حضورؐ کی ایسی تصدیق

کرتی ہے جس کی مثال پوری اردو شاعری میں موجود نہیں ہے اور اس میں حنیف اسعدی کی محبتِ رسولؐ ایک ایسا اسلوب اختیار کر لیتی ہے جو اسے زندہ رہنے والی نعتوں میں شامل کر دیتی ہے اس نعت کا مطلع ہے

کوئی انؐ کے بعد نبی ہوا ؟ نہیں اُن کے بعد کوئی نہیں
کہ خدا نے خود بھی تو کہہ دیا نہیں اُنؐ کے بعد کوئی نہیں

اور پھر اُن کی وہ نظم جو درود و سلام کی روایت میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔ وہ ایک طرف تو اب تک کی تمام نعتیہ شاعری کی روایات اپنے اندر جذب کر لیتی ہے تو دوسری طرف اردو نظم کے سرمایہ میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کرتی ہے وہ نظم جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

تم پہ لاکھوں درود　　تم پہ لاکھوں سلام
اے شہرستِ وجود　　تم پہ لاکھوں درود
شاہِ خیر الانام　　تم پہ لاکھوں سلام

ان دونوں نعتوں کو یقیناً اردو شاعری میں عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حنیف اسعدی نے اپنی تخلیقی عمل اور عقیدے دونوں کو ملا کر اپنی شاعری اور شخصیت کا بنیادی حوالہ بنا دیا ہے۔"

سلیم احمد کی اس رائے میں حنیف اسعدی نے اتنا اضافہ اور کر لیا ہے کہ گزشتہ برس ایک ایسی حمد انھوں نے لکھی ہے جس کا شمار انھیں دو نعتوں کے حوالے سے اپنی اہمیتوں تک پہنچتا ہے اس حمد کا ایک مختصر اقتباس دیکھ لیجیے۔

اے محمدؐ کے رب
تیری سب پر نظر

سب کو تیری طلب اے محمدؐ کے رب
حسنِ بے خال و خد
قامتِ بے جسد
تو ازل، تو ابد
تو احد، تو صمد
رازقِ نیک و بد
قدر داد و ستد
ماورائے۔ خرد
مصطفیٰ۔ ایک حد
ایک حد بولہب
اے محمدؐ کے رب

اس حمد کے گیارہ استنزا ہیں جو مختلف قافیوں میں لکھے گئے ہیں اس میں خدا، انسان اور کائنات کے درمیان جتنی تخلیقات اور جتنی مضمرات ہیں جتنا اندھیرا اور جتنی روشنی ہے جتنی حرکت اور جتنا جمود ہے جتنی حیات اور جتنی موت ہے جتنا عدم اور جتنا وجود ہے جتنا جبر اور جتنا اختیار ہے۔ وہ سب ذاتِ خداوندی کے حوالے سے اور اُس کی صفات کے جتنا جمال اور جتنا جلال ہے۔ حوالے سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مکان سے لامکان تک ایک ایسی وحدت اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے جہاں ایک طرف مصطفیٰؐ کھڑے ہیں اور دوسری طرف ابولہب موجود ہے اور ان کے درمیان خدا کی آواز ہے جو پکارتی ہے کہ روشنیوں کی طرف، انصاف کی طرف امن کی طرف محبتوں کی طرف اور سچ کی طرف آجاؤ۔ حنیف اسعدی کی یہ حمدیہ نظم اپنے تاثر میں اور اپنے معنوی گہرائیوں میں ایک ایسی بے مثال نظم ہے جو موجودہ لکھنے والوں میں مشکل سے ہی ملے گی۔

حنیف اسعدی نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی اور زیادہ تر انھوں نے غزل ہی لکھی ہے۔ نظموں کی چند مثالیں بھی ہمارے مطالعے میں آئی ہیں جس کے بعد محسوس

ہوا کہ اُن میں نظم لکھنے اور خیالات کو تسلسل کے ساتھ مربوط انداز میں بیان کرنے کی تخلیقی صلاحیت موجود تھی، لیکن غزل کی عمومی پسندیدگی اور مشاعروں کی مقبولیت نے شاید انھیں نظم لکھنے سے باز رکھا۔ حنیف اسعدی کی غزل کتابی شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہے پھر بھی جو کچھ پڑھا جا سکا ہے اُس کے حوالے سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ حنیف اسعدی کی شاعری اُنیس سو اڑتیس سے اُنیس سو ستر تک اپنے اندر مختلف موضوعات رکھنے کے باوجود ایک ہی سطح اور ایک ہی رنج کی شاعری لگتی ہے۔ اس پورے زمانے میں اُن کی غزلوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان غزلوں کا بڑا حصّہ کلاسیکی طرزِ اظہار روایتی عشق اور تہذیبی اقدار کے حوالے سے لکھا گیا ہے یہ درست ہے کہ حنیف اسعدی اپنے طور پر ہمیشہ غور و فکر کرتے رہے ہیں اور علمی جہتوں سے زیادہ عملی تجربوں سے اپنے تخلیقی شعور کو اور اپنی فنّی آگہی کو روشنی پہنچاتے رہے ہیں اسی سبب سے اُن کی یہ شاعری پرانے پن کا شکار ہونے سے بچ گئی ہے۔ پہلے ہم اُن کے مختلف بنیادی موضوعات کو اُن کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

پاکستان کی زمین پر آباد ہونے کے بعد جہاں بہت سے لوگوں کے ٹوٹے ہوئے خواب جُڑ گئے تھے وہیں بہت سے ثابت و سالم خواب شکستہ بھی ہوئے تھے شکستہ ہونے والے خوابوں کی ایک نمائندہ آواز "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" ہے جس کی تصدیق اپنے اپنے طور پر دوسرے لکھنے والوں نے بھی کی ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ جو لوگ اپنے گھروں سے نکل کر کھلی ہوئی زمینوں پر آ بیٹھے تھے اُن کے مسائل اور اُن کی اذیتیں کیسی نازک اور کیسی شدید ہوں گی پھر جب کچھ مختلف مزاجوں اور مختلف آوازوں کو ہم آہنگ کیا جاتا ہے تو کئی داخلی شکلیں بھی درپیش ہوتی ہیں۔ حنیف اسعدی ایسی شکلوں سے گزرے بھی ہیں اور انھوں نے انھیں شدّت سے محسوس بھی کیا ہے کہ اُن کی غزل میں اس کا تخلیقی اظہار موجود ہے

کیا ہوئی یہ پوچھو تو شب زدہ سویروں سے
وہ کرن جو پھوٹی تھی ڈوبتے اندھیروں سے

وہ متاعِ آخر بھی لوٹ لی ہے اپنوں نے
جو بچا کے لائے تھے راہ کے لٹیروں سے
دل کے داغ جل اٹھے ہم جو پاس سے گزرے
بُو لہو کی آتی تھی رہبروں کے ڈیروں سے
دریدہ دامنِ ہستی نظر جنوں آثار
میرے وجود میں حل ہو گیا ہے ویرانہ
قافلے دُور دُور تک پہنچے !!
رہ گئے ہم غبارِ راہ کے ساتھ
شہر کے شور شرابے میں تو بِک نہ سکی فریاد کی دار
صحرا کا سناٹا آخر اپنا ہم آواز ہوا
باطن تو پسِ پردہ ہے ظاہر بھی ہے پردہ
اِک چہرہ بھی اس دہر میں بے غازہ نہیں ہے

راہِ حقیقت کی رمزیت کا اور بے خبری کی نشاط انگیزیت کا اظہار ہم سفروں کے سامنے اور دوستوں کے سامنے ہی کیا جا سکتا ہے لیکن رات جب آہوں اور آنسوؤں میں گزرے اور انتظار کے چراغ سر بریدہ ہوتے چلے جائیں تو انسانی وجود کون سی پناہ گاہ تلاش کرے یہ اور اس طرح کے بہت سے تجربے حنیف اسعدی کے عملی ادراک سے گزرے ہیں۔ اُنھوں نے عروج و زوال کو ایک ساتھ دیکھا ہے اور ایک انقلاب کے پیچھے دوسرے انقلاب کی آہٹیں سُنی ہیں انھیں بھی گھر بہت یاد آیا ہے مگر وہ وحشت کدۂ جاں سے گزر نہیں سکے کہ دوبارہ گھر کی طرف دیکھ سکتے اُنھوں نے دعا کے لیے ہاتھ تو اٹھائے ہیں لیکن طلب کا کوئی رنگ اُن کے دستِ سوال میں نہیں اُترا وہ قناعت پسندی سے گزرتے رہے اور اپنے سفر کی انتہاؤں کو جاننے کی کوشش کرتے رہے۔

شاید بے مروّت کی طرح مجھ میں رہا بھی
کہتا ہے زمانہ مجھے اچھّا بھی بُرا بھی
وہ آدمی جو بھری بزم میں بھی تنہا تھا
خلا میں جا کے بھلا کیا سکون پائے گا
آخر کہیں تو ٹھہرے گا اک روز رخشِ عمر
کب تک چلے گا قافلۂ روز و شب کے ساتھ
اہلِ بینش جانتے ہیں یہ جہانِ رنگ و بو
میرا رستہ ہے میں سیرِ عالمِ فانی میں ہوں

حنیف اسعدی کو عالمِ فانی کا ادراک انسانی زندگی کی اہمیّت کا اندازہ اور انسانوں کی شناخت کا شعور بتیس برس کے آوارہ گرد لمحوں سے ملا ہے کہ دیر و حرم میں غبار اڑتا ہے اور انسان بت بھی ہے اور خدا بھی ہے۔ حنیف اسعدی نے طویل لمحوں تک داخلی اضطراب کو ذہنی کرب کو اور جسمانی اذیتوں کو بھی برداشت کیا ہے اور خارجی زندگی کی رنگارنگی کو اور اُس کی خوبصورتیوں کو تسخیر کرنے کی کوشش بھی کی ہے اس حوالے سے حسینوں سے ملاقات کے لیے انھوں نے مصوّری تو نہیں سیکھی مگر ستارہ شناسی اور اُس کے منسوبات میں اچھی خاصی مہارت ضرور حاصل کر لی۔ اُنھوں نے رقص اور موسیقی کے مشاغل بھی کیے وہ ایک زمانے میں بہت اچھے ستار نواز بھی رہے اور آج بھی وہ موسیقی سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ نجومیات کے حوالے سے اُن کے چند منتخب قطعے دیکھیے۔

یہ بات تو کوئی اختر شناس ہی جانے
مرا ستارہ شرف میں ہے یا ہبوط میں ہے
جو ہر نوشتۂ تقدیر کو کرے منسوخ
وہ خط تو میرے کفِ دست کے خطوط میں ہے

یہ ٹمٹماتے ستارے یہ ڈگمگاتے شہاب
یہ سنگریزے یہ پتھر کے بت یہ سیارے
یہ پُر فریب اُجالے یہ روشنی کے سراب
ضیائے مہر کے دریوزہ گر ہیں بے چارے
مجھے پسند نہیں کبر و نخوت مریخ
نہ مشتری کی مروّت نہ پاک دامانی
مری نگاہ طرب آشنا کو ہے درکار
جمالِ زہرہ و پروین کی جلوہ سامانی

حسن پسندی خوشدلی اور شگفتہ خیالی حنیف اسعدی کے مزاج میں شامل ہے مگر وہ سنجیدہ اور گہرے معنوی عمل کو اہمیّت دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں بازاری پن یا گھٹیا رویّے بے آواز ہی رہے ہیں۔ اختر شناسی کے حوالے سے اُن کی ایک نظم "برج میزان" کا ذکر ضروری ہے کہ برج میزان کی تذکیر کی نیک خوئی شرافت عدل انصاف اور صلح جوئی وغیرہ کا ذکر کر کے حنیف اسعدی نے اس برج کے حاکم کوکبِ زُہرہ کا سراپا بیان کیا ہے۔ نظم کے درمیانی اقتباس دیکھیے۔

متمکن بہ فرش رعنائی
اک غزال بہ شان یکتائی
ہر نفس غرق رنگ و مستی میں
رامش و رقص و مے پرستی میں
نرم و نازک نقوش گورا رنگ
کچّی چاندی کہوں کہ کورا رنگ
جسم دہرا بھرے بھرے بازو
چشم بادہ فروش میں جادو

کہہ رہی ہے فرازئ سینہ
ہفت افلاک کا ہوں میں زینہ
تیرہ تر زلف صندلی شانے
گردش روز و شب کے افسانے
گلِ شاداب و غنچۂ نوخیز
ملتفت گرم جوش زود آمیز
بہ سعادت حلیم و خلق آثار
با حیا نرم طبع خوش کردار
بہ نحوست بدی کا پُشتارہ
فاحشہ، بے لگام، آوارہ

اس دور کے شعری مطالعے سے پہلی بات تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ حنیف اسدی کے یہاں غزل اور نظم کے اسلوب الگ الگ رہے ہیں اور نظموں میں کوئی ایسا اظہاریا کوئی ایسا تجربہ سامنے نہیں آیا ہے جسے منفرد یا تازہ تر کہا جا سکے لیکن غزل کے بہت سے اشعار اچھے ضرور لگتے ہیں اور اپنا تاثر بھی چھوڑتے ہیں نظموں کے موضوعات علمی اور درسی ہیں اور فارسی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں مگر ان نظموں کو پڑھتے وقت قدرے نئی چیز کے مطالعے کا احساس ہوتا ہے۔

گزشتہ اٹھارا برس حنیف اسدی کی زندگی اور اُن کی شاعری دونوں کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب وہ انکار اور تلاش کے سفر سے ہوتے ہوئے یقین اور سچائی کی حدوں میں آئے ہیں ان اٹھارہ برسوں میں فکری اور عملی سطح پر جو کچھ کیا ہے اور تخلیقی حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اُس میں اُن کی منفرد نعت گوئی بہت حد تک تازہ غزل اور سہ مصرعیوں کا کامیاب تجربہ شامل ہے۔ اس عرصے میں حنیف اسدی نے انسان کی ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں کو لکھنے کی کوشش کی ہے وہ ایک مہذب انسان کا تصور رکھتے ہیں اور تہذیبی اقدار کے حوالے سے اپنے عہد کے انسانی

فکر و عمل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ عالمی انسان پر بھی ایک طائرانہ نظر کرتے ہیں اپنے معاشرے کو قریب سے دیکھتے ہیں اور پھر اپنی ذات کے حوالے سے اُس انسان کی بازیافت چاہتے ہیں جو کہیں گم ہو گیا ہے یا اپنا پورا چہرہ آئینوں میں اتار نہیں پا رہا ہے ہم نے اس دور کی غزل سے جو انتخاب کیا ہے اور جن موضوعات کی شدت کو اور اہمیت کو محسوس کیا ہے انھیں الگ الگ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عالمی سطح کو چھو کر جو خیالات گزرے ہیں اُن کا تخلیقی اظہار حنیف اسعدی نے کچھ یوں کیا ہے۔

بربادی کی لہر اٹھی ہے = ساحل ساحل گھوم رہی ہے
روح بدن جذبات رویے = سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

شہرِ جاں پر میرا اپنا ہی وجود
پھر کسی حملے کی تیاری میں ہے
اک لفظ جسے فراق کہیے
لکھتا تو کتاب ہو گیا ہے
زلیست اندھی رہ گزاروں میں ہے گم
خواب کا سا حال بیداری میں ہے
رنگت تو اُڑا کے لے گئی دھوپ
خوشبو کہیں اور بس گئی ہے
شعلے سے لپک رہے ہیں تن میں
وحشت سی لہو میں بس گئی ہے
بھاگے تو ہو تن کی کلفتوں سے
جاں کس کے سپرد کر گئے ہو
پتھر کی لکیر کی طرح تھے
لفظوں کی طرح بکھر گئے ہو

اپنے ہی وجود میں سمٹ کر
اپنے ہی بدن میں مر گئے ہو

اجتماعی روحانیت سے کٹ کر ذاتی مفادات اور مادی اغراض میں سمٹ کر رہ جانا نہ صرف انسانی وحدت کا سب سے بڑا نقصان ہے بلکہ ایک ایسا کرب ہے جس کی تلافی کا ہر امکان بجھتا جا رہا ہے اپنے اندر پوشیدہ ہو جانا زندگی کی خواہشوں سے کٹ کر خوف کے گنبد میں قید ہو جانے کے برابر ہے یا زرد پتے کی طرح عمر بھر ہواؤں کے دوش پر تھکن کے سفر میں اڑتے رہنا ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ حنیف اسعدی کی غزل میں انسان یا انسانیت کا کوئی فلسفہ زیر بحث آیا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اُن کی حساسیت نے اس عالمگیر اضطراب کو اپنا تخلیقی اظہار بنانے کی کوشش ضرور کی ہے۔

حنیف اسعدی کی نظر اور اُن کا تنقیدی و طنزیاتی شعور اپنے معاشرے کی ناہمواریوں کو اور اپنے گرد و پیش کے رہنے بسنے والوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ انسان کو عدل محبت سچائی اور امن کی حالت میں پسند کیا ہے۔ انسان سے انسان کا رشتہ اور معاشرے سے افراد کا تعلق زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے۔ وہ جب روشنیوں کو اندھیروں میں ڈوبتا ہوا دیکھتے ہیں تو ایک حساس فرد کی طرح اور ایک تجربے کار آواز کی طرح معاشرے کے کالے چہروں سے مخاطب ہوتے ہیں۔

کبھی دُنیا سے گریزاں کبھی خود سے بیزار
ہیں یہ کس بات کے آثار ذرا سوچو تو
اب تو تم اتنے ہو بے حس کہ تمھاری خاطر
سوچتے ہیں در و دیوار ذرا سوچو تو
اس طرح کیسے بسر ہو یارو
اب کہیں اپنا بھی گھر ہو یارو

یہ مسافت تو غلط ہی ٹھہری
پھر سے آغازِ سفر ہو یارو
ایک چہرے میں ہیں کتنے چہرے
تم بڑے شعبدہ گر ہو یارو
میرا اپنا تو عدم ہے نہ وجود
تم اگر ہو تو کدھر ہو یارو

احساس غیر سے احساس ذات تک پہنچنے کا عمل بھی حنیف اسعدی کے یہاں نظر آتا ہے۔ وہ دوسروں کو دیکھتے ہوئے خود پر بھی نظر کرتے ہیں اور اپنی ظاہری اور باطنی حالتوں کو جاننا چاہتے ہیں اُن کے رجائی خواب ہوں کہ شکستہ خواہشیں اُن کے جسم کی ناقدریاں ہوں یا اُن کی جان کی ناسپاسی ہو وہ اپنی انفعالی اور تنوطی حالتوں کو بھی دوسروں سے پوشیدہ نہیں رکھتے وہ اپنی نیندوں اور اپنے رت جگوں کو اظہار میں لاتے ہیں اور اپنے ظاہر و باطن کی پیکر تراشی کرنا اُن کی سچّی ضرورت بھی ہے اور اُن کا ہُنر بھی ہے۔ روز و شب کی گردشیں اور ان گردشوں کے درمیان سیّارگاں کے ہنگامے حنیف اسعدی کے وجود کو لکھتے رہتے ہیں۔ اضطراب ان کے اندر سفر میں رہتا ہے اور وہ اپنے تجربوں سے گزرتے رہتے ہیں

شام منڈیروں پر کیا اُتری
دُھوپ کا سایہ سر سے اُٹھا
دشت کی جانب چل پڑنے کو
ایک بگولا گھر سے اُٹھا
ایک سودا سا سر میں رہتا ہے
اس طرح کون گھر میں رہتا ہے
کس کی آواز سُنتا رہتا ہوں
کون دیوار و در میں رہتا ہے

جانے کس کس جگہ کا سناٹا
گھر سے اٹھتا ہے گھر میں رہتا ہے

اپنے ہی سے محوِ گفتگو ہوں
لب بستہ ہوں اور لہو لہو ہوں

بستی میں ہے میرے دم سے وحشت
صحرا کی صدائے کو بہ کو ہوں

کہتی ہے یہ مجھ سے عمرِ باقی
تو کچھ ہو میں حسرتِ نمو ہوں

ضد پہ شعلوں کے دل بھی تھا میں بھی
دل بجھا ہے تو بجھ گیا میں بھی

دشت میں کل جو تم نے دیکھا تھا
اُس بگولے کے ساتھ تھا میں بھی

اپنی پہچان کیا بتاؤں تمھیں
بھیڑ میں آ کے کھو گیا میں بھی

حنیف اسعدی کی یہ تنہائی ہجر اور ہجرت سے پیدا ہونے والی تنہائی سے مختلف ہے یہ تنہائی اجتماعی انسان کی محبتوں کی گمشدگی کا المیہ ہے یہ ایک ایسی مجبوری ہے جو تاریخ کے جبر نے ہمارے دلوں پر اور ہمارے گھروں پر لکھی ہے حنیف اسعدی اس بات کا احساس بھی رکھتے ہیں اور انھیں اس المیے کا شعور بھی ہے کہ اس تنہائی کی آندھی کو روکنا شاید ممکن نہیں رہا ہے کہ اڑتے ہوئے خشک پتوں کی طرح شجر سے ٹوٹ کر اپنی ذات کو بچانے کی خواہش اور اپنے آپ کو باقی رکھنے کا حوصلہ ہی بڑی بات ہے۔

یہ کس زمانۂ وحشت اثر میں زندہ ہوں
کہ اپنا ساتھ نہ دوں تو اکیلا رہ جاؤں

میری وحشت نے تراشے ہیں ہزاروں کوہ کن
جانے کس کس نام سے اک میرا افسانہ چلا
کوئی طوفان اُڑائے لیے پھرتا ہے مجھے
میری سانسیں ہیں کہ صحرا کی ہوا ہے مجھ میں
بند آنکھوں میں ہے گزری ہوئی راتوں کا خمار
سویا سویا سا کوئی جاگ رہا ہے مجھ میں
میں جو اپنے حال سے کٹ گیا تو کئی زمانوں میں بٹ گیا
کبھی کائنات بھی کم پڑی کبھی جسم و جاں میں سمٹ گیا
نئے دور سے تھا معاملہ تو ذرا سا اپنے سے ہٹ گیا
مگر اس گریز کا فائدہ کہ خود اپنی ذات میں گھٹ گیا

زندگی کی میزان میں صحرا کی ویران وسعتیں اور لہولہان وحشتیں دونوں ہی اپنی داخلی شباہتوں میں برابر ہیں کہ

حنیف اسدی کے خیال میں موجودہ انسان اپنی ذات میں گھٹ گیا ہے کہ اُس نے بڑے آدرشوں کا خیال چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی ذاتی خواہشوں میں پناہ لے لی ہے وہ طویل سفر کی صعوبتیں اور بڑے انتظار کی اذیتیں برداشت نہیں کر رہا ہے بلکہ شام سے صبح تک اور صبح سے شام تک بلا شک کے بے جان کھلونوں کو اور پنی سے لپٹی ہوئی غبار آلود ضرورتوں کو حاصل کرتا رہتا ہے اور آسودہ ہو جاتا ہے لیکن جو قومیں زمین سے آسمانوں تک سفر کر رہی ہیں جلتے ہوئے سورج کے نیچے اور سیاہ راتوں کے درمیان ماہ و ستارہ کی تسخیر میں کوشاں ہیں وہی بشری عظمت کو زندہ رکھنے والی قومیں ہیں۔ انسانی تاریخ کا تمام مادّی و روحانی ارتقاء اور انسانی تہذیب و تمدن کا تمام بیش بہا سرمایہ وہی لوگ ہیں جو ہر عہد میں

اپنی ذات کے حوالے سے اجتماعی انسانیت کو باقی رکھنے کا مشکل کام انجام دیتے ہیں۔ حنیف اسعدی اس عہدِ رائیگاں میں بھی انسانی عظمتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اس کا اظہار وہ اپنی کئی غزلوں میں کر چکے ہیں اس حوالے سے اُن کی یہ غزل دیکھی جا سکتی ہے۔

کسے خبر ہے کہ منزل مری کہاں ہوگی
یہ کہکشاں تو فقط گردِ کارواں ہوگی
وہ جستجو جو حدودِ گماں میں ہے اب تک
کبھی تو چاند ستاروں کی ہم عناں ہوگی
مجھے یقین ہے اک روز خاکِ پا میری
ہزار شعلہ جبینوں کی آستاں ہوگی
ہمارے قدموں کی پامال رہگزر یہ زمین
نجانے کتنی زمینوں کی آسماں ہوگی
جو سست گام مسافر ہیں میرے ساتھ نہ آئیں
یہ کم روی مری رفتار پر گراں ہوگی

حنیف اسعدی کے شعری مطالعے کے درمیان اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اُن کی غزل کے پس منظر سے عشق اور جمالیات کی وہ تصویریں غائب ہیں جو اُن کے ہم عمروں کے یہاں نمائشی طور پر آویزاں نظر آتی ہے یہ بات تجزیہ طلب ہے کہ حنیف اسعدی نے مہ رُخوں، زہرہ جبینوں سرو و صنوبر پیکروں سے اپنے تعلق کا اظہار کیا ہے کہ نہیں تو کیا حنیف اسعدی جسم و جان کی جمالیاتی جہت کے مسافر نہیں رہے، کیا انھوں نے اپنے اُڑتے ہوئے جذبوں کو بکھرتے ہوئے رنگوں کو اور سمٹتے ہوئے خوابوں کو کبھی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی اس حوالے سے کہیں کہیں کچھ ایسے شعر یا کچھ ایسے مصرعے اُن کی غزل میں بولتے ہوئے سُنائی ضرور دیتے ہیں جنھیں عشقیہ یا جمالیاتی تناظر میں رکھا جا سکے لیکن

زندگی کے دوسرے اہم تجربوں کی طرح یہ تجربہ اپنے تخلیقی اظہار تک کم ہی آیا ہے یہ چند شعر تلاش کے بعد ملے ہیں جنھیں مشکل سے عشقیہ شعر کہا جا سکتا ہے۔

میری پہچان محبت ہے حنیف
مجھ سے کیا نام و نسب پوچھتے ہو
میں نے جھیلا ہے گلے مل کے بچھڑنے کا عذاب
میرے معبود کسی کو یہ سزا مت دینا
ہر رات یہ سوچا کر نہاں خانۂ جاں سے
زنجیر نہ بولے تو دبے پاؤں گزر جاؤں
زندانِ محبت ہے عجب طرح کا زنداں
دیواریں بہت ہیں کوئی دروازہ نہیں ہے

لیکن جس کے موسم بدلتے ہوئے نظر آنے لگے اور کہر کٹ گئی اور غبار کے عقب سے کچھ نئے منظروں نے اپنے چہرے چمکائے اور دھوپ کے آنگن میں اتر آئے۔

نہ وہ کیفِ شب نہ وہ ماہِ شب نہ وہ کاروانِ غزالِ شب
جہاں ذکر ہجر و وصال تھا وہ ورق ہی کوئی الٹ گیا
اب کسی کا بھی انتظار نہیں
اب طبیعت سنبھل گئی شاید
شام سے نیند کے حصار میں ہوں
ہجر کی رات ڈھل گئی شاید
روح اپنے مدار سے ہٹ کر
تن کی جانب نکل گئی شاید

اجتماعی عہد کی روح اپنے دائرے سے کٹ کر مادّیت کی سمت ضرور نکل گئی ہے لیکن حنیف اسعدی مرد اور عورت کے درمیانی معاملات سے نکل کر اجتماعی

انسان کے دُکھوں کے درمیان آ بیٹھے ہیں اور اپنے شوقِ آذری میں ایک تصور سے ہزار تصویریں تخلیق کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ وہ باطل کے حق میں ایک لفظ بھی کہنا نہیں چاہتے کہ انھیں پورے قد سے اپنے بدن میں ڈھے جانے کا خوف ہے اُن کے لیے وہ لمحہ تخلیقی اظہار کا بہترین لمحہ ہوتا ہے جب وہ چراغ کو پرچھائیوں سے جنگ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ

تخلیق کی رو دوڑ گئی ذہن رسا میں
جب آگ کے شعلوں میں سمندر نظر آئے

کبھی سناٹے بھی بولتے ہیں اور بچھڑے ہوئے موسم اور گزرے ہوئے خواب خور اپنی بازیافت چاہنے لگتے ہیں اس اندھیرے اور اُجالے کی ملاوٹوں کے درمیان تخلیق کا چہرہ ترا شا جاتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے یہ تخلیقی چہرہ باہر کے اندھیرے اور اُجالے کو اپنے اندر جذب کر کے خود آئینہ بن جاتا ہے اسی طرح کے ایک تجربے کو حنیف اسعدی نے اپنی ایک غزل میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔

کان میں اک آواز بھی آئی دُھندلی سی تصویر کے ساتھ
نیند سے بوجھل آنکھیں جاگیں سپنے کی تعبیر کے ساتھ
سُونی سیج پہ لیٹے لیٹے کوئی کہاں تک دیکھے جائے
دُکھیا من کی خالی گگری پنگھٹ کی تصویر کے ساتھ
رُت بدلی تو ٹوٹ کے برسی وحشت بھی سرمستی بھی
دیوانے نے باندھ لیے ہیں گھنگرو بھی زنجیر کے ساتھ
کہنے کو تو کہہ لیتے ہیں ہم بھی جی کا حال حنیف
لیکن وہ دُکھ درد کا لہجہ ختم ہوا جو تیر کے ساتھ

حنیف اسعدی کی اس دور کی غزل میں ایک اور اہم بات یہ بھی سامنے آئی ہے کہ اُن کی نعت میں جو خدا صرف محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ ہے بلکہ جس خدا کی پہچان محمدؐ کے بغیر مشکل نظر آتی تھی اُس خدا نے حنیف اسعدی کی موجودہ غزل میں اپنی ایک

بنیاد بنالی ہے اور اب محمدؐ کا رب حنیف اسعدی کا رب بھی بن گیا ہے۔

بقدرِ ظرف مری روح کی حدود میں ہے
مرے وجود کا خالق مرے وجود میں ہے
مرے بدن میں مری روح ہے کہ اُن کا جمال
مرا لہو ہے کہ شعلے کا عکس دود میں ہے
یہ جان کر کے ہو رگ جاں سے قریب تر
گم ہو کے رہ گیا ہوں خود اپنی ہی ذات میں
وہ پاس ہوں تو ادر ہے وہ دور ہوں تو اور
سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں کائنات میں
ہیں تیرے تصرف میں تو سمتیں بھی حدیں بھی
مجھ پر ہو زمیں تنگ تو میں اور کدھر جاؤں
آواز تو دے کوئی مقاماتِ عدم سے
اپنے سے گزرتا ہوا بے قیدِ سفر جاؤں

وسعتِ طلب دراز کرنے والوں کو کفِ کائنات سے حرف و ہم و گمان کے کچھ اور نہیں مل سکا ہے مگر مقاماتِ ازل کی آواز پر بے قیدِ سفر جانے کی تیاری عبدیت کی وہ نہج ہے جہاں سے آغاز ہونے والا نیا سفر روشنیوں کے درمیان سلگے جانے والا سفر ہے اپنے اپنے اسلوب میں جو لوگ اس سفر پر جاتے ہیں وہ زندگی کے لیے بھی اور موت کے لیے بھی اُس ناقابلِ فراموش تصور کی طرح رہتے ہیں جو پتھر کی آنکھوں کو ستارہ بنانے کا ہنر جانتا ہے۔

حنیف اسعدی نے گزشتہ اٹھارا برسوں میں جو نعت اور جو غزل لکھی ہے ہم اُس کے مطالعے سے گزر آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے معنوی سطح پر جس فکر کو جس خیال کو اور جس تجربے کو پیش کیا ہے وہ بہت سے پڑھنے والوں کے لیے حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے کہ موجودہ زمانے اور موجودہ انسان کے ظاہری

اور باطنی حقائق کا جیسا شعور اور جیسا تخلیقی اظہار ان کے یہاں نظر آتا ہے ویسا ان کے کسی ہم عمر کے یہاں نہیں ہے۔

تضمین نگاری ہماری شعری روایت میں شامل ضرور ہے مگر یہ روایت ختم سی ہو گئی ہے اسے حنیف اسعدی نے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے کئی شاعروں کی غزلوں کو اپنی تضمین سے گزارا ہے اور ہمارے خصوصی مطالعے کے لیے ایک بند دروازے کو دوبارہ کھول دیا ہے۔ اس حوالے سے چند مختصر اقتباسات دیکھیے۔

مرزا غالب

شرر کیا شعلہ کیا برق و ہوا کیا
حیاتِ یک نفس کا آسرا کیا
بہ حسرت سوئے دنیا دیکھنا کیا
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

سراج الدین ظفر

عجب فضا تھی کہ حیراں تھا دیدۂ بیدار
گزر رہا تھا تصور میان ہوش و خمار
طلسم عشوہ گری تھا کہ مے بچوں کی قطار
ہجوم زہرہ وشاں تھا کہ عالم اسرار
ہم آ گئے ہیں کہاں سیر رنگ و بو کرتے

سحر انصاری

یہ بے کنار سمندر یہ بے کراں ساحل
یہ سب ہیں ایک حقیقت کہ پردہ حائل
نہیں ہے تو بھی اگر میری زیست کا حاصل
نہیں ہے کوئی بھی منزل اگر مری منزل
تو پھر یہ پاؤں تلے راستے کہاں کے ہیں

اسعد شاہجہاں پوری کو بھی تضمین نگاری کا ہنر خوب آتا تھا چنانچہ ان کے شعری مجموعے "وجدان سلیم" میں بعض بڑی تضمینیں موجود ہیں حنیف اسعدی نے اس فن میں اسعد صاحب سے خصوصی استفادہ کیا ہے اور ان سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے تضمین کا فن ترجمے سے مختلف بھی ہوتا ہے اور دشوار بھی ہوتا ہے کہ ترجمے میں تو اصل تخلیقات کی معنوی سطح کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے ساری لفظیات نئی ہوتی ہے اور اکثر معنوں میں بھی اپنی خواہش کے مطابق تبدیلی کر لی جاتی ہے لیکن حنیف اسعدی کی ان تضمینوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان میں باطنی و خارجی فنی و تخلیقی حکمتوں سے کیسا کام لیا، کسی دوسرے شاعر کے شعر کے دو مصرعوں کو اپنے تین مصرعوں سے ایسی مہارت کے ساتھ پیوست کیا ہے کہ اس شعر کا داخلی اور ظاہری وجود ایک ہو گیا ہے نہ صرف دوسرے شاعر کے اپنے شعر میں معنوی وسعت کو بڑھایا ہے بلکہ اس ایک شعر کی لفظی مناسبات اور شاعر کی اپنی شعریات کو تلاش کر کے صرف کیا گیا ہے کہ دوسرے شاعر کے دو مصرعے حنیف اسعدی کے تین مصرعوں سے اس طرح ہم آہنگ اور ہم پیکر ہو گئے ہیں کہ اگر دوسرے شاعروں کے نام نہ لکھے جائیں تو پورے استنزا کو پڑھ کر کوئی اس فرق کو نہیں پا سکتا ان تضمینوں سے حنیف اسعدی کی فنی تکنیکی اور ساختیاتی ہنر کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حنیف اسعدی زبان و بیان پر اور شعری تلازمات کو نہایت خوبصورتیوں کے ساتھ لکھنے پر کیسی بے مثال مہارت رکھتے ہیں، حنیف اسعدی کی تضمین نگاری اس لیے بھی اہم قرار پاتی ہے کہ ان میں مختلف مزاجوں کے شاعر موجود ہیں اور ہر مزاج کا ایک اپنا رنگ اپنا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ حنیف اسعدی نے اپنے ذاتی رنگ و آہنگ میں دوسرے شاعروں کو نہیں سمیٹا بلکہ خود دوسرے شاعروں کے مختلف مزاجوں کے ساتھ ساتھ اس طرح چلے ہیں کہ اجنبیت یا نامانوسیت کا گمان تک نہیں گزرتا اور پڑھنے والا پورے استنزا کی وحدت سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔

حنیف اسعدی کے فنی و تیکنیکی تجربے کے حوالے سے اُن کی تین تین مصرعوں کی مختصر نظموں کا ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تین مصرعوں کا مثلث ثلاثی یا ٹپّا اور ماہیا پہلے سے موجود ہے ثلاثی اور مثلث کو تو اردو میں خاصی مقبولیت بھی ملی ہے لیکن حنیف اسعدی نے اس صنف میں تبدیلی کی ہے کہ انھوں نے اپنے تینوں مصرعوں کو برابر رکھا ہے ہم قافیہ رکھا ہے اور ان تمام مختصر نظموں کو ایک ہی بحر میں لکھنے کی کوشش کی ہے اس اعتبار سے یہ ثلاثی مثلث یا ٹپّے سے مختلف چیز بن گئی ہے اور ہم اس کا ذکر سہ مصرعیوں کے نام سے کر رہے ہیں۔ حنیف اسعدی کی سہ مصرعیاں ایک ایسا تجربہ ہے جو اپنی روایت سے جُڑ کر ایک تازہ تر ہیئت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ ان سہ مصرعیوں کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت شخصی خاکہ نگاری کو اظہار میں لاتی ہے اور دوسری صورت میں فطرت کے موسم اور دیہی زندگی کی سادہ و بے لوث خوبصورتی اپنا اظہار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

نثر میں سوانح عمری اور خاکہ نگاری کی روایت ہمارے یہاں ایک مضبوط روایت کے طور پر موجود ہے اور کئی اہم نام اور کئی بڑی کتابیں ہمارے مطالعے کے لیے مل جاتی ہیں لیکن شاعری میں قصیدے کی تشبیب اور کہیں کہیں سراپا نگاری کے علاوہ اور کوئی روایت نہیں ہے البتہ تاریخ نگاری کو ہمارے یہاں اہمیت ملی ہے جس میں کسی شخصیت کے مرنے کے بعد چند مصرعوں کے ایک قطعے میں مرنے والے کی صفات کو اور اُس کی تاریخِ وفات کو حروفِ تہجی کے حوالے سے لکھا جاتا رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی رئیس امروہوی محشر بدایونی اور شان الحق حقی نے بھی خاصی تعداد میں تاریخی قطعات لکھے ہیں لیکن حنیف اسعدی کی یہ سہ مصرعیاں ان تاریخی قطعات سے بالکل مختلف ہیں کہ ان میں موجود اور غیر موجود تمام شخصیتوں کو تین مصرعوں میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ مذکورہ شخصیت اُس کا فن اور اُس کی

اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ ان سہ مصرعیوں سے پورا استفادہ اور پورا لطف وہی پڑھنے والے حاصل کر سکتے ہیں جو پہلے سے مذکورہ شخصیات کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوں۔ حنیف اسعدی کی اس شخصی خاکہ نگاری میں صوفیا قدیم و جدید شعرا، ادیب اور مصور وغیرہ شریک ہیں۔ چند کو اپنے مطالعے سے گزارتے ہیں پہلے صوفیوں کے بارے میں لکھی ہوئی سہ مصرعیاں دیکھیے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی

راگ انوکھے تان عمومی　　گونج اٹھی ہے بھٹ کی بھومی
سندھو دیش کے پیر ردی

سچل سرمست

من کے رنگ میں ڈوبی کایا　　کایا نے یہ بھید بتایا
سچل دھوپ ہے سچل سایا

امیر خسرو

شاعر گیانی مست ملنگ　　سُر میں ڈوبا اک اک رنگ
تن پر گدڑی من مردنگ

وارث شاہ

ایک حکایت پُرتاثیر　　اپنے تخیل کی تصویر
وارث رانجھا وارث ہیر

ان سہ مصرعیوں میں لفظوں کی جامعیت اور بیان کا فن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ تین مصرعوں میں ایک یا ایک سے زیادہ لفظ ایسے ضرور ہیں جو شخصیت کی بنیادی حیثیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے کچھ اور اہم ادبی شخصیات کے خاکے دیکھیے۔

نظیر اکبر آبادی

تن پر انگرکھا سر پہ عمامہ　　پاؤں میں چکر ہاتھ میں خامہ
سارا سخن بنجارہ نامہ

خوشحال خان خٹک

زورِ شجاعت شور تگاپو حرف بہ حرف لہو کی خوشبو
مرغے اڑتے باز کے بازو

سرسید احمد خان

علم و عمل تصنیف و کلام عزم و عزیمت سعیٔ مرام
ایک نئی تہذیب کے نام

علامہ اقبال

سرتاپا افکار گرامی نظم نصیحت نثر پیامی
ملّت کے اقبال کے حامی

ان کے ساتھ ہی بیسویں صدی کے چند اور اہم لوگوں کے خاکے بھی دیکھیے.

مجنوں گورکھپوری

شاعر تھنکر نثر نگار آنکھیں روشن دل بے زار
اپنے عہد کے شوپن ہار

اختر حسین رائے پوری

گیان کی پونجی گن کی مایا سوچ بچار کا اونچا پایا
بوڑھا پیڑ گھنیرا سایا

حسن عسکری

جدّتِ فن کی سعیٔ دلیل علم، خبر، تعبیر، دلیل
نقد و نظر کے بطلِ جلیل

عزیز حامد مدنی

پختہ فکر جدید افکار شعر و ادب کے سب شہکار
"نخلِ گماں" کے برگ و بار

سلیم احمد

روح مجسّم د جد و حال ذہن مرا سر فکر و خیال
اپنی ذات میں ایک سوال

شیخ ایاز

پکّی دُھن بھرپور کلا من کا سُر پھر تن میں ڈھلا
سندھ میں پھر ایک دیپ جلا

وقار صدیقی

خستہ حال و خانہ بدوش اہلِ دل کے حلقہ بگوش
بے دستاروں کے سرپوش

حنیف اسعدی کی سہ مصرعیوں کا انتخاب ایک مشکل کام ہے کہ سب ہی نمائندہ اور مکمل سہ مصرعیاں ہیں اور طوالت کا خوف بھی ہے۔ بیسویں صدی کے چند بہت اہم مصوّروں کے بارے میں بھی حنیف اسعدی کا اظہار دیکھ لیجیے۔

عبدالرحمان چغتائی

نازک خط مدھماتے رنگ سب سے الگ تخلیق کا ڈھنگ
نقش بہ موتمیر بہ سنگ

شاکر علی

الجھی الجھی سی تحریر ٹیڑھا ترکش آڑے تیر
دھیان پکاسو کی تصویر

صادقین

لوح و قلم الوان و بساط رنگِ طرب اور رنگِ نشاط
روح مصوّر دل خطاط

گل جی

کتنی عجب ہے یہ ایجاد لکڑی پتھر پر فولاد
فائن آرٹ کا خام مواد

اقبال مہدی

اک اک خط تصویر مثال ذہن سے ہاتھ تلک کا حال
ساری شکلیں بے اشکال

فنون لطیفہ کے حوالے سے ان سہ مصرعیوں کے کئی شعبے پیش کرنے سے رہ گئے ہیں جن میں بعض اہم موسیقاروں اور گلوکاروں کے علاوہ مختلف نظریات اور خیالات کے لوگ بھی شامل ہیں۔ بعض تنقیدی و تجزیاتی سہ مصرعیوں کا مطالعہ افادیت بھی رکھتا ہے اور دلچسپی بھی پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہم بغیر انتخاب کے چند ایک یہاں لکھ رہے ہیں۔

مشفق خواجہ

نثر محقق کا شہکار شعر غرابت کا اظہار
کالم اپنے دل کا غبار

پروین شاکر

بالا بالا فکر کا زینہ شعر انگوٹھی لفظ نگینہ
شہرت منصب کا آئینہ

افتخار عارف

اس سے رشتہ اس سے ڈوری مرتے تک بھرلی فن کی بوری
چپکے چپکے چوری چوری

حبیب جالب

ان کے گلے میں سُر کا ڈورا شعر مگر بارود کا بورا
آدھی گندھک آدھا شورا

رحمان کیانی

سرتاپا اخلاص کا پیکر میف کا کام قلم سے لے کر
دُھن ڈالا اشعار کا شکر

حنیف اسعدی کی ان سہ مصرعیوں سے ہماری شعری فنّی روایت میں ایک اضافہ ہوا ہے اور پڑھنے والوں کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ مختصر ترین لفظوں میں بھی شخصیتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ فنّی و تیکنیکی حوالے سے بھی یہ سہ مصرعیاں اپنی انفرادیت رکھتی ہیں اور مطالعے کا ایک خصوصی اور ایک نیا لمحہ پیش کرتی ہیں۔ اُردو نظمیہ شاعری میں ان شخصی سہ مصرعیوں کی اپنی ایک الگ اہمیت بنی ہے جنھوں نے ہماری ایک شعری ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس حوالے سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ کتابی شکل میں شائع ہوں گی تو تاریخی قطعات سے کہیں زیادہ پذیرائی کی مستحق قرار دی جائیں گی۔

حنیف اسعدی کے اس فن کا دوسرا رُخ جمالیاتی وہ سہ مصرعیاں ہیں جو فطرت کے موسموں، معاشرتی جبر و اختیار کے مسئلوں تخلیقی صورتوں اور جسم و جان کے درمیان حُسن و عشق کی نقش گری کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ پہلے فن کے حوالے سے چند مثالیں دیکھیے۔

کیا لکھیں

سچّے بول کا جگ ہے دشمن　　جھوٹا بول قلم کی اترن
جھوٹ بھی الجھن سچ بھی الجھن

روپ بہروپ

من کی جوتی فن کا روپ　　اگنی سورج کو ندا دھوپ
ایک دیئے کے سب بہروپ

دیپک راگ

سُر کی ٹھنڈک سُر ہی آگ　　دھیرج دے تو جوگ بہاگ
جل اُٹھے تو دیپک راگ

حنیف اسعدی نے سماجی اور معاشرتی جبر و اختیار کو غزل میں بھی لکھا ہے نظم میں بھی اور ان سہ مصرعیوں میں بھی لکھا ہے کہ انسانوں کے درمیان غیر مساوی

جابرانہ اور ظالمانہ سلوک ہمیشہ ہی ناقابلِ برداشت رہا ہے۔ حنیف اسعدی نے بھی اس کو دیانت اور قوت کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

مہاجن

بول گیانی کے انمول　　بٹ ماروں کی جھوٹی تول
ساکھ بکی ہے راکھ کے مول

آڑھت

آج بھی سارا ساہوکارا　　جھوٹ ہی جھوٹ کما کر اٹھا
آج کسی نے سچ نئیں تولا

چرواہا

کنوّیاں پیاس ہیں اندھی جھانکے　　بھوک لگے تو مٹی پھانکے
پیٹ بھرے چوپائے ہانکے

چھٹکارا

بھوکے ہو تو مٹی چاٹو　　ننگے ہو تو میری مانو
مٹی اوڑھو اور سو جاؤ

بے بس

جھوجھ مریں دھرتی کے بیٹے　　سارا دھن دھنوان سمیٹے
ندیا دیکھے لیٹے لیٹے

محنت کش اور سرمایہ دار کی جس کشمکش کو اور جس ناانصافی کو یہاں پیش کیا گیا ہے وہ ہماری شاعری کے لیے نئی نہ سہی لیکن ظلم اور مظلومیت ہر عہد اور ہر نسل کی زندہ آوازیں ہیں جو ہمیشہ نئی ضرورت کی طرح ہمارے درمیان موجود رہتی ہیں۔ حنیف اسعدی بھی اس صداقت کو معاشرتی صداقت سمجھتے ہیں اور ہم تک اپنے تخلیقی اظہار کے وسیلے سے اس کوڑھی المیے کو پہنچاتے رہتے ہیں۔

حنیف اسعدی کی ان سہ مصرعیوں میں فطرت کو بڑی اہمیتوں کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ منظر نگاری اور موسموں کا بیان ہماری شاعری میں بھی اپنی ایک مضبوط روایت رکھتا ہے۔ حنیف اسعدی نے اس فطرت نگاری میں دیہی زندگی اور وہاں کی سیدھی سادی خوبصورت اور معصوم روشنیاں بکھیری ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

بھید

سورج چاند کی جوت جگائے ساگر ندیا کو پی جائے
کون بڑوں کو بھید کو پائے

جیون رس

جیون ہے گیہوں کی بالی کچی ہو تو دودھ کی پیالی
پک جائے تو سوکھی ڈالی

آلاؤ

چڑھتا سورج لال چنار سرخابوں کی اڑتی ڈار
گہری ندیا کے اُس پار

کایا کلپ

رات کو ایسی کیا تھی جلدی اپنے دیئوں پر کالک مل دی
دن کا دیپ جلایا چل دی

حنیف اسعدی کی ان سہ مصرعیوں پر غور کیا جائے تو ان کے پیچھے ایک جہان دیگر موجود ہے اس آئینے کے اُس طرف زندگی کی وہ اشکال دکھائی دیتی ہیں جو انسان کے ہاتھوں بنتی بگڑتی ہیں۔ موسموں کے حوالے سے کہی گئی ان سہ مصرعیوں کے استعاراتی معنی بھی موجود ہیں۔ پڑھنے والوں میں جو لوگ اُن پر توجہ دیں گے انھیں یہ سارے موسم اور یہ ساری فطرت نگاری انسانوں کے فکر و عمل سے وابستہ اور مربوط نظر آنے لگے گی۔

حنیف اسعدی کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اُن کے یہاں عشق اور حُسن کے حوالے کم آئے ہیں لیکن ان سہ مصرعیوں میں ایسی مثالوں کی خاص تعداد موجود ہے، ہم یہاں چند کا مطالعہ کرتے ہیں۔

آنکھیں

نیلے پانی کی یہ جھیلیں جن میں جلتی ہیں قندیلیں
دیکھ رہی ہیں اڑتی چیلیں

من کا بھید

پوچھ رہا ہے سر گاؤں تو ہی بتا میں کیا کہلاؤں
تیری دھوپ کہ تیری چھاؤں

آس نراس

کورا پیڈ گجرا باسی خالی گگری لے کر داسی
پنگھٹ پنگھٹ گھومی پیاسی

بھینٹ

یہ بھیگی آنکھیں دیکھے بجھتے دیپ کے اوپر نیچے
پیلے پیلے ڈھیر پروں کے

نٹ کھٹ

صدیوں ماری یہ آشائیں پیچھ پڑو تو چپ ہو جائیں
چپ بیٹھو تو شور مچائیں

لو بھی

کھیل کے آگے کھیلتے بچے اک تتلی کا پیچھا کرتے
کھیل ہی کھیل میں دور نکل گئے

یہاں تک حنیف اسعدی کے "جیون روپ" کی ان سہ مصرعیوں کا ایک انتخاب اور ان کے بارے میں امکانی گفتگو ہو چکی ہے لیکن کئی اہم باتیں رہ بھی گئی

ہیں. مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ

"حنیف اسعدی نے "جیون روپ" میں ایک نہایت اہم کام بروقت انجام دیا ہے۔ انھوں نے ہمیں یاد دلایا ہے کہ ہم کس قدر کھوٹے ہو چلے ہیں۔ کیٹ اور کردھ کی اس بستی میں آتما کی آواز کہاں اور کیسے سنائی دے سکتی ہے۔ اس کو سننے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ہم گاؤں کی طرف مراجعت کریں۔ بس اتنا کرنا ہوگا کہ خانۂ دل میں ایک حصّہ آنگن کے لیے بھی چھوڑ دینا ہوگا جہاں سے راتوں میں آسمان دکھائی دے سکے۔ حنیف اسعدی نے جیون روپ کی وساطت سے اُس بڑی شاعری سے ہمارا رشتہ جوڑ دیا ہے جو تلسی اور کبیر سے ہم تک پہنچی تھی یہ کچّے رومان یا اُترے ہوئے جذبات کی شاعری نہیں ہے۔" جیون روپ" کی شاعری دھیان گیان کی شاعری ہے۔

مجتبیٰ صاحب نے اس شاعری کا رشتہ تلسی اور کبیر کی شاعری سے جوڑا ہے جو ایک بہت اہم بات ہے اور یہ بات ہمیں احساس دلاتی ہے کہ سچائی سادگی اور بے غرضی فن اور زندگی دونوں کے لیے بنیادی ضرورتوں کی طرح ہیں کہ اُن کے بغیر کوئی لکھنے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔

ہم نے یہاں تک اپنی گفتگو میں حنیف اسعدی کی شخصیت اور اُن کی مختلف تخلیقی جہتوں کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اُنھیں سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے جو بنیادی عناصر ہمارے سامنے سے گزرے اُن میں سب سے اہم بات یہی ہے کہ حنیف اسعدی کوئی پچاس برسوں سے شاعری کر رہے ہیں لیکن اُن کے گزشتہ اٹھارا برس اس لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اسی عرصے میں نعت گوئی کا آغاز کیا اور اُسے اپنی محبتوں تک اور لوگوں کے درمیان مقبولیت تک پہنچایا۔ اُس زمانے میں انھوں نے وہ غزل بھی لکھی جس کی معنوی سطح انفرادی و اجتماعی انسان کے داخلی اور خارجی صورتوں سے آشنائی رکھتی ہے۔ بعض اچھی نظمیں بھی تخلیق کیں اور سر مصریوں

کے حوالے سے ہیئت کا ایک ایسا تجربہ کیا جو نظمیہ شاعری کی تاریخ میں اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے والا ہے۔ اسی حوالے سے اُن کی شخصی خاکہ نگاری بھی ایک منفرد طرزِ اظہار ٹھہرتی ہے جس کے زندہ امکان کھلے ہوئے ہیں۔ وہ داغ اسکول کے شاعر ہیں لیکن اُن کے بیان و زبان میں ضلع جگت یا محاورہ بازی کا وہ روایتی چٹخارا نہیں ہے جسے سنجیدہ شاعری کے لیے کمتر سمجھا جاتا ہے۔

حنیف اسعدی کو اپنے اسالیب پر مہارت حاصل ہے۔ تلازمات کا تلاش کرنا اور مختصر لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معنی آفرینی کر جانا اُن کا ہنر ہے۔ ہمیں اُن کی غزل نظم اور اُن کی سہ مصرعیوں میں تین مختلف اسالیب نظر آئے ہیں اور زبان کی تین مختلف شکلیں ہم نے دیکھی ہیں شاید کوئی سوچے کہ ایک ہی لکھنے والے کے یہاں زبان کی یہ صورت تخلیقی وحدت کی توانائی کو کم کرتی ہے تو حنیف اسعدی کے یہاں ایسا نہیں ہے اُن کے یہاں نظم کم لکھی گئی ہے اور اُن کی نظموں میں فارسی تراکیب اور فارسی لفظیات بھی سب سے زیادہ لائی گئی ہیں مگر یہ نظمیں ایک خوشگوار اور دلچسپ اثر پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہیں۔ حنیف اسعدی کی غزل کی معنویت پر گفتگو ہو چکی ہے۔ انھوں نے اپنی غزل کے لیے کوئی شعوری اسلوب بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی یہاں تک کہ جو بعض لفظ ہر شاعر کے یہاں مکرر آتے ہیں وہ لفظ بھی ان کے یہاں نہیں ہیں۔ اُن کی غزلیں بیشتر سادہ اور آسان لفظوں میں تخلیق ہوئی ہیں لیکن اُن لفظوں میں شعری رمزیت اور استعاراتی مصنوعیت اور جمالیاتی تحرک پورے طور پر موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی غزل ہمیں برابر متاثر کرتی ہے۔ حنیف اسعدی کی غزل کی معنوی سطح پر اجتماعی انسان بھی ہے معاشرہ بھی ہے اور خود اُن کی ذات بھی موجود ہے اور وہ غزل ہے جو ہمارے نئے کہنے والوں سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھنے میں کامیاب ہے۔ جہاں تک سہ مصرعیوں کا تعلق ہے تو ان میں بھی دو اسالیب رکھے گئے ہیں۔ شخصی سہ مصرعیاں نظم کے اسلوب کے قریب ہیں مگر غزل کی جامعیت کی طرح اپنے اندر زبان و بیان کی اور اظہار

کی کاملیت رکھتی ہیں لیکن جمالیاتی سہ مصرعیوں میں حنیف اسعدی نے اپنی زبان کو بالکل بدل دیا ہے کہ "جیون روپ" کی سہ مصرعیاں بیشتر ہندی لفظوں میں تخلیق کی گئی ہیں۔ دیہاتی فضا اور دیہی زندگی کے گرد و پیش اور وہاں کے موسم اپنے لفظوں کی روح سے مربوط ہیں اور یہ اسلوب یا یہ زبان ہمارے لیے نامانوس یا اجنبی نہیں ہے بلکہ ہمارے ایک ایسے اہم سرمائے کی بازیافت ہے جسے ہم راستوں میں کہیں چھوڑ آئے ہیں۔ حنیف اسعدی کی مجموعی شاعری سچائی، خیر، انصاف اپنے تہذیبی ورثوں کی پاسداری اور انسان کو بہتر صورت میں دیکھنے کا احساس پیدا کرتی ہے دوسروں سے حسد اور نفرت کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں کی تلاش کا ادراک اور اعتبار سکھاتی ہے یہ ایک ایسے ذاتی تجربے کی شاعری ہے جو کالے اور سفید رنگوں میں گندھی ہوئی زمین کی اس مٹی سے پیوست ہے جس مٹی کو سرمئی روشنی بن کر آسمانوں تک اڑنے کا ہنر آتا ہے۔

لوک ورثے

شفیع عقیل یا شین عین کو کئی چالیس سال سے ادبی و صحافتی زندگی بسر کرتے ہوئے ہیں شخصی محنتوں اور ریاضتوں اور ذاتی تحقیقی صلاحیتوں کے حوالے سے نہ صرف اردو اور پنجابی ادب کے پڑھنے والے ان کو جانتے ہیں بلکہ دُنیا کی کئی مختلف زبانوں میں ان کی تحریروں کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ وہ طبقاتی کشمکش کو اور سماجی ناانصافیوں کو خوب جانتے ہیں۔ اُنہوں نے جس طرح اپنے ذاتی تجربوں سے انسانی نفسیات کو اور انسانی دُکھ سُکھ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ ان کی تحریروں کے حرف حرف سے روشن ہے وہ زندگی کے براہِ راست پڑھنے والے اور عوامی طرزِ خیال کے لکھنے والے ہیں لیکن شہر کے لوگوں کو ان کے رویّے میں اور اُن کی ملاقاتی گفتگو میں ایک شدید کھُردرے پن کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اُنہوں نے بیشتر ملکوں کو اور وہاں کی عمارتیات کو دیکھا ہے۔ وہ ایک ایسے مسافر ہیں جو عالمی لوک ورثے کی تلاش میں نکلے ہیں اور دُنیا کی مختلف قوموں اور مختلف تہذیبوں میں انسانی وحدت کو دیکھ چکے ہیں۔ شفیع عقیل ایک ایسے سیاح ہیں جن کی آنکھیں روشن ہیں جن کے ہاتھ زندہ ہیں اور جن کے پاؤں بے تھکن ہیں وہ سنہ ۱۹۵۰ء سے

ادارۂ روزنامہ جنگ سے وابستہ ہیں۔

ماہنامہ "بھائی جان" کو وہ بارہ برس تک شائع کرتے رہے۔ اس پرچے میں برصغیر کے تمام اہم لکھنے والوں نے لکھا ہے بلکہ بہت سے نئے لکھنے والوں نے "بھائی جان" ہی سے اپنی ابتدا کی ہے۔ وہ ہفت روزہ "چٹان" کے نمائندہ بھی رہے۔ روزنامہ "احسان" سے بھی منسلک تھے اور انہوں نے بچوں پر خاصا کام کیا ہے۔ بھائی جان کی مدیری کے بعد انہوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ "جنگیوں کا دیس" اور "بچپن کی شرارتیں" ان کی مشہور اور خوبصورت کتابیں ہیں۔ وہ ہفت روزہ "ساحل" اور مجید لاہوری کے "نمکدان" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں بلکہ "نمکدان" کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے... کہ شفیع عقیل کلرکی سے ایڈیٹری تک تمام کام خود ہی کیا کرتے تھے اس کے علاوہ طنز و مزاح کے اسلوب میں اپنے افسانوی رجحان کو "ڈھل گئی رات" "تیغ ستم" "دھوکے" اور "ایک آنسو ایک تبسم" میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پنجابی قدیم شاعری اور صوفی شاعروں کی تحقیق اور ان کے ترجمے کا کام بھی ایک اہم کام ہے۔ ادبی تنقید میں بے لوث کہانیوں کے حوالے سے ان کی کئی تحریریں ہمارے سامنے ہیں۔ سفرنگاری میں بھی انہیں اہمیت حاصل ہے پھر سب سے زیادہ یہ ہے کہ انہوں نے عالمی لوک ورثوں کی تلاش اور ان کے ترجموں کا جو کام کیا ہے وہ نہ صرف ہندوپاک میں انہیں اہمیت دلانے والا ہے بلکہ اس کام نے دنیا کے لوک ادب میں ان کے نام کو روشن کیا ہے۔ انہوں نے پنجابی نظمیں بھی لکھی ہیں اور اردو میں بھی شاعری کی ہے۔ اس طرح اب تک ان کی بیس مطبوعہ کتابیں ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس میں ان کی پنجابی نظمیں، سفرنامے مصورانہ خطاطی پر تعارفی اور تنقیدی مضامین شریک ہیں۔ شفیع عقیل نے اب تک جن ملکوں کی سیاحی کی ہے ان میں جاپان، تھائی لینڈ، متحدہ عرب امارات، شارجہ، دوبئی، ایران، شام، ترکی، برطانیہ، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، پولینڈ، آسٹریلیا، بیلجیم، ہالینڈ، فرانس، کینیڈا اور امریکہ کے نام شامل ہیں۔

شفیع عقیل کی تحریریں ان کے موضوعات، ان کے سفر اور ان کے فنی و تخلیقی تجربے

— ہمارے سامنے ہیں، اُنہوں نے جس طرح مختلف اصناف میں خود کو ظاہر کیا ہے، اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ خاکہ نگاری سے لے کر لوک کہانیوں تک اور پھر مصوّرانہ خطاطی کے تنقیدی مضامین سے پنجابی شاعری تک اُن کے اندر ایک مضطرب وجود سفر میں نظر آتا ہے۔ اُنہوں نے مجید لاہوری کے ساتھ کوئی آٹھ برس گزارے اور اُنہیں جو بخشت مجید لاہوری سے رہی تھی اس کا اظہار اُنہوں نے اپنی دو کتابوں "مجید لاہوری" اور "مجید لاہوری کی حرف و حکایت" میں کر دیا ہے۔ شفیع عقیل نے ان دو کتابوں میں نہ صرف مجید لاہوری کی شخصیت کو لکھنے کی کوشش کی ہے بلکہ اُن کی تحریروں پر اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ "انفلوائنزا کی نذر" کو اُنہوں نے مجید لاہوری کی آخری نثری لائنیں قرار دیا ہے وہ لائنیں یہ ہیں۔

"میں بھی انفلوائنزا کی لپیٹ میں آگیا ہوں، اس لیے نہیں چاہتا کہ اس حالت میں کالم لکھ کر اپنے جراثیم آپ تک پہنچاؤں۔"

موت سے پہلے شفیع عقیل اور مجید لاہوری کے درمیان کچھ کشیدگی سی ہو گئی تھی۔ اُنہوں نے زندگی کے آخری لمحوں میں شفیع عقیل سے ملنے کی شدید خواہش کو ظاہر کیا تھا۔ مجید لاہوری اکثر کہا کرتے کہ یار شفیع میں مر جاؤں گا اور شفیع عقیل ہمیشہ یہی کہتے کہ نہیں تم کبھی نہیں مرو گے لیکن شفیع عقیل جب اُن کی عیادت کو پہنچے تو مجید لاہوری سچ مچ مر چکے تھے۔

اُن کی ایک کتاب "ہماری منزل غازی یا شہید" بھی جو ۱۹۶۵ء کی جنگ اور اُس کے مجاہدوں کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ شفیع عقیل پورے مغربی محاذوں پر اور کشمیر کے محاذوں پر گئے تھے اور وہاں اُنھوں نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سُنا، جو کچھ پڑھا اور پھر جو کچھ محسوس کیا اُسے اپنے سہل اور تاثر انگیز تحریر میں بیان کر دیا ہے۔ یہ کتاب شفیع عقیل کے حوالے سے اُن مشاہدات و واقعات اور احساسات و تاثرات کا اظہار ہے جنہیں زندہ قومیں اپنے جسم و جان کا سرمایہ سمجھتی ہیں۔ شہید اور غازی دونوں ہی مثالی زندگی اور اعلیٰ اقدار کی علامت ہوتے ہیں اور ان کے کارنامے آنے والی نسلوں کے لیے روشن

اقدار کی علامت ہوتے ہیں اور ان کے کارنامے آنے والی نسلوں کے لیے روشن چراغوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

افسانوی تحریروں میں "ڈھل گئی رات" "تیغِ ستم"، دھوکے اور ایک آنسو ایک تبسم" ہمارے سامنے ہے "ڈھل گئی رات" ایک تجرباتی ناول ہے۔ اس کا ماحول جدید ہے اور ہمارے لیے کسی حد تک نامانوس بھی ہے۔ میں نے جب اس ناول کو پڑھا تو مجھے اس کے ماحول میں اور اس کے کرداروں میں ایک ترقی یافتہ ماحول کے بگڑے ہوئے لوگ نظر آئے۔ پیر لال شاہ رضی مریم اور نائلہ وغیرہ یہ سب نئی تہذیب کے ادھورے چہرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی اقدار کو اُتار پھینکا ہے اور بدیسی فحاشی کو پہن لیا ہے۔ کرداروں کی نفسیات اُن کی اچھائیاں اور بُرائیاں اُن کے ظاہر و باطن شفیع عقیل سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اُنہوں نے سماجی و معاشرتی زخموں کو کُھرچا ہے اور اُن کی تخلیقی قوت نے ان افسانوی تحریروں کو دلچسپ بھی بنایا ہے اور ان میں پُراسراریت بھی پیدا کی ہے۔ شفیع عقیل کے طنز و مزاح میں زندگی کا شعور اور تجربوں کی سچائی اپنے تاثرات قائم کرتی جاتی ہے اور وہ سماجی اور معاشرتی منافقت اور بناوٹ کو تبدیل کرنے کی خواہش میں طنزیہ مُسکراہٹ سے کام لیتے جاتے ہیں "ڈھل گئی رات" اپنے اسلوب کے اعتبار سے ایک تجرباتی ناول ہے کہ پوری کہانی کا دورانیہ کل چوبیس گھنٹوں پر محیط ہے اتنے کم دورانیے میں ناول کا لکھا جانا بہت مشکل نہیں تو بہت سہل بھی نہیں ہے۔ ایسی مثالیں ہمارے یہاں نظر نہیں آتیں۔

پنجابی تہذیب اور پنجابی زبان سے شفیع عقیل کو ایک والہانہ محبت ہے۔ لیکن اس کی بنیاد صرف اس سرزمین سے اُن کے وجودی تعلق پر نہیں ہے بلکہ وہ پنجابی قدیم شاعری میں اور پنجابی لوک کہانیوں میں ایسے بنیادی انسانی جذبوں اور ایسی قدروں کو دیکھتے ہیں جو زندگی کو مسرت انگیز تجربوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔ شفیع عقیل کی دو کتابیں "پنجابی کے پانچ قدیم شاعر" اور "پنجاب رنگ" اس حوالے سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں کہ یہ دونوں کتابیں تحقیق اور تجربے کی بنیادوں پر مرتب کی گئی ہیں پنجابی

شاعری کی تاریخ طویل تاریخ ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے چند مشہور شاعروں تک اپنی فہرست کو محدود رکھا ہے لیکن اس بات کی امکانی کوشش بھی کی ہے کہ ہر شاعر کا مزاج ترجمے کے ذریعے اس طرح اردو میں اپنا اظہار پا سکے کہ پڑھنے والوں کو اُن کے اسالیب، اُن کے جذبات، اُن کے افکار اور ان کے خیالات و محسوسات کا عکس نظر آجائے۔ ہر شاعر کا ایک مختصر سوانحی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک وضاحت شفیع عقیل نے خود کی ہے کہ

"میں نے عربی اور فارسی کے ثقیل لفظوں کے بجائے عام لفظوں کو ترجیح دی ہے۔ تصوّف کی اصطلاحیں بھی آئی ہیں۔ پنجابی کے قدیم شاعروں میں بیشتر صوفی شاعر ہیں۔ ہندی شاعری میں اظہارِ عشق محبوبہ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہی روایت پنجابی کی قدیم شاعری میں بھی موجود ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اردو کے مزاج کو اور اس کے رنگ و آہنگ کو میں نے سامنے رکھا ہے۔"

شفیع عقیل کی ان کتابوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے پنجابی صوفیانہ شاعری کو بھی اردو زبان کا حصّہ بنا دیا ہے۔ پنجاب کے یہ صوفی شاعر — اپنی سوچ میں کچھ مختلف ہیں تو دوسری طرف اپنے طرزِ احساس میں اور اپنے اسلوب میں بھی الگ دکھائی دیتے ہیں، اس طرح اردو صوفیانہ شاعری میں ایک نئے روشن دھارے کا اضافہ ہوا ہے۔ یہاں اردو صرف اُن پنجابی صوفی شاعروں ہی سے متعارف نہیں ہوئی ہے بلکہ نئے آب و ہوا کے نئے موسموں اور محسوسات کے خوشگوار تجربوں کو بھی اپنے وجود کے آس پاس پانے لگی ہے۔ جسم و جان کی بعض گہری سچائیاں، اور انسانی محبتوں کی کئی زندہ آوازیں ان کتابوں کے حوالے سے ہمارے قریب آئی ہیں۔

شفیع عقیل کے مزاج میں تلاش کرنے کے حوصلے اور سچ بولنے کی جرأتیں موجود ہیں جنہیں ہم ان کی تحریروں میں دیکھتے اور محسوس کرتے آئے ہیں، جہاں

تک خالص ادبی تنقیدی اسلوب کا سوال ہے تو انہوں نے اپنی کتابوں میں مختلف جگہوں پر ایسے اظہار بھی کیے ہیں کہ وہ بہت ساری چیزوں کے درمیان اُن کا تجربہ کرتے ہیں اور تفصیل کے حوالے سے ان کے اشتراک کو اور ان کے فرق کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ لوک داستانوں کے بارے میں ان کا ایک مختصر اقتباس دیکھئے

"لوک داستانوں کی قدامت کے بارے میں ہم کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمارا علم وہاں جاکر رُک جاتا ہے جہاں سے تحریر کی ابتدا ہوتی ہے لیکن ہم ان کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ شکل تک آتے آتے انہوں نے صدیوں کا سفر طے کیا ہوگا کیونکہ کہانیاں کسی ایک ذہن کی تخلیق نہیں ہوتیں بلکہ موجودہ صورتوں تک پہنچنے میں مختلف ادوار اور زمانوں کے لوگ اجتماعی طور پر ان میں حصہ لیتے رہے اور پھر ایک نسل دوسری نسل کو سینہ بہ سینہ یہ امانت سپرد کرتی آئی ہے ان لوک کہانیوں میں غیر عقلی اور ناقابلِ فہم فرضی واقعات نہیں ہوتے بلکہ قدیم روایات کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہوتی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوک کہانیوں میں اکثر بگڑے استعارات اور تشبیہات روایات کا روپ اختیار کر لیتی ہیں"

یہ اور اس طرح کی کئی اور تحریریں اُن کے ادبی تنقیدی، تخلیقی اور تجرباتی مزاج کو اظہار میں لاتی ہیں۔

شفیع عقیل کو گمشدہ یا پوشیدہ چیزوں کی تلاش میں ایک لذت ملتی ہے اس لیے اُن کا سفر جدید سے قدیم تک اور قدیم سے جدید تک کا دُہرا سفر ہے ان کے سفرنامے اس حوالے کی ایک اہم سمت ہیں۔ شفیع عقیل کا سفرنامہ سیر و سفر ۱۹۸۰ء میں اشاعت کے بعد سامنے آیا ہے جو جرمنی کے سات شہروں میونخ، ہمبرگ، برلن، بون، ہائیڈل برگ، کولون، ڈوسل ڈورف پر مشتمل ہے۔ اُن کا ایک دوسرا سفرنامہ "سورج کے ساتھ ساتھ" زیرِ اشاعت ہے۔ شفیع عقیل کے سفرناموں کو پڑھ

کہ جو بات شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھے سیاح کا مزاج رکھتے ہیں۔ دوسرے ملکوں یا دوسرے شہروں میں ایک سیاح کو جو مسائل درپیش ہوتے ہیں اُن میں زبان کا مسئلہ اور اخراجات کے مسائل کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ میں ایسے افراد کو سیاح نہیں مانتا جو دولت مند ہیں اپنی اونچی کرسیوں پر اُڑ کر دوسرے ممالک پہنچ جاتے ہیں کیونکہ سیاحی ایک آزاد اور سچی جستجو کا عمل ہے اور یہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے آگے چل کر بڑی صداقتوں تک پہنچنے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔

شفیع عقیل اپنے مشاہدے اپنے مطالعے اور اپنے تجربے میں چیزوں کو لانا چاہتے ہیں جو عام زندگی اور خاص معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہوں نے جو سفر کئے ہیں اُن میں جہاں دوسری قوموں کو اور ان کے ملکوں کو اُن کی روایات کو اور اُن کی معاشرتی زندگیوں کو ان کے مشاغل کو اور اُن کے جنسی و جذباتی معاملات کو بڑی بے باکی سے لکھا ہے، وہیں انہوں نے اپنی ذاتی کمزوریوں کو اور زبان اور پیسے سے پیدا ہونے والے مسائل کو بھی بڑی سچائیوں کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ شفیع عقیل نے مختلف شہروں کے مختلف جنسی قصّے لکھتے وقت لذّیت کو اپنا مقصد نہیں بنایا ہے۔ ان کے سفرناموں کو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی وہیں کہیں آس پاس موجود ہیں اور ان کے سارے مکالمے سُن رہے ہیں۔ اُن کے سارے تاثرات اور اُن کے سارے مناظر دیکھ رہے ہیں وہ اپنی ذاتی کمزوریوں سے بھی ایک خوشگوار مسرّت کشید کر کے ہم تک پہنچاتے ہیں۔ وہ سفر کے دوران اپنے آپ کو نہ تو کسی اُڑن کھٹولے پر روانہ کر دیتے ہیں اور نہ ہی کسی انگنی پر لٹک کر رہ جاتے ہیں۔ بنجارہ پن ان کے وجود کا فعال حصّہ ہے۔ میں اُن کے سفرناموں کی چند جھلکیاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یونخ میں شفیع عقیل کی ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوتی ہے جسے وہ اپنے ہوٹل پر بُلاتے ہیں لیکن اس لڑکی کے آنے سے پہلے ہی ہوٹل چھوڑ کر بھاگ لیتے ہیں کہ اگر وہ آگئی تو خرچ کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صُبح اُٹھتے ہی ہم دونوں نے

سوچا کہ لڑکی کو وقت کیوں دے آئے ہیں، بڑے بے وقوف ہیں۔ میں نے ضمیر سے کہا۔

"بارہ بجنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل بھاگو ورنہ کمرے کا کرایہ الگ پڑے گا اور لڑکی آ گئی اور اُس نے کچھ کھانے پینے کو طلب کیا تو اور بھی مصیبت آئے گی۔ ضمیر نے میری فراری ذہانت کی داد دی اور ہم دونوں ــــ جلدی جلدی اپنا سامان یوں بکسوں میں بند کرنے کے لیے جُٹ گئے جیسے ہم پر کوئی چھاپا پڑنے والا ہو۔"

برلن پہنچتے ہوئے سفر کے دوران شفیع عقیل کو ایک ایسی غیر ملکی لڑکی بھی ملی جس نے آدھی سے زیادہ دُنیا کا سفر کر لیا تھا۔ وہ شفیع عقیل سے کہہ رہی تھی کہ "سفر میری لائبریری ہے۔ میں ایک دو سال بعد پاکستان جاؤں گی میں وہاں موہنجوداڑو کے آثارِ قدیمہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" اُس کی اس بات سے میں اپنے دل میں قدرے ندامت سی محسوس کر رہا تھا کہ ایک وہ غیر ملکی لڑکی تھی جو ہزاروں میل کا سفر طے کر کے موہنجوداڑو دیکھنا چاہتی تھی اور ایک میں نے آج تک موہنجوداڑو نہیں دیکھا سوچ کا یہ تضاد بھی عجیب تھا۔ ہم میں اَن گنت ایسے لوگ ہیں جو ہزاروں روپے صرف کر کے دُنیا کے مختلف ملکوں کی سیر کرتے ہیں مگر ایسے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پورے ملک کو دیکھا ہو شاید ہم میں سے بہت کم لوگ ہوں گے ہائیڈل برگ جسے شہرِ رومان بھی کہا جاتا ہے اور جہاں علامہ اقبال کا ایک یادگاری چارفٹ کا پتھر بھی موجود ہے۔ شہرۂ آفاق شاعر اور مفکر گوئٹے اس شہر کا عاشق تھا اور علامہ اقبال نے دریائے نیکر کے کنارے ایک شام کے عنوان سے اپنی نظم مکمل کی تھی شفیع عقیل کو یہ شہر اچھا نہیں لگا کہ یہاں قلعے اور کھنڈر کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور دودھ کی بوتلوں کی طرح پانی کی بوتلیں بکتی ہیں، اسی لیے دوسرے یورپی ممالک کے لوگوں کی طرح جرمن بھی پانی پینے کا تکلف نہیں کرتے یہاں بیئر چلتی ہے یا وائن استعمال کی جاتی ہے۔"

یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات شفیع عقیل نے ہم تک پہنچائے ہیں اور ہمیں ایک حیرت آمیز مسرت سے ہمکنار کیا ہے یہ تو ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں زیادہ گہرائی تک نہیں جاتے اور عوامی مزاج ان کی ہر تحریر میں اپنے رنگ کو ظاہر کر دیتا ہے لیکن اُن کے دلچسپ اور سہل طرزِ نگارش سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا۔

شفیع عقیل کی تخلیقی سمتوں میں اُن کی پنجابی شاعری اپنی اہمیت رکھتی ہے ان کے دو شعری مجموعے "سوچاں دی زنجیر" ۱۹۷۵ء میں اور "زہر پیالہ" ۱۹۸۰ء میں شائع ہو چکے ہیں، اس کے بعد بھی اُنہوں نے بہت سی پنجابی نظمیں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ اہمیت کی ہے وہ یہ ہے کہ جس وقت شفیع عقیل نے پنجابی کی یہ نظمیں لکھنی شروع کی تھیں اُس وقت تک صرف پنجابی شاعری کرنے والوں میں استاد دامن، بوگی جہلمی، شریف کنجاہی، احمد راہی، عبدالمجید بھٹی اور سلیم کاشمیری وغیرہ کے نام سامنے تھے یعنی یہ لوگ کلاسیکی طرزِ احساس کے شاعر تھے۔ ——— گزشتہ برسوں میں پنجابی شاعری پر خاصی توجہ دی گئی ہے۔ فیض احمد فیض، منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی نے پنجابی میں شعر لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد پنجابی میں شعر لکھ رہی ہے۔ شفیع عقیل کی پنجابی نظمیں جرمنی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ان کی پنجابی شاعری کے بارے میں، احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ

> "شفیع عقیل کی شاعری میں خلوص کی فراوانی ہے وہ ہر لفظ کے ساتھ قاری کو اپنا ہم خیال بناتے ہوئے گزرتا ہے۔ وہ شاعری میں اختصارِ اظہار کا قائل ہے وہ اپنی نظم کو ردِعمل کے حوالے کر کے اس اعتماد سے آگے بڑھ جاتا ہے کہ جو کچھ اُس نے کہنا چاہا ہے وہ پڑھنے والے کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔ شفیع عقیل کی یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں اندر سے بہت گہری ہیں اور ان کا پھیلاؤ پوری زندگی کا پھیلاؤ

اتنے کم عرصے میں زندگی کے کسی نہ کسی بھید کو کھولنے کا یہ قرینہ کسی کسی کو آتا ہے۔ شفیع عقیل کی نظمیں پنجابی دوہڑے یا چار بیتی جیسی صورت رکھتی ہیں۔ وہ اپنی ہر نظم میں دوہڑے کا ایک شعر لکھتا ہے مگر اُسے چار ٹکڑوں میں ایسے انوکھے اور خوبصورت انداز میں بانٹ دیتا ہے کہ ایک شعر ایک نظم بن جاتی ہے۔ شفیع عقیل کی شاعری ایک تجربہ ہے جسے اُس نے ایک تسلیم شدہ سمت بنا دیا ہے۔"

میں نے شفیع عقیل کی یہ دونوں کتابیں پڑھی ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے ان نظموں کی گہری سوچ اور شدید احساس نے متاثر کیا ہے۔ ان نظموں کی شکل کو کسی بھی سمت میں رکھا جائے لیکن ان کا طرزِ احساس زندگی کے جبر کو تبدیل کرنے کی گہری خواہش سے الگ نہیں ہے۔ سوچاں دی نہ نجیر کی چند نظمیں آپ بھی دیکھئے

سچا ہیرا

سو بل کنی ہیرے دی پل وِچ
شیشہ کٹ وکھا دے
توں دیں ہیرے ورگی جاپیں
تینھوں ڈر آوے

اصلی ہیرا

ہیرے کی ایک نازک سی کنی ایک پل میں پلک جھپکتے میں
شیشے کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے
اے لڑکی! تو بھی ہیرے کی طرح خوبصورت دکھائی دے رہی ہے
مجھے تجھ سے بھی خوف آرہا ہے۔

بُت

جس دا بُت اے، جنہیں بنایا
دونویں موت نے کھا ہدے
کدھی اُڈیکے بیٹھا دیکھے
لوکی آؤندے جاندے

مجسّمہ

جس شخص کا یہ مجسّمہ ہے اور جس نے اُسے بنایا ہے
ان دونوں کو موت کھا چکی ہے
پھر نہ جانے یہ کس کے انتظار میں اس طرح بیٹھا ہُوا
آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے

سفنہ

دھرتی، امبر، اُت وِچ رنگے
دُور کبوتر اُڈدا
گجدے بدّل راہواں روکن
ہمدھروی او مُڑدا

خواب

زمین و آسمان خون میں رنگے ہوئے سُرخ ہو رہے تھے
اور فضا میں دُور ایک کبوتر اُڑ رہا تھا
اور گرجتے ہوئے بادل اُس کی راہیں روک رہے تھے
وہ جس طرف بھی مُڑتا اُس کے آگے آجاتے تھے

میری بھُل

سورج دائیں ساتھی بنیا
چانن ویر کمایا
رات وے اُٹھے کھوہ وِچ سُٹ کے
خورے کِدھر وہایا

میری بھُول

میں سورج کو روشن دیکھ کر اُس کا ساتھی بنا تھا، اُس کے ساتھ چلا تھا لیکن
اس کی روشنی ہی نے مجھ سے دشمنی کی
وہ راستے ہی میں مجھے رات کے اندھے کنوئیں میں پھینک کر
خود نہ جانے کِدھر چلا گیا ہے

شفیع عقیل کی ان نظموں کو پڑھ کر زندگی کے عام تجربوں اور عمومی المیوں کا احساس ہوتا ہے۔ بعض نظمیں ہمیں ان کی گہری فکر، خوبصورت خیالی اور بلند جذباتی رَو کی طرف بھی لے جاتی ہیں اور اپنی شعری لذتوں سے ہمیں متاثر کرتی ہیں ان نظموں میں خارجیت کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ شاعر کی داخلی حساسیت سے مل کر اظہار میں آئی ہیں شفیع عقیل نے خود اپنی نظموں کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

"یہ ایک آدمی کی سوچ کا سلسلہ ہے جس کے اظہار کے لیے میں نے نظم کا مختصر بلکہ مختصر ترین پیٹرن اختیار کیا ہے تاکہ الفاظ کا بوجھ سوچ یا خیال کا گلا نہ گھونٹ سکے دراصل یہ نظمیں اشیاء کے نئے رشتے تلاش کرنے کی ایک کوشش ہے بعض ساکت و جامد اشیاء میں بھی زندگی کی کوئی نہ کوئی جہت نکالی گئی ہے۔ اشیاء اور الفاظ کی کئی جہتیں کئی پہلو اور کئی پرتیں ہوتی ہیں اور انسانی آنکھ ان سب کو دیکھنے

سے قاصر ہے۔ میں نے ایسی ہی جہتوں کے بارے میں سوچا ہے جو
اکثر اوجھل رہتی ہیں اور دیکھنے میں نہیں آتیں۔ بعض ایسی اشیاء کو
بھی اپنا موضوع بنایا ہے جو بظاہر شاعری کا موضوع نہیں ہیں میں
نے کہیں خارج کے حوالے سے ذات میں جھانکا ہے اور کہیں ذات
کے توسط سے خارج کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔"

"زہر پیالہ" کی نظموں میں انسانی اقدار اور اٹل سچائیوں کا اظہار تخلیقی صورتوں
میں زیادہ موثر انداز میں کیا گیا ہے اس کتاب کی بہت سی نظمیں عام تجربے سے
ہٹی ہوئی ہیں اور گرد و پیش کی اشیاء سے لے کر انسانوں تک کے نئے چہرے اور
ان کی نئی صفات کو ہم پر ظاہر کرتی ہیں مثلاً وہ کہیں جگہ دشمن کا ایک روپ دیکھتے
ہیں اور دوستوں کے کہیں کہیں منافق چہرے انہیں نظر آتے ہیں وہ چھوٹی محبتوں
اور ہمدردیوں کی کوردکرتے ہیں اور عداوتوں کو اہم اس لیے قرار دیتے ہیں
کہ اس میں کوئی دھوکا نہیں ہے "زہر پیالہ" کی بھی چند نظمیں دیکھیے۔

سچ دا زہر

سچ دا زہر پیالہ لے کے
کدّ تک کلیاں جینا
جھوٹھ نگر وچ تیرے باہجھوں
ہور کیسے نئیں پینا

سچ کا زہر

تو سچ کے زہر کا پیالہ ہاتھ میں لے کر
کب تک اس طرح اکیلا جیئے گا
جھوٹ کے اس نگر میں تیرے سوا اور کوئی
اُسے نہیں پیئے گا۔

سچ تے جھوٹ

لوکی کہندے سورج سچ اے
چمکے جو اسماناں
اتھاں اکھے جھوٹھ اے سورج
کہنڑاں میں سچ جاناں

سچ اور جھوٹ

لوگ کہتے ہیں کہ سورج ایک سچائی ہے
جو آسمانوں پر چمکتا ہے
مگر ایک اندھا کہتا ہے کہ سورج جھوٹ ہے
روشنی فریب ہے
اب کوئی مجھے بتائے کہ میں
ان میں سے کس کی بات کو سچ مانوں

زندہ تے مُردہ

لکھاں لوکی زندہ ویکھاں
لیکن ایہہ سب موئے
کتنے لوکی قبراں ڈبے
پر اوہ زندہ ہوئے

زندہ اور مُردہ

میں لاکھوں زندہ لوگوں کو دیکھتا ہوں
لیکن حقیقت میں یہ سب مُردہ ہیں
اور کتنے لوگ ہیں جو قبروں میں دفن کر دیے گئے ہیں
مگر وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئے ہیں

کدی کدی

کدی ہنیرے اندر جھاکاں
دسدے کئی چہرے
کدی کیں چانن دیج کھلووال
اپنا آپ نہ دِسّے

کبھی کبھی

کبھی میں اندھیرے میں جھانک کر دیکھتا ہوں
تو مجھے کئی چہرے دکھائی دیتے ہیں
اور کبھی روشنی میں کھڑا ہوتا ہوں
تو مجھے اپنا آپ بھی دکھائی نہیں دیتا

ان نظموں کے حوالے سے شفیع عقیل کے تخلیقی اظہار کو اہمیت دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا یہ نظمیں زندگی اور فن دونوں کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ استعاراتی نوعیتیں اور شعری صداقتیں ان نظموں کی اہمیت میں اضافے کا سبب بنی ہیں۔ شفیع عقیل نے یہ نظمیں سہل پنجابی اسلوب میں لکھی ہیں لیکن ان کی فکری اور تجرباتی سچائیاں بہت گہری ہیں۔ انہوں نے بہت سی اردو نظمیں اور اردو غزلیں بھی لکھی ہیں جو ابھی کتابی شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن ان میں زندگی کے نئے دکھ اور ماحول کے پرانے جبر کا وہ اظہار شدت سے موجود ہے جو شفیع عقیل کی بے خوفی اور ان کے بے ساختہ پن کو ایک گہرے اعتبار سے ہمکنار کرتا ہے۔ کچھ عرصے سے شفیع عقیل تسلسل کے ساتھ طنزیہ نظمیں لکھ رہے ہیں جو صحافتی نہ سہی لیکن ہنرلیہ نہیں ہیں۔ یہاں شفیع عقیل کا طنز سماجی و سیاسی ناہمواریوں کی بنیاد پر اپنا اظہار کرتا ہے۔ بعض الفاظ اپنے دروبست میں کچھ یوں لکھے جاتے ہیں کہ کالی پرچھائیوں پر غصّے کے درمیان زیرِ لب تبسم بھی آجاتا ہے۔ شفیع عقیل کا مزاج حقیقت پسندانہ ہے اور وہ معاشرے کی منفی صورتوں کو بہت سفاکی اور بہت سنگدلی کے ساتھ لکھ دیتے ہیں۔ ان کی یہ شاعری

تخلیقی جراحی کا ایک ایسا عمل ہے جیسے کوئی تجربہ کار سرجن موٹے مگر تیز نشتروں سے گلے سڑے بدبودار اور مجہول جسمانی اعضاء کو کاٹ کر رکھ دے کہ جسم دوبارہ خوبصورت اور صحت مند ہو سکے۔

میں شفیع عقیل کے اُن مضامین کا تذکرہ بھی بہت ضروری سمجھتا ہوں، جو اُنہوں نے مصوّری پر لکھے ہیں۔ ان مضامین کی تعداد کوئی پانچ سو سے زیادہ ہو گی ان میں سے بیشتر مصوّر اور خطّاط پاکستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں بوڑھے، جوان خواتین اور مرد نئے اور پرانے شہرت یافتہ اور گمنام سب ہی مصوّر ان میں شریک ہیں کہ شفیع عقیل نے ان کو لکھتے وقت شخصیت کو نہیں فن کو اہمیت دی ہے۔ اُنہوں نے خطّاطی کے لیے "مصوّرانہ خطاطی" کا لفظ پہلی بار لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام مضامین شفیع عقیل کی فنکارانہ اہمیت اور ان کی تصویری شعور کی انفرادیت کا بیش قیمت اظہار ہیں اور بے مثال ہیں۔

جدید عہد نے جہاں ہم پر سائنسی ایجادات اور تجربات کے نئے آسمان کھولے ہیں وہیں بہت سی سماجی اور عمرانی صداقتوں کو بھی ہم پر وا کیا ہے ہم سے پہلے شاید لوک ادب کو وہ اہمیت اور وہ افادیت حاصل نہیں تھی جو ہمارے عہد میں حاصل ہوئی ہے اب ہم لوک ادب کو جانے بغیر اپنی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے علم کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے شفیع عقیل کا نام برِصغیر کے ایسے لکھنے والوں میں سرِفہرست نظر آتا ہے جنہوں نے لوک ورثے کی تلاش میں اور اُس کی پیش کش میں سب سے اہم کام ہے۔

احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں کہ

"شفیع عقیل نے اپنی لوک کہانیوں کے ذریعے ہمارے سامنے نہ صرف ماضی کو زندہ کر دیا ہے بلکہ اُنہوں نے دوسرے ملکوں کے عوامی پس منظر کو دکھا کر بھی بڑی اہمیت حاصل ہے"

لوک ادب شفیع عقیل کا سب سے پسندیدہ موضوع ہے اس سلسلے کی جو

کتابیں شفیع عقیل نے لکھی ہیں اُن میں جاپانی لوک کہانیاں، جاپانی لوک حکایتیں، جاپانی لوک کھتائیں، جاپانی لوک داستانیں، چینی لوک کہانیاں، جرمنی لوک کہانیاں، ایرانی لوک کہانیاں، پنجابی لوک داستانیں اور پنجابی لوک کہانیاں شریک ہیں۔ شفیع عقیل کی کتاب "پنجابی لوک کہانیاں" یونیسکو نے سات مختلف زبانوں میں شائع کی ہے اور "جرمن لوک کہانیاں، جرمن کے ریڈیو، ڈوئچے ویلے، یعنی وائس آف جرمنی سے فیچر کی صورت میں نشر ہوئی ہیں۔ شفیع عقیل نے خود لوک کہانیوں کے بارے میں کئی جگہ شدت سے اپنے شوق کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"میں نے لوک کہانیاں بڑے شوق سے لکھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی وجہ نہیں کہ ادبی لحاظ سے انہیں تا حدِ امکان دلچسپ نہ بنایا جائے میں نے یہی کیا ہے لیکن کہانیوں کے کردار مقامات و واقعات و حالات ہر چیز کو اصل کے مطابق رکھا ہے، صرف مکالموں میں اجتہاد کیا ہے کیونکہ ان مکالموں کی مدد سے میں نے کہانیوں کے درمیان خلاء کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی دلچسپی میں اضافے کیے ہیں۔ ماحول کی عکاسی کو اہمیت دی ہے تاکہ اس کی تفصیل کا قاری پر گہرا اثر ہو سکے۔ زبان و بیان آسان اور سہل ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے والی بات ان تمام کہانیوں میں مشترک ملے گی اور یہی مقصدی پہلو مجھے افادیت و اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔"

شفیع عقیل نے لوک ادب پر جو کام کیا ہے اُس کی پوری اہمیت اور اُس کی پوری افادیت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو انسانی تاریخ اور انسانی تہذیب میں شریک ہونا چاہتے ہیں کیونکہ لوک ادب صرف کسی ملک و قوم کی تہذیبی اور تمدنی عکاسی ہی نہیں کرتا ہے بلکہ یہی وہ گہوارہ ہے جہاں ایک مشترک انسانی شعور نے پرورش پائی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ چینی یا جاپانی کہانیاں ہوں یا جرمن اور ایرانی کہانیاں یا پھر پنجابی کہانیاں نہ صرف شفیع عقیل کے اپنے اہم مقصد کو پورا کرتی ہیں بلکہ جس زبان، جس ملک اور جس قوم میں بھی یہ کہانیاں پہنچیں گی اپنی اہمیت اور اپنی افادیت کا احساس ضرور دلائیں گی۔ لوک کہانیوں میں شفیع عقیل نے انسانی روایات کو اور قدیم عالمی تہذیب و ثقافت کو ہمارے سامنے ایک زندہ وحدت میں پیش کر دیا ہے اس مسیحائی سے گذشتہ اقدارِ زندگی کے جو اوراق روشن ہوئے ہیں اُن کی چمک میں پہلی بار اردو میں ایک ایسی شاہراہ تعمیر ہوئی ہے جس پر عالمی لوک ادب کے راستے آ ملے ہیں اور جس کے پہلے اہم سنگِ میل پر شفیع عقیل کا نام لکھا ہوا ہے۔

دریچے ہیں روشن

یہ اِک اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

برِّصغیر میں پاکستانی شاعروں کے جو اشعار اپنی مقبولیت و شہرت تک پہنچے ہیں اُن میں عالمتاب تشنہ کا یہ شعر بھی شامل ہے۔ عالمتاب تشنہ کوئی چالیس برسوں سے لکھ رہے ہیں۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ "موج موج تشنگی" ۱۹۷۸ء میں اشاعت پذیر ہُوا تھا اور ۱۹۸۵ء میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ "آئینے کے اس طرف" شائع ہُوا ہے۔ تشنہ کا آبائی تعلق میرٹھ جیسی مردم خیز مٹی سے ہے جہاں ایک ہی زمانے میں ان کی جوانی اور ان کی شاعری جڑواں بچوں کی طرح سامنے آئی ہیں۔

تشنہ کے شعری سفر میں تجربوں کی کئی سمتیں ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ خارجی جمالیات ہی کے شاعر ہیں اور جسمانی لذتوں سے کشید کی ہوئی لہر بہت سچی اور تازہ محسوس ہوتی ہے۔ تشنہ کے دوست کے تحریری حوالے سے اُن کی شاعری کے پس منظر کو دیکھنے کا ثبوت سے راشد صدیقی نے لکھا ہے کہ

تشنہ نے انڈین سول سروس کے امتحان میں بڑی نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی لیکن ٹوٹا ہوا اس عشق کا جو پنپا۔ اور تشنہ کی داستان بن کر زبان زدِ عام ہوا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ شہر کی ہوا مکدر ہو گئی اور تشنہ کو سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔ تشنہ کے اکثر شعروں میں اُس لڑکی کا ہیولا نظر آتا ہے اور اس لڑکی میں آج بھی مکمل تشنہ بسا ہوا ہے کہ اُس نے آج تک شادی نہیں کی۔ وہ انگریزی کی پروفیسر ہے۔ اب بھی جب کبھی اُس کے سامنے تشنہ کا ذکر آجاتا ہے تو اُس کی پلکیں بھیگ جاتی ہیں اور تشنہ نہ جانے اُس کے دل میں کیا ہے کہ عشق اور شاعری یہی تو دو اُس کی پہچانیں ہیں؟

عالمتاب تشنہ نے کراچی جیسے صنعتی شہر میں ایسی زندگی بسر کی ہے جس میں سب ہی سہولتیں ان کے پاس رہی ہیں لیکن ان کے اندر ایک شعلہ بھی جلتا رہا ہے جس میں پگھلتے رہنا انھیں کبھی ناپسند نہیں رہا۔

عالمتاب تشنہ نے شاعری کی ابتدا رومانی نظموں سے کی تھی۔ انھوں نے کیٹس اور شیلے کی نظموں کے ترجمے بھی کیے لیکن ان نظموں کو گاؤ خورد یا دریا برد کرنا بہتر سمجھا اچھا ہوتا کہ ان نظموں کو "موج موج تشنگی" میں شامل کر لیا جاتا کہ ہم اُن کے پورے شعری سفر کو دیکھ سکتے۔ ایک اہم کام جو انھوں نے کیا ہے وہ شیکسپیئر کے ڈرامے "مڈسمر نائٹ ڈریم" کا منظوم ترجمہ ہے اور جسے وہ مرتب بھی کر چکے ہیں اس کے علاوہ ان کا شعری مجموعہ "کف ہوا" بھی زیرِ طبع ہے۔

عالمتاب تشنہ زندگی کے بہت سے عملی و تخلیقی تجربوں سے گزرے ہیں اور انھوں نے کئی بڑے ملکوں کی سیاحت بھی کی ہے۔ اس حوالے سے اپنے عہد کی عالمی انسانی ضرورتوں کو سمجھا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آج کا انسان اپنے ٹوٹے ہوئے مادّی اور روحانی ربط کی تلاش میں ہے۔ اس تیز رفتار عہد میں جسم شل اور دماغ اندیشوں اور سانحوں سے نیم جان ہو چکے ہیں اور تیسری دُنیا کے لوگ تو بنیادی ضرورتوں ہی سے محروم ہیں۔

ایسے زمانوں میں شعر و ادب کے حوالے سے محبت اور جمالیات ہی انسان کا آخری کنارا بن سکتے ہیں۔ تشنہ کی شاعری کا مرکز اور اُس کے چھوٹے بڑے سب دائرے انسانی روح کو اور انسانی ذہن کو اُس تھکن سے اور اُس نڈھال پن سے بچانے کی ہی ایک کوشش ہیں جسے ہمارے عہد کے چہرے پر لکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہوا یوں ہے کہ "موج موج تشنگی" کی ابتدا اُنھوں نے اس شعر سے کی ہے۔

کیوں دی مجھے ولایت ادراک و آگہی
اب کائنات سرِ مشیّت نہیں رہی

انسانی شعور اور اُس کے ادراک نے دُنیا کے ان گنت پوشیدہ رازوں کو ظاہر کر دیا ہے لیکن وہ خود خیال اور تجربے کی بھول بھلیوں میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ تشنہ ماورا سے اپنے آپ کو جوڑنا بھی چاہتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ۔

میں ترے وصف میں حرفِ تمام لکھ جاؤں
تو اپنے لوح و قلم تک مجھے رسائی دے
میں تجھ کو چاہوں تو ایسا کہ خود فنا ہو جاؤں
مرا وجود ترا آئینہ دکھائی دے
ہر ایک ناوکِ دشنام پر دعائیں دوں
مرے خدا مجھے اوصافِ مصطفائی دے

تشنہ کی یہ دُعا خدائی قوت سے مصطفوی رحمت تک ایک التجا کی صورت ہے کہ زمین سے آسمان تک اُڑتی ہوئی روشنیاں گرہی کا غبار ثابت ہو رہی ہیں عصرِ نو کی اندھیری رات ہے مگر آگہی کے چراغ بجھ چکے ہیں اور سیاہ دنوں کے شہر میں روشنی کا کوئی عکس دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ انسان خود اپنا قاتل بن گیا ہے وہ دیوار کے اس طرف چھپ کر اپنی ہی ذات کو ہلاک کر رہا ہے۔ وہ اپنے جسم کے مرقد میں دفن ہے۔ وہ یوں جی رہا ہے کہ زندگی پرچھائیوں سے جنگ میں ہے۔ آگہی کے غبار تک اس کا کوئی ہم سفر نہیں ہے اور وہ خود ایک گمشدہ وجود بن گیا ہے۔

جہانِ ہست میں گم ہو گیا ہوں لا کی طرح
مرے وجود کا عالم ہے ما ورا کی طرح
سپاہِ خیر و شر ہیں صف بہ صف مرے وجود میں
میں رزم گاہِ زندگی میں کربلا کی جنگ ہوں
یہاں ارض و سما میرے ہی بکھرے ہوئے ٹکڑے
آئینہ ہوں اور دستِ مشیت سے گرا ہوں
اپنے عکسِ ذات کو کرتے رہے شیرازہ بند
آئینہ خانوں سے ہم پرچھائیں چنتے رہے

وہ انسان جس نے دُنیا کی تشکیلِ نو کی ہے وہ خود دھوپ کے صحرا میں ایک سراب بن گیا ہے۔ زمین کو خوبصورتیوں اور رنگوں سے سجانے والا زندگی کے پیرہن کو چاک کر چکا ہے اور آپ اپنا رقصِ برہنگی بنا ہوا ہے۔ انسانی معاشرہ ذاتی مفادات اور حیوانی جبریت کا شکار ہے۔ ایسے اندھیرے اور ایسی گھٹن کے درمیان تشنہ اپنے مکالمے میں دور تک پھیلے ہوئے لوگوں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں کہ شاید کوئی خوشگوار تبدیلی کا امکان پیدا ہو سکے وہ کہتے ہیں کہ

قلم کیا میرے ہاتھوں کو شب پرستوں نے
میں لکھ رہا تھا چراغوں کی داستاں لوگو!
میں بات کرتا رہا خوشبوؤں کے لہجے میں
کوئی سمجھ نہ سکا پیار کی زباں لوگو!
وہ زندگی تھی خدایا کہ دشتِ بے سایہ
غموں کی دھوپ کڑی تھی شجر نہ تھا کوئی
میں ہوں اس دشت کا تنہا مسافر
جہاں سورج تو ہے لیکن شجر نہیں

رقص تھا آنکھوں میں ننگی روح کا
تھے لباسوں میں بھی ہم عریاں بہت

شیشے کا جسم لے کر شہر میں نکلنے والے پاش پاش ہونے کی شکایت کس سے کریں کہ گرد و پیش کے لوگ مردہ رسومات اور نئی تلواریں لے کر سامنے آگئے ہیں۔ اس آشوب میں جینا کچھ سہل نہیں رہا ہے لیکن تشنہ اپنی آواز میں تجربوں کو لکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ان چراغوں کو بجھانے سے رُکے گی نہ سحر
رات رکھنی تھی تو سورج کو بجھایا ہوتا
تو اس زمین میں چنگاریوں کی فصل نہ بو
اُگی جو آگ تو پھیلے گی سارے جنگل میں
نظر لگائے رہے دوسروں کے قامت پر
کسی کو اپنے برابر نہ کوئی دیکھ سکا
آگہی جہل نمائش کے بہت کام آئی
ہم سجائے گئے طاقوں میں کتابوں کی طرح
وہ کہ تھی جن سے کبھی انجمن آرائی شب
ہم سے اب ملتے ہیں وہ بند کتابوں کی طرح
پھول کی عمر ہو سکی نہ دراز
مانگتی رہ گئی دُعا خوشبو
ہر ایک شخص تھا اپنی ہوس کا زندانی
حصارِ ذات سے باہر کوئی نہ دیکھ سکا

تشنہ کا خیال ہے کہ انھیں شہرِ سخن میں جو اعتبار ملا ہے وہ اپنے محبوب کے خال و خد کے لکھنے ہی سے ملا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رومانی جمالیات کے تجربے دوسرے تمام تجربوں سے زیادہ انھیں پسند رہے ہیں۔ تشنہ کی خوش کلامی تک خوبصورت خواب

بدن کے گہرے ملس چمکتے ہوئے رنگ اور اڑتی ہوئی خوشبوئیں ایک عجیب سا حسیاتی وژن تخلیق کرتی ہیں۔ تشنہ کے یہاں اس کی کئی سطحیں ہیں شعروں کے حوالے سے ہم نے ان مختلف سطحوں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

نشاطِ گرمیٔ بزمِ خیال دیکھیں گے
دیئے بجھا کے ترے خدوخال دیکھیں گے

ہم اُسیرانِ محبّت کے لیے
اک تری آغوش کا زنداں بہت

بے مثالی بھی تری اب تو گراں ہے دل پر
دیکھ کر تجھ کو یہ خواہش ہے کہ تجھ سا دیکھوں

ہمارے چہرے پہ کیا لکھ دیا محبّت نے
تمام دوست ہمیں آئینہ دکھانے لگے

تیری صورت کا یہ فسوں کب تک
آئینہ دیکھتا رہوں کب تک

قریہ قریہ اڑی ہے درد کی دُھول
شہرِ بے مہر میں رہوں کب تک

کر لیا میں نے تار تار بدن
بے لباسی بھی اے جنوں کب تک

عالمتاب تشنہ ایک ایسے انجانے چہرے کو دیکھتے رہتے ہیں جس کے بعد تمام جانے پہچانے چہروں کی یاد آنے لگتی ہے اور پھر وہ چہرہ سامنے آجاتا ہے جس کے بارے میں انھوں نے کہا تھا کہ مہتاب جو بہت خوبصورت ہے یہ مہتاب بھی پورے مہینے میں دو ایک دن ہی میرے محبوب جیسا لگتا ہے۔ تشنہ اسی محبوب سے ہم کلام رہتے ہیں کہ

رات بھر لکھتے رہے قوسِ قزح کا مضمون
رنگ بھرتے رہے تصویرِ بدن میں ہم بھی
گرمی سی ترے جسم کی محسوس ہوئی ہے
گھبرا کے کئی بار مری آنکھ کھلی ہے
آنکھ ذرا جھپکی تو جلتے خوابوں نے
ایسی نیند اڑائی تری یاد آئی
یہ کہنا تم سے بچھڑ کر بکھر گیا تشنہ
کہ جیسے ہاتھ سے گر جائے آئینہ کہنا

تشنہ نے نظمیں بھی لکھی ہیں جو اپنے موضوعات کے تنوع کو اظہار میں لاتی ہیں۔ "تلاش"، سائرن، تخلیق، جلتی بارش، گردِ ملال، ہم رقص اور خمیازہ" زندگی کے ادھورے پن کو اور ہمارے عہد کے کٹے ہوئے چہروں کو پیش کرنے والی نظمیں ہیں۔ "تلاش" میں انسان اور انسانی اقدار کے کھو جانے کا دکھ ہے۔ "سائرن" جنگ کی ہولناکیوں کو اور انسان کی مجبوریوں کا اظہار ہے۔ "تخلیق" لکھنے والے کا باطنی سفر ہے۔ "جلتی بارش" میں تنہائی اور خوشگوار موسموں کے درمیان جذباتی کیفیت کو اور یادوں کی آگ کو جلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ "گردِ ملال" کی صورت ایسے مناظر کو پیش کرتی ہے جو موجودہ لمحے کی گرد میں دب چکے ہیں یہ بازیافت کی ایک خوبصورت نظم ہے۔ "ہم رقص" ترقی یافتہ ملکوں میں جدید سوسائٹی کے بعض رویوں پر طنز ہے جہاں بیوی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ناچتی ہے اور شوہر کسی غیر عورت کے ہمراہ رقص کرتا ہے اور پھر اس فضا میں شرابیں اور نشے گردش میں رہتے ہیں۔

"خمیازہ" ہمارے معاشرتی جسم کے ایک گہرے سیاہ داغ کی طرف اشارہ کرتی ہے طوائف اور رات دونوں کا مقدر ایک ہی سا ہے۔ جس طرح دن میں رات نہیں ٹھہر سکتی اسی طرح روشنی میں طوائف نہیں آسکتی لیکن جب ایک طوائف کے دروازے پر دن میں کوئی شخص دستک دیتا ہے تو وہ حیران ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ ہم تو رات کے جھلمل

کرتے کھلونے ہیں دن میں ہم سے کوئی نہیں کھیلتا اور یہ جو میری آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں یہ راتوں کو جاگنے کا خمیازہ ہیں۔ ان نظموں میں عالمتاب تشنہ کا عالمی سیاحی تجربہ بھی شریک ہے اور مغربی معاشروں کی سیاہ سفید تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشنہ میں زندگی کے تلخ تجربوں کو خوبصورتی کے ساتھ لکھنے کا سلیقہ موجود ہے۔

تشنہ نے دوہے بھی لکھے ہیں۔ ہمارے یہاں اردو دوہوں میں جمیل الدین عالی اور پرتو روہیلہ کے بعد شہزاد ناصر اور جمیل عظیم آبادی کے نام بھی آتے ہیں لیکن عالی جی کی شہرت و مقبولیت تک کوئی نہیں پہنچ سکا ہے۔ ہمیں تشنہ کے دوہوں میں دو آوازیں قدم ملا کر چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کبھی دوہے کی یہ آواز مرد کی آواز بن کر ابھرتی ہے اور کبھی یہ دوہا ہندی تہذیبی روایت کی نسوانی آواز بن کر سنائی دیتا ہے پہلے چند مثالیں عورت کی آواز میں دیکھیے

انجانے میں تو نے ساجن چھوا تھا میرا ہات
کانٹے بچھ گئے راہ میں میری سوئی نہ ساری رات

مسک گئی مری ریشمی چولی جان ہوئی ہلکان
ساجن تیری ہٹ کے آگے ٹوٹ گیا مرا مان

آندھی میں بھی بالے رکھا اس کے پیار کا دیپ
لیکن وہ نرمو ہی نکلا۔ ن موتی کا سیپ

کورا کاغذ ڈال کا پنچھی پردیسی کی ریت
یہ تینوں ہرجائی گوری نہیں کسی کے میت

اور اب چند دوہے مرد کی آواز میں

ساجن کے سپنوں میں کھوئی بیٹھی تھی اک نار۔
برس رہی تھی جلتے پنڈے پر ساون کی پھوار

دونوں ہی بے قابو تھے وہ کیسا تھا بھونچال
دونوں ہی کی سانسیں اکھڑیں دونوں ہی بے حال
مشکل ہے اس جگ میں گوری دل سے دل کا میل
شیش محل میں کھیل رہی ہے تو پتھر کا کھیل
شہر دل کی ہے ریت پرانی پیار کو دیں بن باس
میری بھی اب کتھا لکھے گا کوئی تلی داس

تشنہ نے شعری اسالیب و رجحانات کے حوالے سے عام طور پر اساطیری صورتوں کو نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے لیکن ان دوہوں میں ہندی دیومالا کے ادھورے اور ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں کہ یہ دوہوں کی اپنی باطنی ضرورت کا شدید تقاضا ہیں۔ بدن سے بدن ملتے ہی جنسی کیفیتوں کی چمک بہت گہری ہوتی ہے۔ ان میں لفظوں کی سبک روی اظہار کی خوبصورتی اور تجربے کی سچائی ہمیں متاثر کرتی ہے بظاہر دوہوں کا لہجہ کلاسیکی تعمیمی روایت سے قریب ہے لیکن ہم تشنہ کو ان دوہوں کے عقب میں اگر "پُشپا" کو دیکھ سکیں تو یہ دوہے ایک تازہ حسیاتی تجربہ بن کر ہمیں اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ "پشپا" کا ذکر آگیا ہے تو کانپور والے ماشد صدیقی کا گزشتہ بیان بھی ذہن میں دُہرا لیں اور وہ بن باس جو خود تشنہ نے جھیلا ہے اس کی کہانی بھی خود ان کے لفظوں ہی میں پڑھ لیجیے وہ لکھتے ہیں کہ

"پھر یوں ہوا کہ ۱۹۵۹ء میں وقت کی کیکئی نے مجھے بن باس دے دیا۔ میری "سیتا کویتا" مجھ سے بچھڑ گئی میں نے بارہ برس اس کی شکل نہیں دیکھی میرے احساس کا آئینہ دھندلا گیا، میرے وجدان کے پر کٹ گئے میری کتھا تو تلسی داس لکھنے لگا لیکن میرا قلم زنگ آلود ہو گیا دل میں جوالا مکھی ابلتا رہا لیکن پھوٹ کر بہہ نہ سکا پھر یوں ہوا بن باس کے دن ختم ہوئے "سیتا کویتا" سے پھر عشق کی پینگیں پڑھنے لگیں بن باس کا کرب ہر سفر میں اترنے لگا۔ آج یہی کرب میری شاعری کا سرمایہ ہے۔"

"موج موج تشنگی" کے مطالعے میں عالمتاب تشنہ کی شاعری اور اُن کے تخلیقی تجربوں کی عملی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش میں دو ایک باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔ "موج موج تشنگی" کی شعریات فارسی سے کم اور بھاشا سے زیادہ قریب ہیں لیکن جو لفظ بار بار اپنے خاص ایکسپریشن میں آئے ہیں اُن میں "آگہی، ذات، قامت، بدن و جسم، خوشبو، شیشہ و آئینہ، پتھر اور سنگ، چہرہ، سورج، اور چراغ" کے لفظ ہیں جو بہت حد تک ہماری تازہ شاعری کے لفظ بھی ہیں۔ ہر اچھے شاعر کی طرح تشنہ بھی اپنے عہد کے بعض اہم شاعروں سے متاثر ہوئے ہیں اور اُن کو اپنے باطن و ظاہر میں محسوس بھی کیا ہے۔ "موج موج تشنگی" میں فیض اور ناصر کاظمی سب سے زیادہ اُن کے قریب ہیں اور ناصر کا اثر اُن پر بہت گہرا ہے تشنہ جب لکھتے ہیں کہ

پیار کی پہلی بارش میں دیر تلک ہم بھیگے تھے
یہ
دیس پرائے جو آسمان کیا ہوئے

تو ذہن ناصر کاظمی کی سمت چلنے لگتا ہے۔ پھر تشنہ نے یہ بھی کیا ہے کہ ناصر کی طرح ایک ہی زمین میں مسلسل غزلیں لکھی ہیں جن کے اشعار کی تعداد تقریباً اسّی تک چلی گئی ہے۔ "تو قلزم تھا میں دریا تھا" اس زمین میں کہی جانے والی مسلسل غزلیں ناصر کاظمی کے پیٹرن کو ہی ظاہر کرتی ہیں۔ تشنہ کی یہ مسلسل غزلیں محبوب کے ملنے سے لے کر ہجر و ہجرت تک کی دو دریوں کے تجربات پر پھیلی ہوئی ہیں اور ان غزلوں کی داخلی نوعیت کسی عشقیہ داستان میں ہجر کے بیان جیسی ہے۔ ان غزلوں میں خیال و خواب سے پیدا ہونے والے حسیاتی اظہار کو رنگ برنگ خوبصورت عکسوں میں تجسّم کیا گیا ہے اور ان کے درمیان ایک ایسی گداز شعلگی موجود ہے جو اپنا اثر قائم کرتی چلی جاتی ہے۔ "موج موج تشنگی" کے اس شعر کو بھی پڑھتے چلیے جو ہجرت کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس شعر کو پڑھ کر ہم تشنہ کا پہلا مجموعہ "موج موج تشنگی" بند کرتے ہیں اور آئینہ کے اُس طرف کو دیکھتے ہیں کہ مجموعی شاعری پر گفتگو آگے

چل کر ہوگی شعر ہے کہ

دیکھیے مانوس کب تک ہوں در و دیوار سے
گھر ملا ہم کو بھی لیکن غیر آبائی ملا

اس شعر سے تشنہ کے یہاں ہجرت کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اُن کا دوسرا شعری مجموعہ "آئینے" کے اس طرف پہلے مجموعے کے کوئی آٹھ برس بعد شائع ہوا ہے اس حوالے سے ان کے تجربوں میں ان کی فکر میں ان کی خواہشوں میں اور ان کے تخلیقی اظہار میں نمایاں فرق آیا ہے۔ تشنہ جمالیات کے حصار در حصار خوابوں سے باہر نکلے ہیں اور انھوں نے نئے سفر میں تحیر اور تجسس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے بہت سے پرانے خواب شکستہ ہو گئے ہیں اور بہت سے نئے پیش منظروں میں انھوں نے تازہ ستارہ و خورشید کو اترتے ہوئے دیکھا ہے آئینے کو دیکھ کر پس آئینہ دیکھنے کی نئی طلب ان کے اندر پیدا ہوئی ہے۔

جدھر بھی دیکھتا ہوں اک تحیر ہے تماشا ہے
خدایا کس سے پوچھوں آئینے کے اس طرف کیا ہے

حیرت اس وقت آنکھیں کھولتی ہے جب آدمی نیند سے چل کر بیداری میں اترتا ہے کتابِ تشنہ نے جن بہت سی خوشگوار اور تلخ سچائیوں کو اپنے وجود میں اور اپنے وجود سے باہر دیکھا ہے ان میں ہجرت بھی ایک ایسی سچائی ہے جسے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اپنی بنا کر پاکستان میں ناصر کاظمی محشر بدایونی، رئیس امروہوی اور عالمتاب تشنہ سے زیادہ مقبولیت اور شہرت کے ساتھ کسی اور شاعر نے نہیں برتا ہے اور تشنہ کی وہ مسلسل غزل اس موضوع کی بہترین غزل کہی جا سکتی ہے جس کا مطلع ہے کہ

گنتی میں بے شمار تھے کم کر دیے گئے
ہم ساتھ کے قبیلوں میں ضم کر دیے گئے

پہلے نصابِ عدل ہوا ہم سے انتساب
پھر یوں ہوا کہ قتل بھی ہم کر دیے گئے
پہلے لہولہان کیا ہم کو شہر نے
پھر پیرہن ہمارے علم کر دیے گئے
ہر دور میں رہا یہی آئینِ منصفی
جو سر نہ جھک سکے وہ قلم کر دیے گئے
اس دورِ ناشناس میں ہم سے عرب نژاد
لب کھولنے لگے تو عجم کر دیے گئے

"دیوارِ وقت" خارجی زندگی کا استعارہ بھی ہے اور خود تشنہ کا باطنی وجود بھی ہے جہاں بکھا ہوا ہے کہ جن سے تمام عمر کی آشنائیاں تھیں ان سے ہی اجنبی بن کر چلے آنے والے سکون کا طلحہ کبھی نہیں پا سکیں گے قریۂ جاناں میں پہلے ہی روشنیاں کم تھیں کہ جلتے ہوئے چراغ بھی بجھا دیے گئے ہیں۔ تشنہ نے دورانِ سفر جس پتھر کو سنگِ میل سمجھا تھا سفر کے ختم ہونے پر وہ پتھر کہیں گم ہو گیا ہے۔ اب تشنہ اور تشنہ جیسے کروڑوں مسافر ایک گھر سے دوسرے گھر تک کے سفر میں صحراؤں کا رزق بنتے چلے جا رہے ہیں۔ دستِ خزاں نے لباسِ بہاراں چاک کر دیا ہے اور سایہ شجر سے جدا ہے۔ دھوپ اور غربت کا عذاب کروڑوں انسانوں کا نوشتۂ تقدیر ہے کہ وقت کے آشوب میں ان گنت وجود اپنے جلتے ہوئے جسم دجال کے ساتھ سفر میں تھے کہ رستوں کی شدید دھوپ میں خود ان کے سائے تک جل گئے ہیں۔

کہیں بنیاد رکھتا ہے کسی بستی کی جب کوئی
بہت مجھ کو خیالِ قریۂ اجداد آتا ہے
دشتِ غربت میں کھلا شدتِ احساس کا رنگ
اپنا سایہ بھی ہمیں سایۂ دیوار لگا

ان در و بام کی حسرت نہیں دیکھی جاتی
جن کی تقدیر میں لکھّا ہے مرا گھر ہونا

سوادِ جاں میں نہ یوں دربدر پھرا مجھ کو
مسافرت مرے گھر کا پتا بتا مجھ کو

چراغ میں بھی تھا اور روشنی بھی رکھتا تھا
بجھا گئی ہے ترے شہر کی ہوا مجھ کو

نہ دیکھے ہم نے مسافت کے روز و شب ایسے
کہ عمر ہونے کو آئی ہے گھر نہیں آیا

تشنہ کے تجربے میں گھر وہی ہے جس کی بنیاد دلوں کے درمیان رکھی جاتی ہے اور محبتوں کے راستے میں اُسے تعمیر کیا جاتا ہے تو کیا ہمارے گھر سچّے گھر نہیں ہیں اور کیا سفر کرنے والی نسل ایک گھر سے دوسرے گھر تک اپنے پورے وجود کے ساتھ نہیں پہنچ پائے گی۔ تشنہ دیارِ ذات میں بے وطن پھرنے کے بعد اس سفر سے آگے بڑھ کر بھی سوچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

؎ سائے کی دُشمن ہوا کرتی ہے صحراؤں کی دھوپ
اپنے سائے کے لیے خود سائباں ہو جائیے

اپنی اہمیت کا احساس اپنے دُکھوں اور اپنی اذیّتوں کا اعتبار انھیں اسی ہجرت کی سخت زندگی سے ملا ہے ورنہ وہ تو رنگ برنگ جذبوں کی اڑانوں میں گم تھے۔ ہجرت کے تجربے ہی نے انھیں بتایا ہے کہ معاشرے کی ناہمواریوں سے اور سماج کی جبریت سے کس طرح ٹکرایا جا سکتا ہے۔ تشنہ کی آنکھیں زندگی کی پیچیدہ پگڈنڈیوں کو دیکھتی ہیں اور انھیں اندھیرے اجالے کے درمیان فرق کرنے میں کوئی خوف نہیں لگتا۔

لہو اُجالوں کا ہے تیرگی کے خنجر پر
اندھیرے ٹوٹ پڑے روشنی کے لشکر پر

کتنے بے مہر ہیں یہ شہر بسانے والے
جس کی چھاؤں میں پلے تھے وہ شجر کاٹ دیا

کچھ تو آسان ہو مسافتِ شب
اک دیا رہگذار میں رکھنا

عہدِ کوتاہ قداں میں یہ غنیمت ہے بہت
ہم اگر اپنے ہی قامت کے برابر رہ جائیں

تشنہ لوگوں کا بھی کیا طرزِ پذیرائی تھا
ایک میں پھول تو اک ہاتھ میں پتھر رکھنا

اندھیرے کے خنجر پر اجالوں کا لہو چمک رہا ہے کہ روشنیوں کے لشکروں پر کالی پرچھائیوں نے شب خون مارا ہے۔ ایسی منافقت کے زمانے میں اور ایسے اکیلے پن میں پیار کے موسم اور بھولے ہوئے لوگ یاد آنے لگتے ہیں اس حوالے سے تشنہ کی ایک مسلسل غزل دیکھتے ہیں جو گئے ہوئے لمحوں کی بازیافت بھی کراتی ہے اور تہذیبی اور تمدنی زندگی کی بہترین قدروں کے اظہار کا ایک کامیاب تجربہ بھی ہے۔ اس غزل کے پس منظر میں وہ انجم قدم مسافر اور اُن کی خورشید صفت حوصلہ مندیاں موجود ہیں جو ہمارے شعور سے لاشعور تک اپنے حرکی اور فکری عملیات میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

جنھیں بھول جانے کی کوشش بہت کی وہی لوگ ہم کو مگر یاد آئے
ترے کجکلاہوں کو دیکھا تو سارے سزاوارِ دستارِ سر یاد آئے
وہی سوندھی سوندھی سی مٹی کی خوشبو وہی بھینی بھینی مہک موتیے کی
ترے گھر کے آنگن میں بیٹھے تو ہم کو بہت اپنے دیوار و در یاد آئے

جنھیں ناز تھا اپنی گل پیکری پر دھنک پیرہن لوگ کیا ہو گئے وہ
وہ جن سے تھا رشتہ ہمیں دلبری کا دُکھا دل تو وہ ٹوٹ کر یاد آئے
کڑی دھوپ میں جن کے سائے کی ٹھنڈک تھی اک روز آغوشِ مادر کی صورت
چڑھا سر پہ جب دشتِ غربت کا سورج گھنی چھاؤں کے وہ شجر یاد آئے
وہ صحنوں میں چرپائیوں کی قطاریں وہ شفاف بستر وہ پُروا کے جھونکے
حصارِ در و بام میں رہ کے تشنہ وہ انگنائیوں والے گھر یاد آئے

صحراؤں میں گھر بنانے والے اور تاریک گھروں کی کھڑکیوں میں چراغ رکھنے والے ہی سچی زندگی کے مسافر کہلاتے ہیں آندھیوں پر سورج بن کر لپکنا اور بے سائباں دھوپ میں اپنے سائے کو سائباں بنا لینا زندہ انسانوں کی پہچان ہوا کرتی ہے تشنہ نے باطنی شکست و ریخت کو اپنے عملی تجربوں سے پہچانا ہے۔ ان کی شاعری میں انفعالیت یا نرگسیت کا کوئی بہاؤ نہیں آتا بلکہ ایک ایسی جمالیاتی رجائیت کا احساس ہوتا ہے جو شکستہ انسانوں کی محرومیوں کے درمیان آسودگیوں کا موسم بن کر اترتی ہے۔

کربلا در کربلا ہوتا رہوں میں بھی شہید
اپنے خوں سے داستانِ خیر و شر لکھتا رہوں
میں بے یقینی میں اتنا یقین رکھتا ہوں
کہ اب سراب بھی دھوکا نظر کا لگتا نہیں
یادِ ضرر رساں بھی چپ دشمنِ مہرباں بھی چپ
کب سے ہوں گوش بر صدا کوئی پکارتا نہیں
سب برف کے پیکر ہیں پگھلنے کے لیے ہیں
یہ مجھ پہ بھری دھوپ میں آنے سے کھلا ہے
روشنیوں کا علم اٹھانا شب آثار فضاؤں میں
تیز ہواؤں کے رُخ پر اک دیا جلاتے رہنا

اپنے آپ سے باتیں کرنا ساحل اور سمندر کی
گیلی ریت پہ نقش بنانا اور مٹاتے رہنا
وسعتِ دامنِ امکاں بھی لگی تنگ ہمیں
اُڑنا آیا تو عجب رنگ پروں میں آئے

داخلی اور خارجی تجربے تخلیقی آگ سے گزر کر ستارہ بن جاتے ہیں لیکن ان تجربوں میں جھوٹ یا نمائش کا داغ لگا دیا جائے تو یہی ستارہ بنجر مٹی کی شکل اختیار کر جاتا ہے تشنہ نے اپنے خیال کو اور اپنے احساس کو دوغلے پن سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بیشتر شعروں میں ایک زندہ سی چمک محسوس ہوتی ہے وہ سایۂ دیوار تک پہنچ کر بھی اپنے سفر کو ختم نہیں کرتے اُن کی باطنی شگفتگی ان موسموں کو پکارتی رہتی ہے جو پلٹ کر نہیں آسکتے ہیں۔ منیر نیازی نے لکھا ہے کہ

"عالمتاب تشنہ ایک خوبصورت شاعر ہے اور اس کی شاعری میں ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں کئی جلاوطن حرف گھر کو واپس آتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی معرفت وہ زمانے بھی جن کی یاد ہم میں رہنی چاہیے تھی۔"

نیازی صاحب نے تو شاید تشنہ کی کلاسیکی لفظیات کی سمت یا گزرے ہوئے زمانوں کی بازیافت کی سمت اشارہ کیا ہے لیکن مجھے اس شاعری میں اُن منظروں کا انتظار دکھائی دیتا ہے جو خواب تو بن گئے ہیں مگر حقیقت تک نہیں پہنچے کہ راستے بند ہیں اور ہواؤں پر ایک گہرا سکتہ مسلط ہے۔ تشنہ اس دریا کے دُکھوں کو جانتے ہیں جسے صحرا کے ساحلوں سے ہو کر گزرنا ہے اور درمیان میں چٹانوں کی دیواریں اور غبار کی بے سمتیاں راستے روکے کھڑی ہیں۔

ٹھہرے ہوئے طوفان کا منظر نہیں دیکھا
دیکھو مجھے گر تم نے سمندر نہیں دیکھا

گزرا ہوا لمحہ تھا کہ بہتا ہوا دریا
پھر میری طرف اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا

دیا اندھیرے بانٹ رہا تھا
میں بھی جھولی بھر لایا ہوں

اپنے خوابوں کے دروازے
کب سے بند کیے بیٹھا ہوں

عجب ہیں رزم گہہ زندگی کے یہ انداز
اُسی نے وار کیا جس نے بے سپر جانا

زندگی تیز قدم اور میں آہستہ خرام
دیکھیے کون کہاں ترکِ سفر کرتا ہے

گزاری عمرِ محبت کچھ اس طرح تشنہ
کفِ ہوا میں ہو جیسے چراغ رکھا ہوا

ذات کی بے اہمیتی کا شعور زندگی کی بے توقیری اور معاشرتی جبریت کا غیر انسانی سلوک سماجی طبقاتی کشمکش اپنی پہچان کی تلاش، انتشار اور کرب کا عام ہو جانا گھر بنا کر بھی بے گھری کا خوف رہنا ایک غیر متوازن عمرانی زندگی کو ثابت کرتا ہے۔ مثبت اور منفی رویوں کے درمیان جنگ انسان کا ازلی اور ابدی مقدر ہے۔ تشنہ کا خیال ہے کہ ــــ

"شاعر دراصل ایک نیا راستہ تراشتا ہے اور اُس پر لوگوں کو چلتا ہوا چھوڑ کر خود آگے بڑھ جاتا ہے۔ اک نئے راستے کی تشکیل کے لیے کسی اور منزل کی تلاش میں تجسس کا یہ سفر زندگی بھر جاری رہتا ہے جو اُس کو ترک کر دیتا ہے وہ غیر طبعی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔"

عالمتاب تشنہ کو غیر طبعی موت قبول نہیں ہے اسی لیے وہ اپنے تخلیقی خوابوں کے اور عملی تجربوں کے اظہار میں ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ "آئینے کے

اُس طرف، میں تشنہ کی جمالیات کی نوعیت وہ نہیں ہے جو "موج موجِ تشنگی" میں ہم نے دیکھی تھی۔ جسم و جان کی خوبصورتیوں میں گم رہنے والا شاعر اب حسن کو اقدار بنا کر سامنے لایا ہے جو ایک زندہ روایت کی طرح اُس کے وجود کا حصّہ ہے اور حُسن کو اپنا سہارا بنانے کے بجائے وہ خود سہارا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تشنہ کے رقیب بھی اس بات کی گواہی پر تیار ہیں کہ ان کا عشق معتبر ہے اور پیچھے پاؤں لگا کر پلٹ جانا اُن کے خوابوں میں نہیں لکھا ہے کہ جنگ میں آگے بڑھ کر جان بچانے کے لیے واپس لوٹ آنا جائز ہوگا لیکن تشنہ اپنے عشق میں جسم و جان کے نقصان کے خوف سے لوٹ آنے کو عشق کی روایت نہیں سمجھتے ہیں۔

رات ہوائے درد کا زور کوئی چلا نہیں
ٹوٹی نہیں طنابِ دل خیمۂ جاں گرا نہیں
اک دشت ملا کوچۂ جاناں سے نکل کر
ہم نے تو کبھی عشق کو بے گھر نہیں دیکھا
خوشبو ورق پہ چھوڑ گئی رنگ کے نقوش
میں پھول رکھ کے بھول گیا تھا کتاب میں
نہیں میرے لیے کیا اور کوئی
اُسی کا راستہ کیوں دیکھتا ہوں
مدّت سے مقدر کی طرح بند پڑا تھا
رستہ مرے گھر کا ترے آنے سے کھلا ہے
ہر ایک گام پہ یہ کون روکتا ہے قدم
یہ راستہ تو مجھے تیرے گھر کا لگتا ہے
تمھیں بھی ہوتا مری مشکلوں کا اندازہ
کسی سفر میں جو تم بھی برہنہ پا ہوتے

سُنا ہے دمشق میں بھی اک بار ایسا قحط پڑا تھا کہ لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے

تشنہ بھی ایسے وقت سے گزرے ہیں کہ وہ ترکِ تعلق کے خوف سے ہراساں بھی ہوئے اور بعض لمحے ایسے زوال آمادہ بھی آئے کہ انھیں ترکِ وفا کا خیال بھی کرنا پڑا لیکن تشنہ نے اپنی ذات کو احتساب میں رکھا ہے۔

میں اپنے ظرف کی حد سے نکل نہ جاؤں کہیں
مری انا مرے قامت سے مت بڑھا مجھ کو

وزیر آغا نے لکھتے ہوئے تشنہ کی غزل میں جو مکالمہ تلاش کیا ہے وہ تشنہ اور تشنہ کی ذات کے مابین ہوا ہے لیکن مجھے تشنہ کی شاعری میں "میں" اور "تو" کا وہی مکالمہ نظر آیا ہے جو جدید عہد میں کلاسیکی روایت کو باقی رکھنے کی ایک کوشش ہے اور اپنی حد تک اہمیت و افادیت بھی رکھتا ہے۔

پانی میں بھی اک آگ لگانے کی صفت ہے
بارش میں ترے ساتھ نہانے سے کھلا ہے
ڈوب جاؤ گے تو ساحل نہ کبھی پاؤ گے
مجھ کو ان آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ ہے
تجھ کو بانہوں میں سمیٹا تو یہ محسوس ہوا
موج میں حلقۂ گرداب اتر آیا ہے
جو آئینے سے مجھے مسکرا کے دیکھتا تھا
بہت دنوں سے وہ چہرہ نظر نہیں آیا

یہاں میں اُن لفظوں کو آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جو اس مجموعے میں خصوصیت رکھتے ہیں ایسے لفظوں میں مسافت، آشوب، دشت، سایہ، دھوپ، وقت اور گھر شامل ہیں اگر ان لفظوں کی معنویت کو جوڑ کر کسی ایک لفظ میں اتار لیا

جائے تو وہ لفظ تلاش یا سفر کا استعارہ بن جائے گا اور یہ وہ استعارہ ہے جو "موج موج تشنگی" میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عالمتاب تشنہ کا موجودہ اسلوب ابتدائی اسلوب کے مقابلے میں بہت بدلا ہے اس میں بھاشا کو کم کر کے فارسی کو زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے تشبیہیں، استعارے، اسلوب و اظہار اور رنگ و آہنگ سب ہی تبدیل ہو گئے ہیں۔ "موج موج تشنگی" کی خوش گوئی، نرم کلامی، نازکی اور خوبصورت امیجری کی جگہ زندگی کے تلخ تجربوں نے اظہار کی بے خوفی نے اور الفت و حسن کے درمیان اعتماد کے تخلیقی وژن نے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلے تشنہ ناصر کاظمی سے قریب تر تھے اور اس کتاب میں انھوں نے سب سے زیادہ غالب کی روایت کی چھاؤں میں آگے بڑھنا چاہا ہے ہمیں یاد ہے کہ تشنہ نے بارہ برس کا بن باس بھی جھیلا ہے اور جب وہ دوبارہ اپنی "سیتا کو تیاگ سے ملے ہیں تو وہ بنجر موسموں میں زنگ آلود ہو چکے تھے اس لیے کا انھیں شدید احساس رہا ہے حالانکہ انھیں اپنی "سیتا کو تیاگ سے بچھڑ کر بن باس نہ ملتا تو زندگی کے راون سے وہ اس علم کو کیسے کشید کرتے جس نے انھیں کماؤ پوت بنایا ہے۔ ہوا یوں ہے کہ غالب اور اقبال کی رفاقتوں میں انھوں نے اپنے تخلیقی زنگاری آئینے کو دوبارہ چمکایا ہے اور بہتر انداز میں ستارہ و خورشید کے عکس اترتے ہوئے دیکھے ہیں۔

شاعری میں تخلیقی تجسس اور ساختیاتی عمل کے مسئلے پر خود تشنہ نے بھی سوچا ہے وہ کہتے ہیں کہ۔

> "ادب میں تجریدی، بدیئتی ذہنی انتشار کا ایک اظہار ہے اور جو جتنا بکھرا ہوا ہوتا ہے وہ تجریدیت میں اتنا ہی کامل ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنے تخلیقی تجسس میں عصری آگہی یا دانش حاضر سے مرعوب ہو جاتے ہیں وہی ان تضادات میں گم بھی ہو جاتے ہیں۔ شاعر کی نظر تو آگے کے زمان و مکان پر ہونی چاہیئے ان امکانات پر جو سیاہ عصبیتوں میں خیر کی روشنی کی بشارت دیتے ہیں۔"

تشنہ کی اس تحریر سے ہمیں اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کے ارتقاد کو مانتے ہیں لیکن انکے یہاں کئی ایسے تضادات بھی موجود ہیں جنھیں دیکھنا ضروری ہے کہ تشنہ تجریدیت، علامت، دانشِ حاضر یا عصری آگہی سے ڈرے ہوئے ہیں۔ ہمارا عہد انتشار اور بے چہرگی کا عہد سہی لیکن ہم اپنے عہد کی تفہیم سے باہر نکل کر جس شعری روایت کو آگے بڑھانا چاہیں گے۔ وہ فرسودہ دکھنہ ہوگی یا منفی اور مردہ ہوگی کہ اس طرح ہم اپنی عصری آگہی کے ساتھ اور اپنے عہد کے لسانی محاورے کے ساتھ آگے نہیں چل سکیں گے۔ تازہ روشنی کی بشارت دینا اور نئی جہتوں سے شاعری کو روشناس کرانا تو موجودہ عہد کی زندہ روایت میں شامل ہے۔ ہمارے سامنے نہ تو کوئی سیاہ عصبیت ہے اور نہ ہی کوئی جھوٹا تضاد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تشنہ زندہ شعری روایت کو آگے بڑھانے کے بجائے اُسے اُلٹے پاؤں چلا کر کسی مردہ کھنڈر کی سمت لے جانا پسند نہیں کریں گے۔

عالمتاب تشنہ کی غزل کے موضوعات اور اُس کی ساخت پر جو گفتگو ہو چکی ہے اس میں اتنی بات اور کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اپنی غزل کی بحروں میں کوئی پیچیدہ گوئی، تجرباتی یا کوئی خصوصی نظام نہیں رکھا ہے چند خاص لفظوں کے علاوہ شاعری کی وہی عمومی الفاظ لکھے ہیں لیکن روشنی آثار، وحشِ وحشت، سفیرِ موسمِ گل اور اعتبارِ عکس جیسی بہت سی خوبصورت ترکیبیں تخلیق کی ہیں۔

میں نے تشنہ کی وہ نئی غزلیں اور وہ قطعات بھی دیکھے ہیں جو "آئینے کے اُس طرف" کے بعد لکھے گئے ہیں ان میں موضوعات تو کسی حد تک وہی ہیں لیکن اظہار و اسلوب میں فرق ضرور آیا ہے۔ فارسی لفظوں کا بوجھ کم ہوا ہے اور خیال یا تجربے میں تخلیقی ایجری کی قوت بڑھ گئی ہے۔ طنز کی بے خوفی میں حسیاسیت کا اضافہ ہوا ہے مگر شعری جمالیات الٹے پاؤں نہیں چلی ہے اس حوالے سے کچھ تازہ مثالیں دیکھیے۔

شوق کو نہ گری تھا ہم کو بھی
شکل اک دی سفال کو ہم نے

اس کی صورت گری غزل میں کی
جسم بخشا خیال کو ہم نے
چراغ خود کو کیا اور لَو بنایا مجھے
گلے لگا کے بھی اُس نے بہت جلایا مجھے
میں اس کمال پہ حیرت سے ہو گیا پتھر
کہ عکس اپنا کیا آئینہ بنایا مجھے
ذرا دیکھو وہ بحرِ نیلگوں میں ڈوبتا سورج
طلوعِ ماہ کے منظر کا پس منظر ذرا دیکھو
تمھیں گر دیکھنے ہوں رنگ خوشبو چاندنی یکجا
تو آنکھیں بند کر لو اور اُسے چھو کر ذرا دیکھو

گلاب ہونٹوں کو چھونے کی خواہشوں میں لبوں پہ وہی پیاس کا رنگ جما ہوا ہے

اور وصل کے موسم ہجر کی مسافتوں میں سسکتے ہیں۔ تشنہ کی شاعری میں لمسیات کی تخلیقی سطح بڑی تازگی سے گزرتی ہے۔ دیکھنا، چھونا اور محسوس کرنا بدن سے روح تک کا سفر ہے جس میں سلامت روی کا اشاریہ اعتبار قائم نہ رہ سکے تو جنسی آگ بھی بڑھک سکتی ہے اور شعر و ادب کو لذتیت کا شکار ہونے سے بچایا نہیں جا سکتا طنز کی بھی چند معنوی مثالیں دیکھتے چلیے۔

چراغ خانۂ مفلس کی صورت
لبِ دم ہوں مگر جلتا رہا ہوں
مجھے شوقِ سفر کچھ اس قدر ہے
کہ اکثر نیند میں چلتا رہا ہوں
میں اپنے آپ میں زندہ ہوں لیکن
مرا ماحول مرتا جا رہا ہے

مرے لوگوں میں تشنہ بے حسی کا
یہ کیسا سم اترتا جا رہا ہے
انجیرو شیر بیچتا پھرتا ہے شہر میں
کل تک جو میری نان جویں کا شریک تھا
میرے خلاف ہے وہ گواہی میں پیش پیش
منصوبہ بندیوں میں جو میرا شریک تھا
میرے قصاص کا ہے وہی دعویدار بھی
جو میرے قتل میں پس پردہ شریک تھا
اس بار قتلِ عام ہوا ہے کچھ اس طرح
دستِ ستم کسی کا ہے خنجر کسی کا ہے

اس عہد منافقاں میں ذاتی دُکھ اجتماعی دُکھوں سے گہرے ہیں۔ دھوکے محبتوں میں اور عداوتیں دوستیوں میں اپنا اظہار کرتی ہیں۔ آستینوں میں خنجر پوشیدہ ہیں لیکن شرافتوں اور بے گناہوں کے قتل میں ہاتھوں کو پہچانا نہیں جا رہا ہے۔ مختلف منفی رویوں کی بلائیں رشتوں میں بے چہرہ پرچھائیں بنی ہوئی ہیں جنھیں اثباتی حاتم کا کوئی آئینہ دکھا کر ہلاک بھی نہیں کیا جا سکتا مگر تشنہ کا معاشرتی اور جمالیاتی تجربہ اپنے ادراک و شعور کی گواہی دیتا ہے۔

عالمتاب تشنہ کی مجموعی شاعری کا مطالعہ استعاراتی ہے خوبصورت ہے، دلچسپ ہے حیاتی ہے اور گہرا تاثر رکھتا ہے۔ اُن کے تجربوں سے اور اُن کے اظہار سے جو تخلیقی وفنی چہرہ بنتا ہے۔ اسے دیکھ کر جذبے کی سچائی بھی محسوس ہوتی ہے اور خیال و فکر میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔ تشنہ کا بنایا ہوا چہرہ پرانا نہیں ہے۔ نئی آنکھیں اُسے دیکھنا بھی چاہتی ہیں۔ ذہن متاثر بھی ہوتے ہیں دل اُسے پسند بھی کرتے ہیں پھر بھی تشنہ جیسے سوچنے سمجھنے اور کھلے ہوئے ذہن کے شاعر سے ہم چاہیں گے کہ وہ اپنی حساسیت کو اپنے تجربے کو اور اپنی فکر کو موجودہ زندگی کی پوری علامت بنا کر لکھیں اور جدید عہد

کے عذاب و ثواب سے ڈرنا چھوڑ دیں ذات کے آشوب کو محسوس کریں اور کل اور آج کے درمیان انسانی قدروں کو اپنی پہچان بنائیں۔ اس کے لیے انھیں "موج موج تشنگی" اور "آئینے کے اس طرف" کے اسالیب کو ملا کر ایک ایسا اسلوب تخلیق کرنا ہوگا جو عالمی اسالیب سے استفادہ بھی کر سکے اور اپنی حدوں تک ابلاغی علامت کو بھی اظہار میں لا سکے۔ سُبک ساری اور گراں باری کے مابین تازہ تر بھی ہو انفرادی بھی ہو اور زندہ شعری روایت کو آگے بڑھانے میں ایک قوت بھی ثابت ہو سکے۔ عالمتاب تشنہ آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں کہ انھیں کلاسیکی زبان و بیان کا بھی علم ہے اور وہ حرفِ تازہ کی لذت و اہمیت سے بھی آشنا ہیں اس طرح مجھے یقین ہے وہ جدید لسانی محاورے سے اور اپنے عہد کی حسیاتی و فکری ضرورتوں سے زیادہ قریب ہو جائیں گے کہ اس کے بغیر کسی بھی لکھنے والے میں آگے بڑھنے کی سکت پیدا نہیں ہو سکتی۔

عالمتاب تشنہ کی شاعری کا مطالعہ ختم کرتے ہوئے میں اس دائرے کو مکمل ہوتا ہوا دیکھتا ہوں جو "موج موج تشنگی" سے چل کر "آئینے کے اس طرف" کی آخری غزل تک پہنچا ہے۔ اس حوالے سے وہ تین شعر دیکھیے جو خدا کی سمت اٹھتے ہوئے دعائیہ ہاتھوں پر لکھے گئے ہیں۔

اگر تجھے ہے شکستِ غنیم شب مقصود
مری کمان میں بھی روشنی کا لشکر دے
اگر سُلگتا رہا ہوں میں آفتاب مثال
تو میرے طرۂ دستار کو گلِ تر دے
قفس کو توڑ کر اڑ جائے طائرِ افکار
مکاں کی قید اٹھا مجھ کو لامکاں کر دے

زمین سے اوپر اٹھنے کا احساس اور مکاں سے لامکاں بن جانے کی خواہش دُنیا کے بڑے لوگوں کی مشترک میراث رہی ہے۔ عالمتاب تشنہ نے بھی اس خواہش کو اس میراث کو کئی بار مختلف لفظوں اور مختلف آوازوں میں پکارا ہے۔ انھوں نے ابتدا

www.taemeernews.com

میں ایک دُعا یوں بھی چاہی تھی کہ

خدایا میں جب بھی دُعا مانگتا ہوں
تو یہ چاہتا ہوں
میرے ہاتھ کنگورہ، عرش چھو کر
مجھے سرتاپا نور ہی نور کر دیں

کسی مٹّی میں اجالا بن جانے کی طلب اور کسی زندانی میں بے حصار شہروں تک پہنچنے کی خواہش سفر کرنے لگے تو ساری فصیلیں شکستہ ہو کر کشادہ راستوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ عالمتاب تشنہ کے پاؤں زمین پر سہی لیکن اُن کے ہاتھوں پر ستاروں کو چھونے کی حسرت لکھی ہوئی ہے اور آنکھوں کے دریچے روشن ہیں۔

تم اپنے دل کی ویرانی سے آنکھیں مت بجھا لینا
دریچے ہوں اگر روشن تو گھر آباد لگتا ہے

---

www.taemeernews.com

مطبوعہ کتابیں

میں نے یہ جانا	تنقیدی مضامین دسمبر ۱۹۸۱ء
پہچان	شعری مجموعہ جنوری ۱۹۸۳ء
شناسائی	شعری مجموعہ ستمبر ۱۹۸۴ء
آنکھ اور چراغ	تنقیدی مضامین مئی ۱۹۸۶ء
شاعری اور تہذیب	تنقیدی مضامین جون ۱۹۸۸ء

زیر ترتیب کتابیں

شیشے کا درخت	شعری مجموعہ
سلیم احمد شخصیت اور فن	ایک مطالعہ
جدید افسانہ اور علامتی اسالیب	ایک تجزیہ
میری تحریریں	تنقیدی مضامین
رنگ برنگ گلاب	بچوں کے وہ گیت اور نغمے جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہے
جدید نظمیں	جدید نظموں کا انتخاب

www.taemeernews.com

——— جناب عزیز حامد مدنی

شاعری میں لفظ و بیان کی آگہی رکھنا اور اُسے اپنے عصر کے فکری محرکات کی رو میں مستند شعرا کے کلام میں تلاش کرنا ایک ایسی جستجو ہے جس کی داد موجودہ کتاب کے سلسلے میں صاحبان ذوق جاذب قریشی کو ضرور دیں گے۔

جاذب قریشی شاعر اور نقاد کی حیثیت سے اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں اور شعرا کے مختلف ادوار کے متعلق پورے سیاق و سباق میں ان کا مطالعہ ان کے کاموں میں محنت اور یکسوئی کی دلیل ہے۔

نقاد کی ذمہ داری تہذیبی اور تخلیقی دونوں سطحوں پر ہوتی ہے مگر ایک مشکل دور میں جو فنی و فکری اعتبار سے کئی تغیرات سے گزر کر ہم تک پہونچا ہے اس دور میں سارے تعصبات سے ہٹ کر گزشتہ اور حال کے رجحانات کو سمجھنے کے لئے پیمانہ کر صرف علم کی حدوں میں ہی نہیں بلکہ اپنی سمجھ کی حدوں میں بھی چیزوں کو سمیٹنا پڑتا ہے اس زاویہ سے بھی جاذب قریشی کی یہ کاوش بہت وقیع ہے۔

"شاعری اور تہذیب" میں جن شعرا پر تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں عمروں کے لحاظ سے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حلقے میں منظور حسین شور، صبا اکبر آبادی، رئیس امروہوی، شان الحق حقی اور افسر ماہ پوری ہیں اور دوسرے حلقے میں جمیل الدین عالی، حنیف اسعدی، شفیع عقیل اور عالمتاب تشنہ ہیں اس حلقے کے ناموں کی شہرت اور اس شہرت کے سن و سال کی پختگی کے باوصف ان کی شاعری میں جوانی کی سی چمک دمک ہے محفل آرائیاں ہیں یاریاں اور نازیاں ہیں مشاعروں اور مذاکروں کے سلسلے ہیں پہلے حلقے کے شعرا موجودہ صدی میں تیسری دہائی کی ادبی اور تنقیدی زندگی کی اس بیدار فضا کی یاد دلاتے ہیں جب ہمارے بزرگ شعرا کی فکری پیکار سے عہد فرنگ میں بھی ادب و فن کا افق جگمگا اٹھا تھا اقبال کی حیات میں یہ دور ایک نئی شاعری کا آخری دور بھی تھا اور حسرت جگر جوش اور فراق کا عہد بھی تھا اس دور میں سائل دہلوی، بیخود دہلوی، امجد لکھنوی سے آل رضا سراج لکھنوی اور استاد حیدر دہلوی تک سبھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور انہیں مشاعروں میں عہد حاضر کے شعرا میں فیض، مجاز، علی سردار جعفری اور جذبی بھی اپنا کلام سناتے تھے۔ اس کتاب کے پہلے حلقے کے شعرا انہیں محفلوں میں اپنے سخن کی داد لی ہے ان شاعروں نے اپنے سخن کی آبیاری سے نئے لکھنے والوں کی شاعری کو پروان چڑھایا ہے ان کے کلام میں معاشرے کے بدلتے ہوئے رُخ کی تیز آنچ سے تپتی ہوئی ابیات میں جو اشارے ملتے ہیں ان کی لفظیات میں ایک جوت ہے جو قاری سے داد کی مستحق ہے نسبتاً ایک وقفے کے بعد اس کتاب کے دوسرے

www.taemeernews.com

حلقے کے شاعروں کے متعلق بھی کم وبیش یہی بات کہی جا سکتی ہے آنادی کی چالیس اکتالیس برس کی زندگی میں ٹنڈو جام سے ڈیرہ غازی خان تک پاکستان میں اور ہندوستان کے اتری و دکنی شہروں کی محفلوں سے باہر نکل کر نارویے کے نقطۂ انجماد کی فضا سے بوسٹن کی تپش تک ان میں بعض شعرا کی موجودگی کے بغیر مشاعرہ چمک ہی نہیں سکتا ہے دونوں حلقوں کے ان شاعروں سے کون واقف نہیں ہے ان میں سے بعض کے نام ہفتہ وار ہفت روزہ اخبارات کے مضامین کی تالیف وتصنیف میں ضرور ہوتے ہیں کہ کالموں کے مقیاس الامکان SPACE BEROMETER میں ان کی تحریر سے وقت کے گزرنے کا اندازہ ہوتا ہے۔

شور سے لے کر شفیع عقیل تک سبھی نثر نگار بھی ہیں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر دور کی شاعری کو اس دور کی نثر کے تقابلی مطالعے کے ساتھ پڑھنا چاہیے کہ اس طرح مشترک اور مختلف زبان و بیان کے زاویے سامنے آتے ہیں جن سے فن کی داخلی کارکردگی کا علم ہوتا ہے ان شعرا کے تنقیدی مطالعے کے درمیان جاذب نے اس رخ کو بھی نمایاں کیا ہے۔

"تہذیب اور شاعری" کے شعرا اپنے ادب کے کلاسک سے بھی خوب واقف ہیں اور باہر کے ادب کا بھی شعور رکھتے ہیں یہ سب سخن سنج بھی ہیں اور سخن فہم بھی ہیں زندگی کی نیک و بد کی اور عشق و ہوس کی وارداتوں سے گزر کر ان کے تجربات کا جو نقش نظم، غزل، رباعی یا دوہے اور گیت میں موجود ہے وہ ہمارے معاشرے اور ہمارے ادب کے درمیان کی ہنگامہ پرور زندگی کا عکس ہے ان کے یہاں فطرت کے مناظر سے طبیعت کا سکون اور ماحول کے اضطراب سے ایک گرم روی دونوں ہی موجود ہیں۔ اس سلسلے میں شور کی دو نظمیں "بادل" اور "بلیک آؤٹ" بار بار یاد آتی ہیں شور کی شخصیت اور ان کی شاعری میں وہ ساحری ہے جو ان کے ایک ہم عصر اور ہم جماعت جاں نثار اختر میں بھی تھی صبا اکبر آبادی اور رئیس امروہوی اساتذۂ فن شمار کئے جاتے ہیں ان کی غزلوں میں لاشعوری رو سے زندگی کے طلسم میں دبی ہوئی ایک ایسی چونکا دینے والی رمزیت آشنا فضا ملتی ہے کہ آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے شان الحق حقی افسر ماہ پوری اور حنیف اسعدی کی نرم مزاجی ندرت بیان سے گھل مل کر کچھ ایسا مزا دیتی ہے کہ ان کا کلام مسلسل پڑھتے رہنے کو جی چاہتا ہے عالی نے نئے دور کی ترجمانی میں بلینک ورس کی تمثیلی نظم اور غزلیں دوہے گیت بھی کہے ہیں اور وہ عصر جدید کے ایک منفرد شاعر ہیں شفیع عقیل کا طنز ملیح معاشرے کے ایک تجربے کار نقاد اور ایک اچھے شاعر کا امتزاج رکھتا ہے عالی اب تشنہ کی غزل میں تازگی اور رعنائی ہے۔

میں جاذب قریشی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ جو تنقیدی مضامین مجھے پڑھنے کو دیئے ہیں ان میں تمام شعرا زبان و بیان کے ہنر سے واقف ہیں اور اپنی تخلیقات میں اپنے عصر کے مزاج کی نئی تشکیل کر سکتے ہیں میں ان کی داد کیا دوں کہ ان کی داد تو ایک زمانے نے دی ہے۔

قبول خاطر و لطف سخن خداداد است